

پہلا سفر

- ۱ - پریان اور نسکین چائے
- ۲ - سد پارہ گولڈ
- ۳ - سکردو سے خپلو
- ۴ - وادیٰ خپلو
- ۵ - جھیل پکورا سے راکا پوشی سک
- ۶ - وادیٰ ہنزہ کا چڑاغان
- ۷ - پینی شیر، سندھ کی گھری گونج اور رائے کوٹ پل
- ۸ - آشوفزی میسد و پلو
- ۹ - تاتو کے گرم جھٹے
- ۱۰ - قنوری ایک فیشنی اور فیزی میڈو.... کے آہان سے گرتے تارے
- ۱۱ - بیس کیسپ نانگا پر برت
- ۱۲ - فیزی میڈو کا جنگل۔ مارغور اور بر قافی انسان اور آفری الاو

دوسرا سفر

- ۱ - ٹھلات یغم
- ۲ - روڈ ٹاؤن استر اور پکورہ ہی چکور
- ۳ - ترنشگ، پاکستان کا خوبصورت ترین گاؤں
- ۴ - زوپل گیکشہ کے ہاتھی اور شوکور پر ایک زرد خیہ اور سر درات
- ۵ - ٹاپ میدان اور شل سکھی دیا میر (سو چھوٹوں والا پہاڑ)
- ۶ - لا تکرور۔ ٹیس کیسپ نانگا پر برت پر تارڑ پر چم
- ۷ - شکاری یا رحمد اور لا تکرور کا آخڑی ہرن اور داستان نانگا پر برت
- ۸ - کوہ پیماوں کا قبرستانا جہاں ہما تیز چلتی تھی
- ۹ - ٹاپ میدان کی رات میں الاو اور اس کے ساتھ نانگا پر برت پر

”پاکستانی شمال کے ان
برفتزاروں، وادیوں، جھیلوں، چشمتوں
اور بلندیوں کے نام
جنھیں میں
اس زندگی میں نہ دیکھ سکوں گا۔“

- ۱۰۔ گھر و نہنے والے مویشی
- ۱۱۔ وادیٰ روپل دیکھنے والے آوارہ گرد کی مسکراہٹ میں فرق ہوتا ہے
- ۱۲۔ ترشٹگ ایک تصویر
- ۱۳۔ پورا شر سلطان کے کوہستانی گھر میں
- ۱۴۔ غوبصورتی کا خوف اور راما جھیل
- ۱۵۔ دُخند لائی ہوئی ، ایک خیال میں نانگا پر برت

تیسرے افسوس

- ۱۔ ہوشے۔ کھوزیڑ (جھیل کچرا۔ جھیل صدپارہ۔ وادیٰ چپل۔ وادیٰ ہوشے)
- ۲۔ وادیٰ شنگر
- ۳۔ دیرساںی اسے دیرساںی

پہلا سفر

- ۱۔ پریان اور نمکین چائے
- ۲۔ صدپارہ گولڈ
- ۳۔ سکردو سے چپل
- ۴۔ وادیٰ چپل
- ۵۔ جھیل کچورا سے راکا پوشی تک
- ۶۔ وادیٰ ہنزہ کا چڑاغان
- ۷۔ چینی شیر، سندھ کی گھری گونج اور رائے کوٹ پل
- ۸۔ اٹھو فیری میڈ و چلو
- ۹۔ ستاتو کے گرم چھٹے
- ۱۰۔ فتنوری ایک فیٹھی اور فیری میڈ و کے آسان سے گرتے ستارے
- ۱۱۔ بیس کیمپ نانگا پر برت
- ۱۲۔ فیری میڈ و کا جنگل۔ مارخور اور برفانی انسان اور آفری الاؤ

”پریاں اور نمکین چائے“

”خواتین و حضرات آپ کا کچھ آپ سے مطالب ہے۔ اگر آپ جہاز کی
وائس قطار میں تعریف رکھتے ہیں تو ذرا کمری سے باہر نظر کچھ اس وقت ہم آئھ
ہزار ایک سو چھوٹیں میٹر بلند دنیا کی مشور چوٹی نانگا پرہت پر سے گزر رہے ہیں۔ نانگا
پرہت کو ”قال پاڑا“ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے دامن میں“

”نانگا پرہت؟“ نقائی صاحب اپنی توہن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”اوے
یہ کہاں سے آگئی؟“

”یہ اوہری ہوتی ہے نقائی جی“ میں نے عرض کیا۔
”کدھر ہے؟“

”ہماری طرف نہیں اور ہوا وائس قطار کی کھڑکیوں میں سے نظر آری ہے۔“
”اوہر تو میں بیٹھیں ہوئی ہیں نیکریں پہن کر ...“ مطیع نے اپنی یونک کا
زاویہ درست کرتے ہوئے کہا ”ہمالین مرا تھن میں دوڑنے والی“

”اندازہ کرو ...“ نقائی صاحب خوش تھے اور بہت خوش تھے۔ ”اوہر نانگا
پرہت گزرتی جا رہی ہے اور یہ میموں کی نیکریں دیکھ رہا ہے ...“ یہ کہہ کر وہ نشست
سے اٹھے اور دوسری قطار کی آخری نشست پر براجاہن، ایک اوہر عرب، تھل تھل
کرتی، کمری کے ساتھ ناک چپکائے، نانگا پرہت کو خلاش کرتی، میم پر جا بجھک۔ ”
لہکسکیوڑی“ وہ مسکراتے۔ میم نے ناک ہٹا کر اتنیں دیکھا اور نظر بھر کر دیکھا کہ
یہ گئے ہوئے جنم اور سفید بالوں والا فنکس کیسی آزادی سے لہکسکیوڑی کتابے اور
مسکراتا جاتا ہے۔ اور پھر وہ بھی روہ نہ سکی اور مسکراتے گی۔

”کیا میں نانگا پرہت دیکھے لوں؟“ نقائی صاحب کی نظر کمری پر نہیں تھیں
بلکہ میم کے فراخ ان ڈھکے بوڑھے سینے پر تھیں۔

"کیوں نہیں۔" وہ ذرا بیچھے ہی۔ اور اسی لئے اپنی پرستی پر بیٹھے ہوئے گئے
بھی جہاز کی اس کمری میں سے جو دوسرا قطار کے آخر میں تھی، اس میم کے ذرا
بیچھے بیٹھے سے، ایک برفیلی سفیدی نظر آئی اور گم ہو گئی۔
ناٹا پرست!

دروسستان یا دوامیر کو پریوں کی سرزین کا جاتا ہے۔ مقامی آبادی کا عقیدہ ہے کہ
ناٹا پرست کی چونی پریوں کی ملکہ کی رہائش گاہ ہے۔ داسانوں میں آیا ہے کہ وہ ایک
ایسے برقلانی قلعے میں رہتی ہے جو شفاف اور دیپر برف کا ہنا ہوا ہے، اور برف کے
بڑے بڑے مینڈنگ اور برف کے ایسے سانپ جو کئی کلو میٹر لے جیں اس ملکہ کی
حکومت پر ماہور ہیں اور ان علاقوں میں رہنے والی عورتیں رنگین کپڑوں اور شمع
زیوروں سے ابھتاب کرتی ہیں کیونکہ انہیں پہننے سے پریاں ان سے حسد کر سکتی ہیں
اور ان پر جادو کر سکتی ہیں۔

نقائی صاحب کمری سے بیچھے بیٹھے۔ "آپ بھی دیکھ لو تارو صاحب۔" ناٹا
پرست" اور وہ ابھی تک شرارت کے موسم ہیں تھے۔

"نہیں جاتا میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے سنا ہے کہ ناٹا پرست بھی روم کے
تریوی فوارے کی طرح ہے کہ یہ دوبارہ اپنے پاس بالائی ہے اور میں فی الحال دیوسمی
میدان جا رہا ہوں، ناٹا پرست کے پاس جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔"

اور اسی لئے شاید یہ آواز اور لٹڑا کہ، ناٹا پرست کے پاس جانے کا میرا کوئی
ارادہ نہیں، بیچھے ہوئے، جہاز سے بیچھے گئے، ناٹا پرست تک پہنچے اور پھر اور هر ایک اور
سرگوشی اور سربراہت پھیلی جو کتنی تھی کہ تم آؤ گے اور بیچھے ناٹا پرست کے دامن
میں، برج کے سفید درختوں کا جو جگل تھا، اور اس جگل کے بیچے فرش پر سڑاہی کے
سفید پھول بیچھے تھے اور جھٹے جو ان میں چلتے تھے، ان چھوٹی لڑکوں کے لرزتے پدنوں
کی طرح، اور جڑی بونوں کی تیز خوشبو، جو انسانوں کو اور چانوروں کو دیوامگی تک لے
جاتی تھی، اور رائے کوٹ گلیشیز کے بیچے چلتے والے دریا کا شور، اور اسے روک
دینے والی برف کی دیوار، اور گلیشیز کے کنارے کمری چنانوں سے لکھتے جانمی رنگ
کے الپائن پھول جو سرد ہوا میں تھے، اور ان پر روزانہ بچپنے پر ایک ہلکی پھوار پڑتی
تھی، اور کبھی یہ پھوار برف میں بدلتی اور پھر ناٹا پرست کے سفید سینے سے اترنے
والے وہندے آکلو برف کے توارے۔ اور برج کے سفید درختوں کے پاس پریوں کی
چڑاگاہ میں بلند ترین جگہ کی گھاس یہ کتنی تھی کہ تم آؤ گے اور میں تمارے خیمے اور

بوجھ سے دیوں گی۔

لیکن میں نے یہ سرگوشی اور یہ سربراہت نہ سنی کہ میں تو دیوسمی کے پدر وہ
ہزارفت کی بلندی پر بچپنے میڈاون کو عبور کرنے کے لئے سکردو کی جاتب پرواز میں تھا
اور ناٹا پرست کے پاس جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اور اس سفر پر میرے ساتھی
نقائی صاحب اور مطیع الرحمن خان تھے۔
مطیع ان مولوی صاحب کا بیٹا تھا، جنہوں نے مجھے مجھ میں پسال لفظ الف سکھایا
اور اسی الف کے سارے میں یہاں تک پہنچا۔ مطیع ایک بے جھنن اور گم شدہ روح
ہے۔ وہ ہر چیز، ہر شے، ہر شخص، ہر کتاب اور ہر مشتعل میں دلچسپی لیتا ہے، ان کے
راتستے پر چلتا ہے اور پھر آتا جاتا ہے۔ وہ ایک منشر شخص ہے جو عبور حاصل کرنا
چاہتا ہے لیکن گمراہی تک پہنچنے سے پہلے ہمت ہار جاتا ہے، چنانچہ اس کے پاس دنیا
جان کے موضوعات کے بارے میں سرسری علم موجود ہے۔ وہ بہت اچھی رفاقت ہے
اور اسی لئے میں نے اسے اس سفر دیوسمی پر مائل کیا۔ اور ہاں وہ ایک کامیاب
انشورنس میں ہے۔

نقائی صاحب سے میری آشنائی مطیع اور اپنے ایک مشترک دوست نذری کے
حوالے سے ہے۔ وہ کھرات کے ایک کالج میں بقول کے نوجوان نسل کو خراب کرتے
ہیں، اپنی صراحت مستقیم سے بھٹکاتے ہیں، طبعاتی لکھنш پر لیکھ دینے کے بعد وہ دریائے
چناب میں ڈیکیاں لگاتے ہیں اور گرمیوں میں تروز ان کا پسندیدہ پھل ہے، "اندازہ
کرو" ان کا سمجھی کلام۔ ان کی یہ یوں کے بارے میں طلق خدا نے بڑی کہانیاں بیان کی
ہیں، ان دونوں پھر قارخ ہیں، لیکن شنید ہے کہ تین چار خواتین "ہنڑا" پچھے ہیں۔
کمرہ بات دنیا کے بہت قریب ہیں اور یہ وقوفی سے اتنی ہی دور ہیں۔ جمال مطیع مجھ
سے کچھ برس چھوٹا ہے اتنے ہی برس نقائی صاحب مجھ سے بیسیز ہیں۔ قد میں نقائی
صاحب بس لکھتے ہوئے رہ گئے ہیں۔

"اندازہ کرو" نقائی صاحب مجھے کہنی مار کر بولے "میم ناٹا پرست دیکھنے کو کہہ
رہی تھی"

"نقائی صاحب آپ نے ایک شادی انگستان میں بھی تو کی تھی؟" میں نے
پوچھا۔

"آئم۔" نقائی صاحب فوراً سمجھیدہ ہو گئے۔ "یہ میرا پرائیورٹ معاملہ ہے تارو
صاحب۔"

اور تمام عرصہ میری نظر سکردو پر گئی رہیں۔ ہم نے آج صحیح کی نشستیں بڑی مشکل اور بڑی سفارشوں سے حاصل کی تھیں اور میں دل ہی دل میں بچپن و تاب کھا رہا تھا کہ یہ شخص سکردو فلات کے مقابلے میں تمدن پوڑیوں اور طلوے کی پیٹ کو زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔ بہرحال ناشتے سے قارغ ہوئے تو مطیع نے پواخت آف آرڈر انھا دیا "سکردو میں تربوز ہوتے ہیں؟"

"پہنچنیں۔" میں نے بے صبری سے کہا۔ "ہمیں اب اینڈر پورٹ ہے۔"
"یہ تربوزوں والا آئیڈیا بھی اچھا ہے" ظایا صاحب فوراً بولے "مطیع نمیک کتنا ہے"

"حرج ہی کیا ہے" ظایا صاحب لاپرواٹ سے بولے۔
"ویسے بھستان کی خوبیاں اور سبب بہت مشور ہیں اور۔۔۔"
"تربوز" تربوز ہوتا ہے پاؤشاہو اور خوبی کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ۔۔۔ تربوز ہو درمیانے سائز کا، مدینے والا، اور چھاپ دریا میں صرف دس منٹ تک اسے ڈبوئے رکھو اور پھر کھاؤ تو پاؤشاہو جنت کا سیہہ ہے۔"
"آپ تو جنت پر تیجیں نہیں رکھتے"

"پر میں جنت کے سیوں پر تو تیجیں رکھتا ہوں تارڑ صاحب" میں نے سوچا اگر کیمی حالات رہے تو ہمارا دیوسالی ایڈو سخن بھیں چندی کی صحیح میں سازی سے پانچ بجے ہی فریل آؤٹ ہو جائے گا، اس لئے اب یا بھی نہیں والا فیصلہ کر لیتا چاہئے۔

"حضرات چونکہ میں نے اپنے آپ کو اس مم کا لیڈر مقرر کر لیا ہے۔ اس لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ فی الحال تو تربوز۔۔۔ اور فی الحال اینڈر پورٹ"

"سکردو میں آم ہوتے ہیں؟" مطیع پھر بولا۔
"پاکل ہوتے ہیں تم چلو تو سی" میں نے اسے تسلی دی اور یوں ہم میں وقت پر اینڈر پورٹ پہنچے اور سکردو فلات کے مسافر ہوئے۔

"میں نے تو عرض کیا تھا۔۔۔" میں نے کندھے سکردو فرانسیسی انداز میں کما اور گرم کافی کی ایک چکلی لی "اگر ناشتہ ہمیں شاید جہاز پر بھی دیا جائے۔۔۔" یہ ایک عجیب کیف آور احساس تھا جو سرانت کرتا تھا بدن کے پوروں میں اور ان حصوں میں جو خاص کیفیتوں میں زندہ ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ زندگی کی پھوک

"سوری۔۔۔" میں نے فوراً مغدرت کر دی۔
"اندازہ کرو" ابھی ستر شروع ہوا ہے اور یہ ذاتی معاملات پر۔۔۔" وہ بڑی رائے میں نے ایک مرتبہ پھر ایک اور مغدرت بھری "سوری" پیش کی اور تب وہ بچکے سے سکرائے اور کہنے لگے "آپ تو وہاں ولایت میں عاشقی معاشقی کرتے رہے لیکن کی تھی شادی ہم نے۔۔۔ پوچھو کیا پوچھتا ہے۔"

"کچھ نہیں۔۔۔" میں نے جلا کر کمل۔

"اندازہ کرو" وہ پھر بولے

"کیا اندازہ کروں؟"

"ایزہوش کی عمر کتنی ہو گی؟" — اور ایزہوش ناشتے کی رٹے ہر مسافر کے آگے رکھتی پہلی آتی تھی۔ ناشتے میں یہندو ہرزا اور کافی شامل تھے۔
مطیع اور ظایا نے میری جانب دیکھا۔

"میں نے تو عرض کیا تھا۔۔۔" میں نے کندھے سکردو فرانسیسی انداز میں کما اور گرم کافی کی ایک چکلی لی۔

اور عرض میں نے ان دونوں کی خدمت میں آج صحیح راپینڈی میں کیا تھا۔
سکردو کے لئے فلات کا وقت سازی سے چھ بجے صحیح تھا۔۔۔ میں پانچ بجے اینڈر پورٹ پر حاضر ہوتا تھا۔ سازی سے چار بجے جب ہم بیدار ہو کر تیار ہوئے اور عازم اینڈر پورٹ ہونے کو تھے کہ ظایا صاحب نے پواخت آف آرڈر انھیا۔۔۔ "میں نے کما تارڑ صاحب" انسوں نے اپنے بیٹت پر بھوکے فقیر کی طرح ہتھیں تھپ کرتے ہوئے کہا "پاؤشاہو" ناشتے کے بغیر سکردو لے جاتے ہو۔ اور خیر سے راجہ بازار میں طلوے پوڑی بڑی اعلیٰ طاقت ہے۔ وہ ذرا اپنے نوش کر لیں۔

میں نے سرائد ہو کر گھری پر نگاہ ڈالی "میں پانچ بجے اینڈر پورٹ پہنچا ہے اور۔۔۔"

"ناشتے کے بغیر؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا"

"ناشتہ شاید ہمیں جہاز پر بھی دیا جائے اور۔۔۔"

"شاید والی بات ہے تاں" ظایا صاحب نے فیصلہ دے دیا۔ "مجھے تو آپ یہیں پنڈی میں چھوڑ جائیں، اگر آپ نے بعد میں بھی کھانے پینے پر اعتراض کرتا ہے تو۔۔۔ آپ چلے جاؤ سکردو"

چنانچہ ہم اپنے اصل راستے سے الگ ہو کر پوڑیاں کھانے کے لئے چلے گئے

تھے اور سکردو جا رہے تھے؟
 اس میدان کے بارے میں مجھے پہلی بار شوت علی نے بتایا اور اس نے اسے
 جپ میں عبور کیا تھا، پھر اس میدان کے حریت انگریز تھے کنی کوہ پیاؤں نے سنائے
 راجہ چینگیز سلطان نے مجھے اس کی بلندی پر واقع ایک جھیل کی تصویر دکھائی جس کے
 پانیوں پر "اللہ" کا لفظ لکھا دکھائی دے رہا تھا، یقیناً یہ اس کے گردے پانیوں کی سیاہی کا
 کرشمہ تھا لیکن دل میں خواہش تو اٹھتی ہے اسے دیکھنے کے لئے، پدرہ سولہ ہزار فٹ
 کی بلندی پر دیوسالی میدان میں پہلوں میں جو کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے، اور ریپچھو
 میں جو چھپلیوں کا فکار کرتے ہیں اور دہاں تیز اور سرو ہوا میں چلتی ہیں، اور گریبوں
 میں بھی رات کو درجہ حرارت نقطہ انخلاء تک گر جاتا ہے، البتہ اسے عبور کرنے کے
 لئے مشقت اور دل پر جبر لازمی تھا کیونکہ راستے میں مشکلیں بہت تھیں، اور وہ آسان
 نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ میدان بیٹھ برف سے ڈھکا رہتا ہے، اور سال میں صرف دو
 ڈھائی میتھے ایسے ہوتے ہیں جن میں اسے عبور کیا جا سکتا ہے اور کیسے پہاڑتا ہے کہ
 دیوسالی کی برنسی پکھل بھلی ہیں اور اسے عبور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بازے میں
 بڑی خوبصورت حکایت ہے۔ صدیوں سے بکوال یا چودا بے اس میدان میں نشوونما
 پانے والی لمبی گھاس اور ہراویں کے لئے اپنے جانوروں کے ہمراہ اور ہر آتے ہیں۔ جب
 دیکھتے ہیں کہ آگے برف ہے تو وہ برف کی حد پر قیام کرتے ہیں پھر جوں جوں برف
 پکھلتی ہے اور پیچھے ٹھیک ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں اور پھر
 ایک روز وہ جھیل صد پارہ کے قریب اتر کر سکردو میں پہنچ جاتے ہیں، اور ان کو دیکھتے
 ہی لوگ جان جاتے ہیں کہ دیوسالی میدان میں برف پکھل بھلی ہے۔

تھارے جماز کی زیادہ تر تباہی فیر ٹھکی تھی بلکہ یہ جماز تقریباً ان لوگوں نے
 ریز روکوا رکھا تھا اور ہم تمن سیکھیز کو تو صرف سفارش کی وجہ سے جگہ مل سکی
 تھی۔ کسی سفری ادارے نے "ہمالین مرathon" کے نام سے ایک دوڑ کا انتظام کر رکھا
 تھا جو سکردو سے شروع ہو کر "کے نو" جانے والے راستے پر واقع کسی قبیلے کے
 اختام کو پہنچتی تھی، اور اسی سلطے میں سولہ ستر سال تک کی میں اور صاحب
 نیکریں اور بنیانیں زیب تن کے تیار پیشے تھے اور ان کی بنیانوں پر "ہمالین مرathon"
 سخ روشنائی سے لکھا تھا اور چکلتا تھا۔ یہ کوئی بھی سمجھیدہ تم کی دوڑ نہیں تھی بلکہ
 ذرا خلل میلے تھا مگر ان علاقوں کی جانب دنیا کی توجہ مبنیول کرائی جائے۔ میں نے

کتنی بڑی نعمت ہے، اور خاص طور پر اس لئے جب ۔۔۔ نیچے ایک برف کدھ ہو ۔۔۔
 ایک دیرینی ہو اور وہ بلندیوں پر ہو اور ان سے بلند وہ جماز ہو جس میں آپ کندھے
 سکیٹر کر کافی کی ایک چکلی لیتے ہوں۔ نیچے واپس تھیں، برف کی خاموش دنیا تھی
 جو گزرتی جاتی تھی، اور ان میں ایک بلند چوٹی تھی اور دہاں تمہوڑی سی جگہ تھی، اور
 مجھے خیال آیا کہ شاید یہاں کوئی نہ آیا ہو، بھی بھی دہاں کسی نے قدم نہ رکھا ہو اور
 میں نے خواہش کی کہ آئندہ بھی دہاں کوئی بشرت نہ پہنچے۔ کچھ چوٹیاں انسانوں کے
 قدموں کے بغیر رہنی چاہتیں ۔۔۔ اس زمانے میں دنیا کا مشہور کوہ پیلا میسز ہے جس کا
 تعقیل الاطالیہ سے ہے۔ یہ فرض کوہ پیلا کا ایک مجھہ ہے، ایک تو وہ
 تن تھا چوٹی تک پہنچتا ہے یعنی وہ خود ہی پوری مم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ بلند
 ترین چوٹی ایورسٹ پر بھی وہ آسیجن کے بغیر جاتا ہے کیونکہ اس کے پہنچپزوں میں
 قدرت کی طرف سے الی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ بلندی پر بھی کام کرتے رہتے ہیں
 اور عام لوگوں کی طرح حمدہ ہو کر موت کا باعث نہیں بنتے۔ میسز نے دنیا کی تقریباً
 تمام بلند ترین چوٹیوں کو اپنے قدموں سے روکنا ہے۔ پچھلے دنوں یہ مم جو جھن کے
 ہولناک ہمراہ کلا مکان میں تھا چلا گیا تھا۔ اسی میسز کو میں نے پاکستان سٹلی ویژن پر
 دیکھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ میں ایک بہادر کوہ پیلا نہیں ہوں کیونکہ پاکیزوں میں بہادری
 دکھانے والا کوہ پیلا ایک مردہ کوہ پیلا ہو سکتا ہے، اسے ایک احتیاط پسند فرض ہونا چاہئے
 اور اس نے یہ بیان دیا کہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں پسندیدہ ترین ہیں اگر میرے
 بس میں ہوتا تو میں ان تمام علاقوں کو محفوظ شدہ علاقوں قرار دے دیتا، اور ان کے
 اندر جدید طرز زندگی کو سرایت نہ کرنے دیتا، صرف اس لئے کہ اگر آج سے سیکھنوں
 برس بعد جب دنیا نیکلیوں کے دھوئیں کی پیٹ میں ہوگی اور انہاں تکملہ طور پر
 مشینیں بن چکے ہوں گے، تب اگر کوئی پچھے اپنے باپ سے یہ کے کہ ابو جب اللہ تعالیٰ
 نے یہ دنیا تحقیق کی تھی تو یہ کیسی تھی؟ تو وہ باپ بیٹے کی انگلی تھام کر اسے پاکستان
 کے ان شاندار علاقوں میں لے آئے اور کے "بیٹا جب اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بنائی تو
 اسی تھی"۔

اور جماز کے نیچے جو ویران برف زار تھے، اور ان میں جو خاموشی تھی وہ بھی
 کیسی تھی کہ ہاں ہم ابھی تحقیق ہوئے ہیں ۔۔۔
 اور ہم دیوسالی میدان کو ہی عبور کرنے کے ارادے سے کیوں گھر سے لگا

ہنر اور اُدھری سے وہ خجراپ، اُدھر نہیں آتی اور اگر کوئی آئے تو خاص طور پر آئے اور آئے تب اگر اسے کوئی ہاتا کر ملتان بھی ہے عالم میں اختیاب... اور کوئی اسے ہاتا نہیں، سب لوگ ہنر اور خجراپ کا ہی تذکر کرتے ہیں۔

ایک راتے میں جب میں اپنی بیجوں کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا تو بر گینڈزِ اسلام خان ہمارے ہاں آیا کرتے تھے، وہ ہاتا کرتے تھے سکردو میں، میں نے ایک جیل کنارا خریدا ہے اور میں وہاں پھول اگانا چاہتا ہوں اور اگر ہو سکے تو جیل میں سکھاڑے کاٹت کرنا چاہتا ہوں اور جیل کے کنارے میں نے ایک ڈونا جماز کا ڈھانچہ الملتادہ کر رکھا ہے اور وہاں میری رہائش ہوتی ہے۔ بہت بعد میں جب میں شمال میں گیا تو معلوم ہوا کہ بر گینڈزِ اسلام خان ان علاقوں میں بست جاتے جاتے ہیں، اور وہ ایک ایسی شخصیت ہیں، جن کے بارے میں ہر قسم کی گفتگو ہوتی ہے۔ سکردو کا شیکھی لا ٹورسٹ ریسرٹ ان عی کی ملکیت ہے۔ ملتان سے ہی عبد الکریم بلخاری آیا کرتے تھے، اور یہ شے کتے تھے تاریخ صاحب آپ دنیا دیکھ آئے، سکردو کیوں نہیں دیکھتے، میرا خیال تھا کہ لخاری کی طرح بلخاری بھی کوئی ذات ہے یعنی بعد میں مکلا کہ وادیٰ چلو کے راستے میں ایک کوہستانی گاؤں بلخار نام کا ہے اور وہاں کے باشندے اپنے آپ کو بلخاری لکھتے ہیں۔

کسی سے پوچھا کر ملتان ہے کیا؟ جواب ملا، پانچ واریاں، ٹھر، سکردو، روڈو، چلو اور خرمگ۔

کسی نے کہا کہ ملتان تو دراصل تین چیزوں کا ہم ہے۔ کے ٹو کا پہاڑ، سیاچین کا گلیشیر اور دریائے سنہ کا راست۔

اور ایک صاحب مکرانے اور کرنے لگے کہ پریاں اور نیکین چائے ملتان ہے۔

چماز کو ایک وچکا سا گا۔

"بل تو جلال تو... " نکاحی صاحب ہو اس دوران اوگنگو پکے تھے فوراً بیدار ہو گئے "اندازہ کرو" یہ چماز چلانے کا طریقہ ہے"

"میرا خیال ہے کہ ہم اترنے والے ہیں اور پاکت لے پیٹنے والے ہیں" برف کرہ اب وہاں نہیں تھا۔ اب وہاں ایک وسیع وادی دکھائی دیتی تھی، دریاں اور ریلیں۔

اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بے ہنگم جسم اور بے ربط سائنس سیت اس دوڑ میں شامل ہوں گا اور ایک عدو تصویر کے اترنے کے بعد دوڑ سے ریڑاڑ ہو جاؤں گا، بعد میں یہ تصویر میری خود نوشت میں چھپے گی اور اس کے پیچے لکھی ہوئی عبارت کچھ یوں ہو گی "مصنف دنیا کی دشوار ترین دوڑ ہالمیں مرا تھن میں پاکستان کی نماہدگی کرتے ہوئے، واکیں جانب بی بی سی لندن کا یکم وہ میں ان کے فاتحانہ انداز کو قلم بند کر رہا ہے۔" اور یہ تھا بھی درست کہ بی بی سی ٹیلوور میں کی ٹیم اس دوڑ کو کور کرنے کے لئے سکردو ڈھنچہ ری تھی۔ ڈھنچہ یہ ملے تھا کہ میں اس دوڑ میں برسورت شامل ہو رہا تھا۔ اگر ناٹکا پرست والی ستر سالہ مالی اس میں حصہ لے سکتی تھی تو اس کی نسبت ابھی تو میں جوان تھا۔

سکردو اور ملتان کو میں بہت اچھی طرح نہیں جانتا تھا کیونکہ اس علاقے کے بارے میں کوئی داستان یا متحفہ نہ تھی۔ کتابیں کم تھیں۔ جو کوئی بھی شمال کی بات کرتا، صرف ہنر اور گلگت کا تذکر کرتا۔ سکردو کو ایک غریب رشتہ دار کی طرح بھلا دیا جاتا۔ اس میں کچھ قصور یہاں کے باشندوں کا بھی تھا کہ وہ اتنے وجھے اور شریف الطبع ہیں کہ اپنے علاقے کے بارے میں کچھ کہنے سے بھگتے ہیں زرا شریلے ہیں کہ اپنے وطن کی اپنے منہ سے کوئی کیا تعریف کرے۔

سکردو میں میں قیام کے درواز ایک بیٹی دوست کرنے لگا۔ "تاریخ صاحب ہماری غلطی صرف یہ ہے کہ ہم نے ہنر کے باشندوں کی طرح اپنے علاقے کے بارے میں غیر حقیقی داستانیں نہیں بنائیں۔ ہمیں اشتخار یا زی کافن نہیں آتا۔ ہم نے غیر ملکیوں سے تعلقات اچھے نہیں رکھے اور ہم مار کھا گئے۔ آپ یہ تائیے ہنر میں ہے کیا؟ کیا ہنر ایک متحفہ نہیں ہے۔؟ کیا وہاں غیر ملکیوں کے علاوہ مقامی سیاحوں کو اچھوٹ نہیں سمجھا جاتا؟ ہنر میں سے کرم آباد کے پرانے قلعے کے ایک مظاہر کو نکال دیجئے تو باقی کیا پچتا ہے۔ راکا پوشی بھی ریاست گجر میں ہے۔ شمال تو ملتان ہے۔ کے ٹو کی چوٹی کوہ ہے اور شریم کمال ہے اور سیاچین کس علاقے میں ہے۔ آپ نے بھی کتاب لکھی تو ہنر کے بارے میں یہ لکھی"

میرا خیال ہے کہ بیٹی دوست قدرے جذبائی ہو رہا تھا لیکن اس کے جذبات کی گرمی کو متھی کرنے کے بعد بھی بہر طور پکھ ٹھائی باقی رہ جاتے تھے۔ ملتان بے تو بھل کا ٹکار ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قراقرم ہائی وے، اُدھر گلگت سے اُدھر

مطیح کا ایک شوق درست شایسی بھی ہے اور اس نے باقاعدہ اس کی تعلیم حاصل کی تھی، اس کا اپنا بیان ہے کہ اسے درست شایسی میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ کل کالاں اگر ان شورنس کا کاربیار شخص ہو جائے تو وہ پروفیسر مطیح الرحمن خان عامل نجیبی کا پورڈ لگا کر با آسانی اپنی روزی کما سکتا ہے۔ اس کا یہ شوق اتنا شدید ہے کہ وہ کہیں بھی کسی بھی جگہ صرف اپنے ہاتھوں کے ساتھ نہیں بینٹ سکتا اور اسے ان ہاتھوں میں کسی اور کا ہاتھ چاہئے۔ چنانچہ وہ زبردستی ہاتھ دیکھنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

اور مطیح جہاز کی سیڑھی سے یوں اترتا آرہا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں ایک موٹی جرم من خاتون کا ہاتھ تھا جو وہ شاید چھڑانا چاہتی تھی اور وہ اپنی عینک درست کرتا اس پر جھکا سکرا رہا تھا۔

"اندازہ کرو" نظایی صاحب نے سرہلایا۔

سکردو ائمپرورٹ کی عمارت اتنی محنت تھی کہ اگر آپ اپنے دھیان میں جہاز کی سیڑھی سے اتریں اور میری طرح بوجھی اٹھائے لبے لبے سانس لینے لگیں تو اتنی دیر میں آپ ائمپرورٹ سے باہر سڑک پر نظر آجائیں گے۔ کسی برائج لائن پر پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے رٹوے اشیش کی طرح فلاٹ آجائے پر یہ ائمپرورٹ وقت طور پر آباد ہوتا تھا اور پھر اس پر تیز رتلی ہوا جسیں چلتے لگتی تھیں۔ ائمپرورٹ کے ہال کمرے میں سافر اپنا اپنا سلامن خلاش کر رہے تھے۔ ایک تیز اور جیکے نہیں نقش والے گورے پتھے اور قد میں نکلتے ہوئے نبوہان نے مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔ "تارڑ صاحب... آئیے۔"

میں اس نبوہان کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ "کمال آئیے؟"

"خواجہ مردادیں" اس نے کہا۔

"اچھا اچھا۔" میں نے اس کے کندھے پر ایک بزرگی سے بھرپور چکی دی۔ "آپ کو خواجہ صاحب نے بھیجا ہے۔"

"میں اپنے آپ کو خود کیسے بیجھ گکا ہوں۔" نبوہان سکرا یا۔ "میرا نام خواجہ مرداد ہے۔"

میں نے فوری طور پر اپنے بے خلافانہ روپیے کی معدودت کی اور پھر مطیح اور نظایی صاحب کا تعارف کروایا۔

ہم ائمپرورٹ کی عمارت سے باہر آگئے۔

ایک واقع کارنے سکردو سے واپسی پر تباہی کے گورنمنٹ کالج سکردو کے پرنسپل خواجہ مردواو نے لاپھری میں تمہاری کتابوں کا ایک خصوصی سیکشن بنایا رکھا ہے۔ تمہارا ذکر بہت کرتے ہیں چنانچہ میں نے ایک سرسری سانام ان کے نام لاہور سے بیجنگ روانہ کیا کہ شاید یہ خاکسار ان تاریخوں کے آس پاس سکردو آئے تو آپ سے ملاقات کرے۔

جہاز کو ایک اور دھپکا لگا۔

"اس پاٹکٹ کو سمجھا تو یہ کیا کر رہا ہے؟" نظایی صاحب نے مجھے ڈائٹ اپ۔

"پاٹکٹ اس وقت لینڈر کر رہا ہے،" میں اسے اس وقت نہیں سمجھا سکتا۔

کھڑکی میں سے نیلگوں پہاڑوں کا ایک سلسلہ گزرتا تھا، اور ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

جہاز رکا اور سافر اڑنے لگے۔

باہر ایک وسیع وادی تھی، اور دور اس کے ریتلے اور ویران میدانوں سے پہاڑ بلند ہوتے تھے اور ان پر سفیدی تھی جو آسمان کی خلاہت میں گلکی جاتی تھی، اور ہوا تیز تھی اور جب میں نے اسے اپنے بدن میں اماراتو یہ بہت مختلف تھی، یہ سرو اور فرش پر گرنے والے خالی کٹورے کی طرح کھکھتی تھی۔ اس میں ایک دھلی ہوئی ٹھنڈک تھی، یا شاید خلک ٹھنڈک تھی، بس ایسے تھی جیسے صحرائی سرورات کا آنماز ہوتا ہے۔ سکردو آتے ہوئے لا جمال گلگلت ذہن میں تھا لیکن یہ جگہ اور تھی، اس کی آب و ہوا اور اس کی بناوٹ اور اس کا پھیلاو مختلف تھا۔ گلگلت جگہ تھا، چٹانوں میں گمراہ ہوا اور اس کے موسم سخت تھے، اور سکردو میں دسعت تھی اور اس کی ہوا کسی برقانی ندی میں نہ مائے ہوئے بدن کے لس کی طرح زندگی دیتی تھی۔ میں نے منہ کھول کر ایک گمراہیں لیا۔

نظایی صاحب میرے بیچھے بیچھے چلے آ رہے تھے، انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، "آپ کو دے کی تکلیف ہے تارڑ صاحب؟"

"نہیں تو۔"

"تو پھر منہ کھول کر ہاتھے ہوئے سانس کیوں لے رہے ہو،" بیچھے اترو سیڑھی سے بیچھے میں آ رہی ہیں۔

"اوہ مطیح کمال ہے؟"

"عادت میری یہ ہے" وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ سے تھپ تھپ کرتے ہوئے بولے۔ "کہ میں بادشاہ نمانے کا بیدا شوقیں ہوں اور ننانے کے بغیر رہ نہیں سکتا اس لئے۔" انہوں نے دنون ہاتھ ہوائیں پرندوں کی طرح پھرپھرائے۔ "میں تاری لگانا چاہتا ہوں۔"

"بعد میں نہیں لگ سکتی؟"
"پاکل نہیں"

میں نے شرمدہ ہو کر خواجہ صاحب سے پات کی۔ انہوں نے کہتے سکریٹر کہا، "تو پر اہم" اور اپنے ایک جو نیز پیچھر کو اشارہ کیا کہ نکای صاحب کو نہلا لو۔ نکای صاحب نے اس نوجوان کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔ "پر خوردار تم ہیں پیچھر ہوں؟" نوجوان نے اثبات میں سر ہلا کا تو نکای صاحب بولے، "میں استثن پرو فیفر ہوں، چلو کہ حرب ہے خل خانہ"

خواجہ صاحب ہمیں لا بھری ہیں لے گئے اور ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "وہ چند کتابیں دیکھ رہے ہیں آپ۔ میں ان کی وجہ سے ہم آپ کی عزت کرتے ہیں ورنہ آپ ہیں کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے بے اختیار مکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے آپ کیسے جان گئے تھے کہ میں آج ہی سکردو آ رہا ہوں، میرے خط میں تاریخ تو درج نہیں تھی۔"

"بس میں روزانہ اینجپورٹ جا کر جماں میں سے اترنے والوں کو دیکھ لیتا تھا کہ ان میں کوئی انہل میں اپنی یا خانہ بدوسٹ ہے، تو ہمارے ساتھ آجائے۔"

خواجہ مرداد کچھ زیادہ ہی میریاں تھے۔ اس دوران نکای صاحب تاری لگا کر واپس آ پکھے تھے، انہوں نے میر پر بچے چائے کے مخلفات کو ایک نظر دیکھا اور کہنے لگے۔ "یار اندازہ کرو۔ کیسی محیب یات ہے کہ ابھی صحیح پاسخ بچے ہم را پہنچی میں طوہ پڑی کا ناشت کر رہے تھے۔ پھر چھیس ہزار فٹ کی بلندی پر ناشت کر رہے تھے سارے چھ بیکے، اور اب سارے آنکھ بیکے یہاں سکردو میں تیرنا ناشت"

اس تیرے ناشتے کے بعد ہمیں کالج کا میوزیم دکھایا گیا جس میں بھستان کے تاریخی ہتھیار، تکوف، زیور اور لمبسوںت بچے تھے۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ دور و راز کی داریوں سے آنے والے طالب علم اس میوزیم کے قیام میں بے حد معاون ٹابت

"خواجہ صاحب ہم بنیادی طور پر دیوسائی میدان دیکھنے کے لئے گھر سے لگلے ہیں فی الحال کسی مناسب ہوٹل کا ہماہ تاذیج ہے، اور یہ فرمائیں کہ ملاقات کب ہو گی؟"

"تاریخ صاحب ہم ایک دوسرے سے ٹھیکریں گے تو ملاقات ہو گی ہاں" انہوں نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ "اب آپ ہمارے قبضہ قدرت میں ہیں، آئیے۔"

مجھ میں ایک جبک تھی "لیکن... میرا مطلب ہے۔"

"لکف بعد میں کر لجھے گا فی الحال اس جیپ میں تعریف رکھیے تاکہ ہم سکردو جا سکیں۔"

"تو کیا ہم سکردو میں نہیں ہیں؟" نکای صاحب نے ذرا گلمند ہو کر پوچھا۔ "کہیں اور تو نہیں اتر گئے؟"

"شریماں سے کچھ قابلہ پر ہے۔" خواجہ صاحب نے ڈرائیور کو اشارہ کیا، اور ہم اینجپورٹ سے لکل کر ایک ہموار راستے پر آ گئے، جس کے ایک جانب وہ نیکوں بلندیاں تھیں جو ہم نے جہاز سے دیکھی تھیں اور دوسری جانب ایک نیم حصہ کی پہلیاً ہوا تھا، اور اس مٹکر کا پھیلاوا مجھے لینڈ سکپ سے بہت پرے دریائے مندہ پھیلا ہوا تھا، اور اس مٹکر کا پھیلاوا مجھے جیلان کرتا تھا۔ یہاں ایک ایسی بیابان و حشت تھی جو کہ میں آبادی کے لئے نہیں ہوں اور اس کے پاؤ ہو رہا ہے انسان آباد تھا لیکن ذرا جبک کر رہتا تھا، ان پہاڑوں کی رفتہ و علقت کے ساتھ۔ شاید اسی لئے پیشتر غمار میں یک مٹکہ تھیں زمین کے ساتھ گی ہوئی تھیں۔ وہ قدرت کے اس وسیع منظر میں خل نہیں ہو رہی تھیں، دیکھ نہیں دیتی تھیں بلکہ اس کی غاموشی میں شامل ہوتی تھیں۔

ایک نکل اور درختوں سے گھری چار دیواری کے اندر جیپ داخل ہوئی۔ ایک صاف سترے برآمدے میں بہت سارے لوگ گھرے ہوئے تھے۔

"میرا شاف آپ سے ملاقات کی خواہش رکھتا ہے۔" خواجہ صاحب نے لاپرواٹی سے کہا "پلے آپ ہمارے ساتھ چائے نہیں گے پھر آپ وہاں جائیں گے، جہاں آپ کی رہائش کا بندوبست ہے۔"

نکای صاحب میرے قریب ہوئے "تاریخ صاحب میری ایک عادت ہے اورہ میں آپ جو کچھ کر لیں اس عادت سے باز نہیں آ سکتا"

اب میں ذرا ہر اس اس ہو گیا کہ نکای صاحب کی وہ عادت پا نہیں کس نوعیت کی ہے۔

ہوئے کیونکہ وہ پہاڑی قصبوں اور دو راتوارہ آبادیوں سے الگ چیزوں لے آتے ہیں جو
بختان کے شاخی ورثے کی نمائندگی کرتی ہیں۔

"یہ کیا ہے؟" نظایی صاحب نے بڑے بڑے سفید پھندنوں والی ایک سرخ نوبی
سرپر جاتے ہوئے دریافت کیا۔

"بھٹی دلما اسے دلمن کے گھر جاتے وقت پہنچتے ہیں۔" ترجمک کے رہنے
والے کرم صاحب نے بتایا۔ "اور یہ نوبی جو چاندی کی جھانجھروں سے تھی ہوئی ہے
دلمن پہنچتی ہے۔"

"چھا؟" نظایی صاحب بے حد محفوظ ہوئے۔ "ہماری بھی تو کوئی دلمن شُن
ہوئی چاہئے۔ مطیع الرحمن ذرا ادھر آ کر یہ نوبی تو پن کر دکھاؤ۔"
مطیع جو ایک کوتے میں کمرا ایک قدیم بندوق کو غور سے دیکھ رہا تھا ہماری
جانب آگیا اور نظایی صاحب نے جھانجھروں والی نوبی اسے پہنچا دی۔ اسے کچھ علم نہ
تھا کہ اس نوبی کی نویت کیا ہے چنانچہ وہ کوبی پس کر سکرائے لگا۔

"تارڑ صاحب" نظایی صاحب نے سرہابیا تو ان کی نوبی کے سفید پھندنے تکمیل
نہیں کی گیں دلوں کی طرح اچھے۔ "ذرا میری دلمن تو ملاحدہ کریں عیک والی اور موچھوں
والی۔ تصویر اتارو گی"

اور یہ تصویر آج بھی اس لمحے کی یاد دلاتی ہے۔ نظایی صاحب دلما کی نوبی
اوڑھے ہوئے اور مطیع دلمن کی نوبی میں اپنی موچھوں سیست۔

"اب آپ دونوں اپنے ہنی مون پر جائیں گے۔" خواجہ صاحب ہستے ہوئے کہنے
لگے۔ "گیٹ باؤس میں آپ کے لئے بیک ہو چکی ہے۔ آپ آرام کچھے اور نمیک
بارہ بیجے ہم آپ کو پک کر لیں گے اور پھر لے چلیں گے۔"

"کہاں؟"

"جہاں ہماری مرضی ہو گی"

صد پارہ گولڈ

دھوپ میں تجزی تھی۔ کالج کے کپاونڈ میں سفیدے کے چند درخت ابھی حال
ی میں لگائے گئے تھے اور ان کے سوا ہر سو رست تھی جو اب بکھی تھی۔ سکردو بازار
خاصاً طویل تھا۔ پائیں ہاتھ پر ایک بخیر پہاڑی کے اوپر سکردو کے قلعے کی دیوار دکھائی
دے رہی تھی۔ بازار میں ہمیں ہمالین مرا تھن میں حص لینے والی چند میں دکھائی دیں
تو نظایی صاحب نے جیپ ڈرائیور کی طرف دیکھ کر "اندازہ کرو" اور وہ غریب کچھ نہ
کہتے ہوئے بھی اخلاقاً سکرا دیا۔

سکردو کے گیٹ ہاؤس میں ایک پر فضا اور رٹک چمن قدم کا کمرہ ہمارا
خیفر تھا۔ رٹک چمن اس لئے کہ اس کے چھوٹے سے باغ میں سیروں اور خوبیاتوں
کے درخت تھے اور ان میں سے سب کے درخت کی ایک نئی کھڑکی کھولنے سے
کمرے کے اندر آ جاتی تھی۔

"واہ جی تارڑ صاحب بجان اللہ کیا پر بمار جگہ ہے۔ کمرے کے اندر سب کی
شاخ ابھی ہوئی لٹ کی طرح پریشان ہوتی ہے" مطیع کا مودہ شاعران ہو گیا۔
"اندازہ کرو تارڑ صاحب خوبیات کی شاخ کو سب کی شاخ کہہ رہا ہے" ایک
چوڑی مسکراہٹ نظایی صاحب کی چہرے پر تھی تھی۔

"خوبیات؟" مطیع کی آنکھیں حرمت سے پھیل گئیں۔ اس نے عینک اتار کر شیشے
صف کیے اور پھر غور سے شاخ کو دیکھا "میں جی سب ہے"

"میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ خوبیات ہے" نظایی صاحب نے بیٹھے پر ہاتھ
مارتے ہوئے تدرے سنجیدگی سے کہا "یہ دیکھو خوبیات ساختہ کی ہیں"

"یہ سب ہیں جو ابھی کپے ہیں" مطیع نے ایک مصنوعی حصار سے کہا "آپ
تریوڑ کھانے والے ہیں آپ کو کیا پا کہ سب کی نئی کھی ہوتی ہے۔ ہم مانسرو کے

نکای صاحب نے سر بیا۔ "ادارہ نو بزرگوں سے مذاق کرتا ہے۔"
پورے بارہ بجے خواجہ صاحب جیپ کے ساتھ نازل ہو گئے۔ "چیزیں؟"
"کہاں؟"
"جہاں ہم لے چلیں"

سکردو کی دھوپ اٹر کرتی تھی۔ جیپ پالیٹ کے درختوں کے نیچے سے گزرتی تو
ہوا نیک ہو جاتی اور نیکی سی آتی۔ مجھے سکردو کے پھیلوں نے حاثر کیا۔ سندھ شر
سے زراہت کر تھا اور کتنے اطمینان اور نصراء سے اپک و سچ رقبے میں پھیلتا تھا۔ تیز
ہوا اس کے کناروں کی رست پر سرسراتی تھی اور اس کے پانڈوں پر تیزی سے تیزتی
تھی۔ ایک چھوٹا سا راست الگ ہو کر اپر جاتا تھا اور اس کے آغاز پر "کے نو موٹل"
کا پورہ آؤزیں اس تھا۔ میرا چھوٹا بھائی یقینیت کر کیں بیٹھ رہی ایک آوارہ گرد اور کوہ دیا
ہے، وہ اب تک ایک امریکی اور ایک اطاالوی کوہ دیا نہیں کے ساتھ رابطہ افسر کے طور
ر کے نو اور ترجیح میرے کے نیک پتک جا چکا ہے۔ اس نے کما تھا کہ بھائی جان
سکردو میں کے نو موٹل کی فضا آوارہ گرد لوگوں کے لیے پاقاعدہ بیجان خیز ہے۔ کوہ
دیا کی اور مم جوکی کے جو کوہ اس موٹل میں ملتے ہیں، کہیں اور نہیں ملتے، وہاں کی
ہوا میں ایڈو نیچر ہے، وہاں جھاٹک مذور رہ جائے گا۔

"کہاں ہم مخوبی دیر کے لیے کے نو موٹل میں جھاٹک سکتے ہیں؟" میں نے خواجہ
صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیوں کیا وہاں حیناں کیں رہتی ہیں؟" انہوں نے سمجھی گی سے کہا۔ "کیوں
نہیں جھاٹک سکتے۔" انہوں نے ڈرائیور کو اپر جانے کا اشارہ کیا۔

کچھ برس پہنچ رکھا۔ واقف کار رات کے وقت سکردو کے "کے نو موٹل" میں
پہنچے۔ معلوم ہوا کہ موٹل کے برآمدوں میں بھی جگہ نہیں ہے۔ اب اس وقت کہاں
مارے مارے پھر تے اور اگر پھر تے بھی تو سکردو چیزے شرمن قیام گاہیں ذرا کم ہیں۔
ان کے پاس خیمد تھا، خیبر سے پوچھا کر کیا موٹل کے مختصر باخیچے میں خیر لگایا جا سکا
ہے۔ انہیں اس شرط پر اجازت لی کہ وہ موٹل کے ٹسل خانے استعمال نہیں کریں
گے کیونکہ ان کے سامنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کے ان کوہ بیاؤں کی قفاریں گلی رہتی تھیں
جنسیں سکردو عینچتھی ڈاریا لامیں ہو چکا تھا۔ ان واقف کار کو بتایا گیا تھا کہ دریائے
سندھ "کے نو موٹل" کے ساتھ ہی بتتا ہے۔ انہوں نے سوچا تھیک ہے، کوئی ٹسل
خانہ نہ کی، دریائے سندھ جو ساتھ ہے اور جس کی آواز انہیں تاریکی میں آرہی تھی

رہنے والوں سے پوچھئے۔"

اس چادرلہ خیال کے بعد ہمارے سفر کا پہلا جنگڑا ہوا۔ اور یہ آخری نہیں تھا
۔۔۔ سڑاک ایک الیک چھٹی ہوتی ہے جس پر انسان کی تمام تر کینگنگی اور پر آ جاتی ہے۔ اس
کے تمام خول اتر جاتے ہیں اور وہ قدرے اور بیکھل ہو جاتا ہے۔ اس سفر کے دوران
ہم تینوں ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی فضول اور بے مقصد مسئلے پر الجھ
جاتے۔

مطیع اور نکای صاحب تقریباً پانچ منٹ تک ایک دوسرے کو مگورتے رہے اور
گلے تھا کہ ان کے نہیں سے دھوادن لکل رہا ہے اور پھر نکای صاحب سکرا کرنے
لگے۔ "یار تو تھیک کہتا ہے یہ سیب کی نہیں ہے۔"

مطیع نے اٹھ کر نکای صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پہنچتے ہوئے کہنے لگا
"نہیں میرا خیال ہے یہ خوبی نہیں ہے۔"
نکای صاحب اٹھے اور پہلی بار کمرے کا تفصیلی معائدہ کیا۔ ٹسل خانے کا
دروازہ کھول کر اندر جھاناکا تو خوش ہو گئے۔ "میں ایک اور تاری نہ لگاں گوں؟"
"نہیں!"

"چلو نہ سی" نکای صاحب فوراً مان گئے حالانکہ میرا خیال تھا وہ کہیں گے
"میں مر جاؤں گا لیکن ایک اور تاری ضور لگاؤں گا۔"

"تاری صاحب یہ تو ہو گیا سکردو۔" نکای صاحب اپنی کمرے پر ہاتھ رکھ کر کسی باگی
تار کی طرح کھڑے ہو گئے۔ ایک ایسی باگی تار جو قدرے فریہ ہو چکی ہو "اپ کدھر
لے کر جانا ہے؟ میں؟"

"ہاں جی سفر کی منصوبہ بندی ہوئی چاہئے۔" مطیع بھی قریب آگیا "پہلے ہم
جائیں گے دیوسائی میدان۔۔۔ اسے عبور کر کے استور اور وہاں سے واوی روپل کے
راتے نانگا پرہت کے میں پکپ" کیوں تاری صاحب؟"

"منصوبہ تو یہی ہے۔۔۔ ابھی خواجہ صاحب تشریف لائیں گے تو ان سے
درخواست کریں گے کہ ہمیں کل صحیح جیبل صدقہ کار کے پہلو میں سے اٹھتے ہوئے اس
کچھ راستے پر چھوڑ آئیں جو دیوسائی کو جاتا ہے۔۔۔"

"ویسے کیا واقعی وہاں رچکھے ہوتے ہیں؟" نکای نے پوچھا۔
"نکای صاحب" مطیع نے ان کے کندھے پر ایک زوردار دھپ لگائی۔ "اپ
کے ہوتے ہوئے رچھوں کی مجال ہے کہ ہمارے قریب بھی آئیں"

خت کی سیر اور مناسب روزی کا بھی بندوبست ... ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ چونکہ ہنر اور گھر کی نسبت بلند ترین پہاڑ اور گلیشیر پختستان میں زیادہ ہیں اس لیے کوہ پیاؤں کا رخ بھی ادھر ہی کو ہوتا ہے۔ یوں ہنر اور گھر کے پورٹ اور گائیڈ بھی موسم کے آغاز میں سکردو پر نظر رکھنے لگتے ہیں۔ موٹل کے بافیے میں چند کوہ پیاؤں ایک ایسے شخص سے ہو گھنکو تھے جس کی فلک بھجے جانی پچھلی گلی ... دو برس پہنچنے والی گلکت سے ہنر جاتے ہوئے ویکن میں اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی اور پھر اس نے بھجے اور سلووق کو پتوں کے گاؤں میں ایک شب اپنے گھر چائے کے لیے مدعا کیا تھا اور اس شب پتوں گلیشیر سے آتی ہوئی ہوا میں ایک وحشت ہاں تھی جو دل کو ڈراٹی تھی اور ہم کیس کی روشنی میں اس کے کوہ پیاؤں کے تجویں کے بارے میں گھنکو کرتے رہے تھے۔ وہ ایک پورٹ اور گکھ تھا اور اس کا ہام ہنزہ بیک تھا۔

"ہنزہ بیک" میں نے ایک پر سرت آواز میں اسے پکارا۔ وہ چونکا "میری جانب آیا اور اس کے لکڑی ایسے بے تاثر چہرے پر کچھ نہ تھا اور پھر یکدم چیز ہے وہ چروں اس کی سکراہت سے مووم ہونے لگا۔ "صاحب ... آپ؟ آپ سکردو میں" وہ بے یقین سے سر جھکتا تھا اور کہتا تھا "صاحب آپ یہاں سکردو میں ..."

"جس طرح تم یہاں سکردو میں اس طرح ہم یہاں سکردو میں ..." میں نے کہا۔

"میں تو صاحب روزگار کی تلاش میں آیا ہوں۔ اس ایک پیپری ڈیشن والوں سے بات ہو رہی ہے شاید روزی کا کوئی بندوبست ہو جائے ... ہاں سلووق کہاں ہے؟" اس نے یکدم چوک کر کہا۔

"وہ نہیں آیا۔"

"صاحب اس کو میرا سلام بولنا اور ادھر ہماری طرف پتوں میں آؤ تو ضرور ملنا صاحب ..."

ہنزہ بیک بھج سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اور صاحب شمشال کب چنان ہے؟ آپ میرے ساتھ جاؤ گے؟"

"شمشال بہت مشکل ہے ہنزہ بیک اور صاحب ذرا اب پورٹھا ہو رہا ہے۔"

"نہیں صاحب" اس نے پھر سر جھکالا۔

"ہاں صاحب" میں نے کہا اور پھر اس سے اجازت چاہی۔ اس وعدے کے ساتھ کہ کبھی نہ کبھی ہم دونوں واوی شمشال کو جائیں گے۔

چنانچہ وہ خیسہ زان ہو گئے۔ اسی سویر بیدار ہوئے، مدد ہاتھ دھونے اور دیگر ضروریات سے قارئ ہوئے کے لیے کندھے پر قویہ ڈالے ہاتھ میں دانتوں کا برش تھا سے خیسے سے باہر نکلے اور پوچھا دریائے سندھ کہاں ہے؟ بتایا گیا کہ ذرا ادھر جماں کر دیکھئے انہوں نے جماں کا تو ایک گھنی کھنک کے لیے بیٹھ گیا۔ بتیں پیچے دریائے سندھ اٹھیمان سے بتا تھا۔ اور وہاں تک پہنچنے کے لیے نائلون کا ایک رس، چٹانوں میں گاڑنے والی سنجیں اور ایک بہت بڑا حوصلہ درکار تھا۔ چنانچہ انہوں نے دانت صاف کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کے ٹو موٹل واقعی وہی کچھ تھا جو بہتر نہ تھا۔ وہاں جتنے مسافر تھے وہ آس پاس نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان کی نگاہیں ان چونٹوں پر تھیں جنہیں سر کرنے کی خواہش میں وہ گھوون سے لٹکتے تھے۔ ان کے لیاں اور ٹیلے مختلف تھے، چیزیں وہ کسی اور سیارے کی تھیں ہوں، زینن کے نہ ہوں، اور یہ حقیقت ہے کہ آوارہ گرد اور کوہ کیا اس سیارے کی تھیں نہیں ہوتے۔ کیونکہ نئی تھیں کی طرح ان کی زندگی کا جواز مالی مخفت کے پیلانے میں قولاً نہیں جا سکتا ... ان کے پاس اپنی اس "بے مصرف" زندگی کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ موٹل کے بافیے میں بھی خیسے لگے ہوئے تھے اور دریائے سندھ واقعی پیچے تھا، بتیں پیچے اور وہاں جماں کا بھی خطرناک تھا۔ مم جوئی کی اس رونق میں سب سے زیادہ بھاگ دوڑ دے پورٹ اور گائیڈ کر رہے تھے جو کسی نہ کسی مم کے ساتھ واپس ہونے کی خواہش میں یہاں آئے تھے۔ سردویں میں شمال سرو ہوتا ہے اور یہاں کے باشدہ سرپاک کر کے وہ موسم گزارتے ہیں۔ نیلویں پر ایک ڈرائیور نے ایک روز بھج سے کہا کہ میں اس کے صاحب سے سفارش کر دوں کہ اسے دس روز کی چھٹی دے دی جائے کیونکہ اسے سکردو کے قریب ایک پہاڑی قبیہ میں جا کر اپنے گھر والوں کے ہمراہ سردویں کے لیے لکڑیاں بیچنے کا کوئی نہ وہ بروقت پورے موسم کے لیے لکڑیاں بیچنے کا کوئی نہ کوئی فرد شدید موسم کا شکار ہو جائے گا۔ سردویں کے بعد جب موسم کھلتا ہے تو ان علاقوں میں کوہ پیاؤں اور ہر زیمنگ کے لیے لکڑیاں بیچنے اس کے خاندان کا کوئی نہ اٹھانے کے لیے پورٹ اور راست دکھانے کے لیے گائیڈ، اور کھانا پکانے کے لیے یاور پچی درکار ہوتے ہیں اور اکثر بھتی ان تینوں کاموں کے ایکپھر ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ گائیڈ کا کام صرف چند لوگ ہی سرانجام دیں بلکہ ہے ٹھاٹر ٹالپ علم اور اساتذہ بھی بڑی خوشی سے اور بڑی چاہت سے اس قسم کے کام تلاش کرتے ہیں،

میرے پاس ہیں اور سرخیں بھی، ان کی موجودگی میں، میں آپ کی طرح محظی مدد ہوں۔"

"تو آئیے اب چلتے ہیں" خواجہ صاحب یوں۔
"کوئی؟"

"قدحہ ہماری مرضی"

ہم ایک مرتبہ پھر سکردو سے باہر نکل کر ائمہ پورت کی جانب روائی تھی۔ پھر ایک سک میل پر "گلگت" لکھا نظر آیا۔
"ہم گلگت جا رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

"ای طرف جا رہے ہیں" خواجہ صاحب نے پھر خیہہ انداز میں کہا۔
راستہ دور نکل ہموار تھا اور آس پاس سفیدے کے درخت اس جہاں سے اٹھتے تھے۔ دوسری جانب درختوں کے بیچ میں سے رہت کے نیلے اور نیک پاڑ نظر آتے تھے اور باہمیں طرف کہیں کہیں مکان تھے اور بیٹھی پوچھنلوں پر تھے۔ ان مکانوں کے قریب مجھے ایک خست حولی نظر آئی جس کے چہلی اور منتش دروازے گرنے کو تھے اور پہنچ دیواریں ڈھنے رہی تھیں۔ پھر راستہ ذرا اپر ہونے لگا۔ ہم پہلی سڑک چھوڑ کر ایک ذیلی راستے پر ہو گئے۔ ایک چھوٹی سی عدی یاچھے آری تھی۔ ایک چینی طرز کا آرائشی دروازہ نظر آیا جس پر "حکرطا" لکھا تھا اور اس کے اندر جیل پکورا قید تھی۔ ہم خصوصی اجازت سے اندر گئے کیونکہ اور صرف ان لوگوں کا داخلہ ہو سکتا تھا جو جیل پکورا کے کنارے آباد اس چھوٹے سے قبیلے میں قائم کرتے تھے جسے حکرطا نورث رسارت کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حکرطا والوں نے اس جیل کو پورے پاکستان میں روشناس کیا تھیں یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اس جیل کو صرف اپنے گاؤں کے لئے قید کر لیا۔ چنانچہ ہم اپنے ہی دھن کے اس حصے میں قدرے خوفزدہ اور بھرم ہو کر چلتے تھے کیونکہ ہماری جانب ہوٹل کے مازین مٹک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور گاہک حضرات ذرا ایک بلند سڑک سے ہماری جانب حارت سے نظر کرتے تھے کہ یہ کون ہیں جو ہماری اس جنت میں یوں دندناتے پھرتے ہیں۔ میں جب اسی روز جیل صد پارہ کیا تو میں نے بہت بہتر اور آزاد محسوس کیا۔ خدا کرے وہ جیل بیش آزاد رہے۔

جیل پکورا نے مجھے ذرا حیران بھی کیا۔ میں نے اس کی جو تصاویر دیکھی تھیں

مطیع نے اس دوران ایک کوہ بیبا کو قابو کر لیا تھا اور اس کا ساتھ دیکھ رہا تھا، کوہ بیبا نمائیت اشماک سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

چند کوہ بیبا خواتین قدرے مختصر لباس میں موٹل کے اندر سے آئیں۔ نقایی صاحب نے ایک مختصری سانس بھری اور خواجہ صاحب سے کہنے لگے۔ "بادشاہو ہمیں کمال غمرا وہاے ہے میٹ گیبٹ ہاؤس میں وہاں توکرے کے اندر صرف سیوں کی ایک شنی آتی ہے یہاں تو پورے کے پورے درخت ہیں۔"

"اندازہ کرو" خواجہ صاحب نے نمائیت سرسری انداز میں کہا۔ اس پر نقایی صاحب نے اپنی گھورا کیوں نکلے ان کا تجھے کلام اپنی پر استعمال ہو گیا تھا۔

موٹل کے ڈائیکٹ روم میں بھی وہی کیفیت تھی۔ کنوں میں رک سیک اور کوہ بیبا کی سامان رکھا ہوا تھا اور سیاح میزوں پر نیچے پھیلانے ان پر بھکے ہوئے تھے۔ اور ان کی خواراک مختصری ہو بھی تھی۔ مطیع ہمیں خلاش کرنا ہوا اندر آگیا۔ وہ پریشان دکھائی دیتا تھا۔

"خواجہ صاحب ڈرائیور سے کہنے کے مجھے تھوڑی دری کے لئے گیبٹ ہاؤس لے جائے۔"

"کیوں خیریت؟" میں نے پوچھا۔
"میں نے آج معج شوگر کا انجکشن نہیں لکھا تھا اس لے طبیعت بے حد خراب ہو رہی ہے۔"

"شوگر کا انجکشن؟" نقایی صاحب تکریم دہ ہو گئے "خود لگاتے ہو؟"
"بال۔" مطیع کہنے لگا۔ "آج معج سکردو آنے کی ایکسائز منٹ میں بھول گیا اور اب طبیعت کچھ خراب ہے۔"

خواجہ صاحب نے ڈرائیور کو ہدایات دیں اور مطیع گیبٹ ہاؤس چلا گیا۔
"اندازہ کرو۔ اسے شوگر کا مرض ہے۔ روز ٹینکا لگا کر چلتا پھرتا ہے اور ہمارے ساتھ کوہ بیبا کرنے آگیا ہے۔"

نقایی صاحب۔۔۔ یہ تو سارا پروگرام اپ سیٹ ہو جائے گا۔ پہاڑوں کی بلندیوں کے لئے محنت مند ہونا شرط اول ہے۔ یہ اگر لاہور سے روائی کے وقت تاریخ تا تو ہم اسے ساتھی نہ لاتے۔"

مطیع جب واپس آیا تو وہ ہشاش بٹاش تھا۔ "لاہور سے روائی کے وقت تاریخ تا کر میں انجکشن کے بغیر ایک دن میں کمال سکتا تو آپ مجھے ساتھی نہ لاتے، اس لے میں نے اپنے مرض کو ذرا خفیہ رکھا۔۔۔ دیے تکریم دی کی کوئی بات نہیں بیکھے

کروہ سکرائے اور میں رک گیا۔ وہ اور وہ بہت کم سمجھتے تھے۔
 "آپ اور جمیل جاتا صاحب۔" ان میں سے ایک جو بالکل بے دانت تھا
 پوپلے منہ سے سوال کرتا تھا۔
 "اوپر بھی جمیل ہے؟"
 "ہاں۔" دوسرے نے سرہلایا "چھوٹا کپورا اوپر۔"—
 "اور اونھر سے دیوسالی کو بھی راست جاتا ہے؟"
 "ہاں۔ دیوسالی بہت سردی۔ برف۔ پرچھ۔ آپ جاتا؟"
 "ہاں۔ میں اور یہ۔" میں نے نکای اور مٹیج کی طرف اشارہ کر کے کمل۔
 "میرا دوست جاتا۔"

وہ دونوں پہنچنے لگے اور نکای کو دیکھ کر ہنسنے لگے "یہ نہیں جاتا یہ۔"
 انہوں نے بازو پھیلا کر ہلایا کہ یہ بہت موڑا ہے۔
 ہم واپس نیچے آئے تو میں نے دیکھا کہ تبت موٹل کے ساتھ چند خیے الستارہ
 ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ خیے بھی کرائے پر اٹھائے جاتے ہیں اور بہت جی چاہا کہ ہم بھی
 انہی میں اٹھ جائیں۔

"آپ تو ہتا دیکھئے کہ ہم کدھر جائیں گے وارڈن صاحب؟" میں نے خواجہ
 صاحب سے پوچھا۔
 "جمیل صدپارہ۔ سکرود کے دوسری جانب۔ آپ کے دیوسالی کے دامن
 میں۔"

اور اسی لئے سامنے وادی سکرود میں گولے اٹھے اور تجز ہوا چلنے لگی اور یہ ہوا
 ہم تک دیکھتے دیکھتے آگئی اور اس کی رست آکوڈ شدت ہماری آنکھوں میں چھینے گئی۔
 خواجہ صاحب نے اپنا لہذا بازو اٹھا کر انگلی سیدھی کی۔ "آپ دریائے سندھ کے
 نیچے ابرنے والے ریتے ناپوؤں کو دیکھ رہے ہیں۔"

"تھی ہاں۔" میں نے بیشکل آنکھیں کھولیں۔

"دوپر کے وقت گری کی شدت سے رہت تھی ہے۔ ہوا کا دباو کم ہو جاتا
 ہے اور پھر آپ کے دیوسالی سے خلک ہوا اترتی ہے اور یوں ٹکوٹے اٹھنے لگتے ہیں۔"
 خواجہ صاحب نے جب بھی دیوسالی کہا تو "آپ کا دیوسالی" کہا اور واقعی اس
 ریتلی ہوا میں مختذل کھلی ہوئی تھی۔

ان میں وہ کچھ تو دکھائی نہ دا جو یہاں میرے سامنے آیا۔ ایک تیساں کا موسم تھا اور
 کیا گل و گلزار موسم تھا۔ اور دوسرے اس کے پانی تھے جو اتنے صاف تھے کہ کنارے
 سے اندر تک بہت دور تک جمیل کی تہ نظر آتی تھی۔ کئی بڑے پتھر جمیل میں یوں
 دکھائی دیتے تھے جیسے ان کے آس پاس شیش تندہ ہو گیا ہو۔ اور یہ پانی یوں شفاف
 تھے کہ جمیل کپورا تاہم پانیوں کی جمیل ہے۔ اس کی تہ سے جھٹے پھونتے ہیں اور یہ
 بارش یا گلیشیر کے پانی کی محتاج نہیں۔ اور ذرا غور سے دیکھئے تو جمیل کے اندر وہ
 جھٹے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

"چلیں؟" خواجہ صاحب نے پھر پوچھا
 "کہاں؟"

"جہاں ہم لے چلیں"

وہ ہمیں جمیل کپورا کے دوسرے کنارے پر لے گئے۔ یہاں "تبت موٹل"
 کی عمارت تھی۔ ڈائیکنگ روم میں قل و هرلنے کی جگہ نہ تھی۔ بے شمار فوجوں چہرے
 ہماری طرف دیکھتے تھے۔ ان میں سے ایک باریش صاحب آگئے۔ "میرا ہم
 یوسف حسین آبادی ہے۔ ملکہ قلیم میں ہوں اور یہ میرے اساتذہ اور طالب علم
 ہیں۔"

یوسف صاحب کے نام سے میں اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ بحستان کے معروف
 دانشور اور ماہر تعلیم ہیں۔ انہوں نے ہمارے لیے لنج کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہمیں پر
 عباس کا فتحی سے بھی ملاقات ہوئی۔ کاظمی "بھستان کاڑ" کے بہت بڑے مبلغ ہیں۔
 اپنے خلٹے کی تاریخ اور جغرافیائی اہمیت کو دوسروں تک پہنچانا ان کا مقصد ہے۔
 ان کے بھتی لوک گیتوں کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

"تبت موٹل" کے لان سے جمیل اور دوسرے کنارے پر واقع "جھٹلڑا" بے
 حد دیکھ رہتے ہیں اور یہاں جو گاہ تھے اگرچہ ہنگاب سے کے تھے تھیں ان کا
 سائز اتنا بڑا تھا کہ شاخوں سے وہ سنبھلتے رہتے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم جمیل
 کپورا کے کناروں سے اوپر کو جانے والے کچے راستے پر چلنے لگے۔ ایک پر شور اور
 وحشت ناک پانیوں والی ندی کے پار، بلندی پر کپورا کا گاؤں تھا اور کپورا جمیل کا منظر
 یہاں سے بھی دل فریب تھا اور اس کے پس منظر میں وادی سکرود کی وسعت اور ریف
 پوش پہاڑ تھے۔ ایک مکان کے برآمدے میں دو بورڈے رہے بن رہے تھے۔ مجھے دیکھے

جیپ کو دیکھتا تھا تو بازار میں سے گزر رہی تھی اور جس میں تمن سیاح اور ان کے دوست جمیل صد پارہ کو جاتے تھے۔
سکردو کی آبادی یک لخت نہم ہو گئی اور سڑک نے پہاڑوں کے اندر جانے کا قصد کیا۔ دور ایک نالہ بستا تھا اور خواجہ صاحب نے اس طرف اشارہ کر کے ہتھیا کہ اوہرہہ مشور چنان ہے۔ جس پر درجنوں مہاتما بدھ کندہ ہیں اور ہم ان کی زیارت واپسی پر کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد ہم پہاڑوں کے اندر تھے اور اب اس نالے کے ساتھ اپر جاتے تھے جو اتنا تیز اور اتنا سفید اور پر شور اور چینے اڑانے والا تھا جیسے ٹیکر کے اندر ملک ٹیک تیز اور چینے اڑانے والا ہوتا ہے۔ اور شور میں بات بھی سنائی کم ہی دیتی تھی اور اسی لئے خواجہ صاحب نے قدرے بلند آواز میں کما اور مجھے چیزیتے ہوئے کما کر یہ نالہ آپ کے رو سائی سے آ رہا ہے۔

اور جب انہوں نے یہ کما کر یہ نالہ آپ کے رو سائی سے آ رہا ہے تب میں نے اس کے بے چین "تلیے اور سفید پانڈوں میں پورے رو سائی کو نیچے اترتے دیکھا" ان میں گھلتے دیکھا اور وہ بلندی اور محنت کی میرے اندر گئی، جہاں سے یہ آتا تھا اور کہتا تھا کہ اے گندی رنگ والے درمیانی عمر کے ست پڑتے اور جسمانی طور پر بد نہ ہوتے سیاح میں اوہرہہ سے آیا ہوں جدھر تو جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ جو جھیل میں لالج بنت ہے تو اپنے اختیار سے باہر ہو کر وہ کچھ دیکھنا چاہتا ہے جو تو دیکھ نہیں سکتا۔ تیری آنکھوں میں پہاڑوں جھیلوں اور بلند میدانوں کی ہوس ہے جو پوری نہیں ہو گئی اور تو اس دنیا سے چلا جائے گا اور یہ ہوس باقی رہ جائے گی۔ میں اسی رو سائی سے آ رہا ہوں "جہاں تو جانے کی خواہش رکھتا ہے۔"

پہنچنے نہیں کب نالہ ذرا پرے ہوا اور ہماری جیپ اس خاموشی میں آگئے جو صد پارہ کے آس پاس ٹھہری ہوئی تھی۔ جیپ رکی تو ہمارے بدن اور سوچ کا تسلسل سب کچھ ایک دھنگے کے ساتھ نہم ہو گیا اور خاموشی کی سائیں سائیں کانوں میں پلنے لگی۔

"پہلے اوہرہہ" خواجہ صاحب نے راستے سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ وہاں پہنچوں کے نیچے سے پانی آ رہا تھا اور کھنی گھاس اور رست میں سے بہتا ہوا ایک پھر میں روپوش ہو جاتا تھا۔
خواجہ صاحب نے پہلے آسمان کو دیکھا پھر پانی کو دیکھا پھر کھڑے ہو گئے پھر

ہم کچورا گاؤں سے نیچے اترے، جمیل کنارے ایک نہم دائرے کی صورت ہماری جیپ و محل اڑاتی پہلی اور پھر سکردو جانے والی سڑک پر ہموار ہو گئی۔ دور سے سفیدے کے درختوں کے سائے میں وہ خست جو ہلی پھر نظر آئی جس کی کچھ دواریں ڈھنے جانے کو تھیں۔ خواجہ صاحب نے اشارہ کیا اور جیپ رک گئی۔

ایک کچے بلند پلیٹ فارم پر ایک خست حال عمارت اپنے آخری دنوں میں تھی۔ اس کا غالی شان منقش دروازہ مغلیل تھا۔ اس دروازے کے قلعش اور اوبر کی پر پیچے جالیاں کسی قدم ہاتھ نے عقیدت سے تراشی تھیں۔ کمزیاں ٹوٹ کر گرنے کو تھیں اور کھلی تھیں۔ مغلیل دروازے کو دیکھنے سے اندر کا مظہر ایک لیکر کی صورت دکھائی دیا۔ وہاں نہم تاریکی تھی اور جہاں جہاں سے کمزیاں اور روشنداں ٹوٹ چکے تھے، وہاں سے دھوپ کی تیزی اندر آ کر اس عبادت گاہ کے آخری لمحوں میں خل ہوتی تھی۔ گیلریاں اور ساری چھت لکڑی کی تھی۔ درجنوں بلند ستون اس خانقاہ کی چھت کے بوجھ تے بھلے جاتے تھے۔ فرش پر چد چٹانیاں تھیں اور طاقوں میں بجھے ہوئے دیئے اور ان کی سیاہی تھی۔ یہ ایک فلیم اور شاندار ورش تھا جو منی ہو رہا تھا۔ بھستان کے مختلف تصبوں میں بے شمار ایسی خانقاہیں ہیں جو بے تو جل کا ٹکار ہیں۔ ان کا طرز تعمیر اور خصوصی طور پر لکڑی کا کام بے مثال ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی اندر ایک ایسا ماہول ہے، روشنی کے ایسے زاویے ہیں جو بنائے نہ بیش۔ "ایسی پر کشش اور شاندار یادگار کو چاہ ہونے کے لئے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی مرمت کیوں نہیں کی جاتی؟"

"میں باقیں غور کرنے کی ہیں" ریڈیو کے سفی صاحب بولے "یہاں کوئی ادارہ کوئی محلہ ایسا نہیں جو ان عمارتوں کو بحال کرے اور ان کی عظمت رفتہ کی جملک و اپنے لے آئے۔ یہ بھستان کے طرز تعمیر اور ثافت کی نمائندہ ہیں اور ان کے خاتمے پر ہمارے ہاں کچھ بھی باقی نہ پہنچے گا"۔

"کبھی کبھار خانقاہ کا دروازہ ہوا کے زور سے پھوٹا تھا" اس کے کواڑ جدا ہوتے تھے اور اندر کی محنتک باہر کو آتی تھی۔

جب ہماری جیپ سکردو کے بازار میں سے گزری تو دھوپ صرف قلعے کی نیک پہاڑی کو روشن کرتی تھی اور شر سائے میں تھا اور کسی دور کی وادی سے آیا ہوا ایک لداغی خدوخال کا خاندان ایک دوکان سے اشیائے خور و فی خربنے کے دوران اس

اس پر شوگر کا حملہ ہو گیا ہے مگن یہ سونے کا حملہ تھا۔

”ہاں جی۔“ خواجہ صاحب مطیع کے رو عمل سے لف اندوز ہوتے ہوئے شرات سے بولے۔ ”یہ صد پارہ گولڈ ہے اور ذرا پانی تو دیکھئے۔“

مطیع نے جب جھک کر پانی کی تہ کو دیکھا۔ پھر پٹوں میں پانی لے کر اس میں تیرتے سہری ذروں کو دیکھا تو وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ وہ ہم سے الگ ہو کر اب ایک اینی وادی میں تھا۔ جہاں سہری ندیاں تھیں اور سونے کی ڈلیاں پانی میں بستی ہوئی اس کے قدموں میں آکر ڈھر ہوتی تھیں۔ ”خواجہ صاحب یہ پانی کام سے آتا ہے؟ اور چنان کے نیچے سے؟ تو یقیناً چنان کے اندر کہیں سونے کی کوئی بست بیوی کام ہو گی۔ شاید پورا پہاڑ ہو۔ اور اگر کھدائی کی جائے یا پانی جدھر سے آ رہا ہے اور کسی شخص کو بیٹھا جائے جو رنگلا ہوا۔“

”یہ اب فضول ہو گیا ہے ہمارے کام کا نہیں رہا۔“ نظاہی صاحب افسوسناک لہجے میں سر جھک کر بولے۔

مطیع کو کچھ پرواہ نہ تھی کہ کون کیا کہہ رہا ہے، وہ اپنی سہری دنیا میں گم تھا۔ ”اس پانی کا تجویز ہوتا چاہئے کہ اس میں کتنا سوتا ہے۔ کسی کے پاس بوقت ہے؟ میں اس پانی کو ساتھ لے جاؤں گا۔ نہیں تو کوئی پلاسٹک کا لفافہ ہے یہ رہت تو ضرور لے جاؤں گا۔“

”جمیل دیکھ لیں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ لوگ چلیں میں آتا ہوں۔“ اس کی آنکھیں سونے کے پانی پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہم جھٹے سے والپس سڑک پر آئے اور پھر جمیل کی جانب اترنے لگے۔ نور زم والوں کا ہوٹل ایگی ویران پڑا تھا۔ گروں میں قالین بچھے تھے لیکن بستر ناپید تھے۔

اور جب ہم نے صد پارہ کو دیکھا تو دھوپ انٹھ کران چٹوں پر تھرتی تھی جن کے اوپر دیو سائی کا میدان تھا۔ جمیل کے کنارے کے ساتھ وہ راست دھکائی دے رہا تھا جو اورھر کو جاتا تھا جدھر ہم نے جانا تھا۔ شام کی بھڑک اب بدن میں اترتی تھی اور پوری جمیل سائے میں تھی۔ اس جمیل میں ایک خوف تھا، کسی اور دنیا کی جھٹک

تھی۔ اس کے پانی وحشی ایسے تھے کہ جیسے بندھے ہوئے ہوں مگن پھنکارتے ہوں۔

جمیل کنارے ایک چوکیدار نے ایک خیر غصب کر کے سیاحوں کے لئے گھاس پر بیٹھ گئے۔ مناب چائے پانی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہم چائے پینے کے لئے گھاس پر بیٹھ گئے۔

بیٹھ گئے اور بالآخر کہڑے سے ہو کر کئے گے۔ ”اس زاویے سے اور دریکھیں ہم بھی اسی طرح ذرا کہڑے ہو کر جھکے تو جھٹے کے پانی کے نیچے کی رت ایک کمیش والے دوپٹے کی طرح چم چم چک رہی تھی۔

”صد پارہ گولڈ“ خواجہ صاحب نے ڈرالائی انداز میں کہا ”اس پانی میں سونے کی آنکھیں ہے۔ جی بھر کے نیچے کیوں نکلے یہ اپنے اندر بست ساری سہری خصوصیات رکھتا ہے۔ ہر شے کو ہضم کر دتا ہے اور بے شک سات آنٹھ گاس پی جائیے۔ طبیعت بوجبل نہیں ہوگی۔ اور یہ لیچے گلاں ”انہوں نے اپنے چھیلے میں سے ایک گلاں نکال کر مجھے تھا وہا جو وہ خصوصی طور پر ساختہ لائے تھے۔

سونے کا ظلم اور لالج ہم سب میں موجود ہے اور ہمارے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوئی اور ہم جھک جھک کر اس رت کو مختلف زاویوں سے دیکھتے تھے جو بھی تو ایسے لگتی ہیے کسی مزار کی چاروں سو میلیوں کی جھلکاہٹ میں رہ رہ کر چمکتی ہو اور بھی دھوپ کی آخری کرنیں ان ذروں میں ختم ہوتی جاتیں جو لالج اور ظلم تھے۔ ہم نے یہ گولڈ واڑیا اور جی بھر کر اور گلاں بھر کے پیا اور یہ حقیقت ہے کہ اس میں کچھ سہری تاثیر تھی۔

نظاہی صاحب کرپر ہاتھ رکھ کر پانی کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ وہ پانچ چھ گلاں پی چکے تھے اور اب مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ”میں ناں اس میں تاری لگاتا چاہتا ہوں لیکن پانی کم ہے۔ بادشاہو۔ اندازہ کرو سونے کے پانی میں نہایا بڑی بات ہے۔“

جب سے اترتے ہوئے مطیع ذرا ایک پتھر کی طرف گیا تھا اور ہم سے الگ ہو گیا تھا اور اب چٹوں کی بیٹھ پر ہاتھ رکھے خوش و خرم والپس آرہا تھا ”ہاں جی السلام ملیک! کیا ہو رہا ہے؟ آپ کیسے ہیں؟ بال پچوں کا کیا حال ہے؟۔“ مطیع کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی بھی محفل میں یا گھر میں داخل ہو تو مسکراتا ہوا یہ فقرے سینک کی طرح فر فر ساختا ہے۔

”والیکم السلام۔“ نظاہی صاحب نے اپنی سفید موچھوں کو تاؤ دیا۔ ”ہو یہ رہا ہے بادشاہ ہو کہ اس پانی میں سوتا ہے سوتا۔۔۔ ابھی ابھی تارڑ صاحب کو ایک ڈلی ملی ہے کوئی پانچ تو لے اور چھ ماشے کی۔“

”نہیں۔۔۔“ مطیع کی بے تینی کی مسکراہٹ پھیلی اور پھیلی گئی۔ اس کی آنکھیں چکنے لگیں اور اس کے ہاتھ پاؤں کچھ عجیب طریقے سے بیٹھ گئے۔ مجھے شاہزادہ ہوا کر

میرے قریب آگیا۔ "صاحب دیو سائی تو بہد ہے آپ تو ہاں نہیں جاسکتے۔"
"کیوں؟"

"ابھی برف نہیں پچھلی اور سردی بہت ہے۔ آج سچ تین لڑکے اپر گئے تھے
لیکن وہ واپس آئیں گے۔"

"خواجہ صاحب۔" "میرا طلاق سوکھنے لگا۔" "کیا واقعی برف نہیں پچھلی؟ اب تو
بولاٹی کے آخری دن ہیں۔"

خواجہ صاحب کے چہرے پر پسلی باریں نے شرمندگی کے آثار دیکھے۔ "میں
آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ واقعی آپ دیو سائی نہیں جاسکتے۔"

میں نے صد پارہ کی طرف دیکھا ہے یہ ان تاریک پانیوں کا قصور ہو اور پھر اس
راستے کی طرف دیکھا جو دیو سائی کو اٹھ رہا تھا۔ "لیکن کیوں نہیں جاسکتے؟"

"ہاں ابھی گھری ولد ہے، کچھ نہیں ناقابل عبور ہیں اور موسم بھی خراب
ہے۔"

"آپ مجھے اطلاع کر دیتے تو میں سکرداونہ آتا۔"
"ایں لیے تو اطلاع نہیں کی"

نجی سے ایک تیز رفتار جیپ اور آئی۔ ہمارے قریب آکر رکی۔ اس میں سے
حسن صد پارہ باہر آگئے اور تم سب کو نظر انداز کرتے ہوئے خواجہ صاحب سے بغل
کر کر ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے اپنی میری جانب متوجہ کیا اور اپنی زبان میں کچھ
کہا۔

"تھی جی آپ دیو سائی نہیں جاسکتے۔" وہ فوراً بولے۔ "میں اس سڑک کو تحریر کر
رہا ہوں جو اور دیو سائی تک جا رہی ہے۔ اور اورخت سردی ہے اور برف ہے۔"
"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ٹاپ تک چلے جائیں اور اس میدان کو ایک نظر دیکھ کر
واپس آجائیں؟"

"ممکن تو ہے جناب۔ میں کوشش کر سکتا ہوں لیکن... ہاں جا کر آپ کو شدید
بُردا ہو گا کیونکہ بلندی ہے اور پھر اسی وقت واپسی... اور ہاں دیکھنے کے لیے کچھ
بھی نہیں۔ تین چار ہفتوں تک برف پچھل جائے گی۔ پھر۔"

"پھر میں یہاں نہیں ہوں گا۔" میں نے حسن صد پارہ کا شکریہ ادا کیا اور پھر
اس راستے کو دیکھا۔ اور دیو سائی کا میدان تھا اور میں اس کی خواہش لے کر آیا

مطیع آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹی تھی۔
"چائے پیو۔" نظائری نے کہا۔

"میں پانی پی کر آیا ہوں۔ سونے کا پانی۔" مطیع نے دیکھا کہ ہم زیرِ اب مسکرا
رہے ہیں۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ میری حرکات سے لطف انہوں ہو رہے ہیں لیکن
میں کیا کروں۔" میں نے زندگی میں پہلی بار سوتا دیکھا ہے۔ اور جناب ایک مرجب
آشیانیاں میں ایک شخص اپنی بگھی پر جا رہا تھا اور گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سونے کی
ڈلی... "اس کے بعد مطیع نے ہمیں خود شری کمانیاں نائیں کہ کس طرح ہم ہی ہے
سیاحوں کو بے وحیانی میں یونہی بیٹھے بخانے سو ناہل گیا اور وہ دولت مند ہو گئے۔ مطیع
کا شری موڑ ہم پر بھی اڑا کر ہوا اور ہم بھی جیبل صد پارہ کے کنارے شری خواب
دیکھنے لگے۔ میری سامنے جو پتھر ہیں شاید ان کے نیچے وہی چمنا ہو۔ — سونے کی
چمنا —

جیبل کے پانیوں کی چھپاک چھپاک کے ساتھ ٹھنڈک بڑھتی گئی اور سایہ گمرا
ہونے لگا۔ دھوپ چھوٹیوں سے رخصت ہو رہی تھی۔ خلکی نے ہمیں شری خوابوں
سے بیدار کر دیا۔

صد پارہ کے اوپر دیو سائی کو چڑھتے راستے کے ساتھ چھوٹوں کے کچھ ڈھیر اور
ایک دیوار نظر آتی تھی۔ صد پارہ سے مراد فیصل یا خانقاہی دیوار ہے اور یہاں قدم
راجہ اپنی ریاست کی سرحد کی نشانہی کے لیے دیوار یا فیصل بنا تھے۔ ۱۸۷۶ء
میں راجا ہاؤ نے آب پاشی کے لیے ایک چھوٹا سا بند تحریر کروایا تھا جو ایک کمائوت کی
مطابق اٹھے کی سفیدی اور خاص قسم کی چکنی مٹی کو گوندھ کر بنا یا گیا تھا اور اب
مک قائم ہے۔

صد پارہ میں ہمیں شام ہو رہی تھی اور اس کے پانیوں کے اندر جیسے بے شمار
قدم وابہے اور خوف تھے جو کہتے تھے کہ کسی مسافر کو صد پارہ میں شام نہیں ہوتی
چاہئے ہم اٹھ کر ہوئے۔

"بہتر کی ہے کہ آپ ہمیں یہیں چھوڑ جائیں مگر ہم کل سوریے سوریے
جیبل کے اوپر اس راستے پر چلنے لگیں جو دیو سائی کو جا رہا ہے۔" میں نے جیپ میں
سوار ہوتے ہوئے خواجہ صاحب سے کما اور اس امید سے کما کہ وہ ہمیں یہاں ہرگز
نہیں چھوڑیں گے۔ چوکیدار جیپ تک ہمارے ساتھ آیا تھا اور وہ دیو سائی کا نام سن کر

سکردو سے چلو

.... اور ویگن جو سکردو سے ایک سو تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع وادی چلو کی جانب رواں ہے، اور سفر کرتی ہے اندر پہاڑوں کے اندر جماں ایک وسیع اور عظیم تھائی ہے اور ہم تینوں اس تھائی میں گل ہونے کے لئے جا رہے ہیں۔ وادی چلو کو جو لداخ کی قوت میں ہے اور جماں شہر ہوم کی چوتھی ہے، دریائے شیوک اور اس کے معاون دریا سلتوود اور ہوشے کے کنارے پہنچی ہوئی ہے۔ تو ہم تینوں ویگن میں سوار وادی چلو کی جانب سفر کرتے تھے۔ اور خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

"میں خواجہ صاحب"۔ میں نے سرہلا کر خواجہ مرداد سے کہا تھا "دیو سائی کی برف اس برس نہیں پھٹلے گی۔ اگلے برس پھر آئیں گے"۔

اور خواجہ صاحب نے فوری طور پر چلو کے استنشت کشز سے فون پر رابطہ قائم کیا تھا اور رست ہاؤس میں جو وی آئی پی کرو تھا ہمارے لیے بک کرو دیا تھا اور کہا تھا "اگر ایک در بند ہو تو اپس نہیں چلے جایا کرتے بلکہ کسی اور در پر جا کر دستک دیتے ہیں۔" چلو کا دروازہ کھلے گا تو اس کے اندر جھانکنے گا اور وہاں وہ سب کہہ ہو گا جس کی تلاش میں آپ گھر سے لختے ہیں"۔

ویگن سکردو سے نکل کر حسین آباد کے قریب ہوئی تو قبے کے باہر ایک بورڈ نظر آیا۔ "حسین آباد کی حدود میں خلاف شرع افعال خصوصاً موسيقی بجاانا منع ہے"۔

"نظامی صاحب"۔ میں نے اگلی نشت سے مزکروں کے پچھے حصے میں نہ بند اور ایک ٹاٹ مسافروں کی جانب دیکھا اور ان میں کہیں میرے ہم سفر نظامی اور مطیع بر احجان تھے۔ بلکہ مدغم تھے۔

"اندازہ کرو۔" "نظامی صاحب کہیں سے بولے" بزرگوں کو ڈر بے میں بند کر

"تارڑ صاحب آپ فلرنہ کریں" خواجہ صاحب نے مجھے تسلی دی اور مجھے اس لمحے کی تسلی کی شدید ضرورت تھی۔ ہم آپ کو ایک الکی وادی میں بیگوا رہے ہیں جو دیو سائی سے زیادہ خوبصورت ہو گی۔ کل صحیح کی وجہ میں آپ کی نشیش بک ہو چکی ہیں اور دہاں آپ کی رہائش کا بندوبست بھی ہو چکا ہے۔

"آپ کس وادی کی بات کر رہے ہیں؟" میں نے مجھے ہوئے دل سے پوچھا "وادی چلو۔"

ہم سکردو واپسی پر اس مقام سے گزردے جس کے قریب نالے کے کنارے وہ قدیم چنان تھی جس پر گندھارا عمد کے پڑھ بجھنے تاشے ہوئے تھے۔ تارکی چھیے دیو سائی کی بلندیوں سے نیچے آئی، ہمارے پیچے پیچے آئی اور پھر ہم سے آگے نکل کر وادی سکردو میں پہنچیں گے۔

"آپ فلرنہ کریں تارڑ صاحب" خواجہ صاحب نے پھر تسلی دی۔ "آپ چلو دیکھ آئیے۔ ہم آپ کی واپسی پر آپ کو دیو سائی بھگوانے کی کوشش پھر کر دیکھیں گے۔"

"نیں خواجہ صاحب۔" میں نے سرہلا بیا "دیو سائی کی برف اس برس نہیں پھٹلے گی"۔

اور اس کے گھن میں ایک چشمہ بنتا تھا۔ ہم نے وہاں منہ ہاتھ دھوایا اور پھر گول کے واحد ہوٹل کے اندر چلے گئے اور اندر ایک سکون اور خاموشی تھی جو باہر کے شور کے بعد درے جیان کرتی تھی۔ گرم چائے کے ساتھ زرکون نے بہت لطف دیا۔ یہاں دو کمرے تھے۔ ایک میں گاہک بینہ کر چائے اور زرکون توٹ کرتے اور دوسرا کمرے کا کپا فرش زرا اونچا تھا اور اس پر درجن بھر بستر لپٹنے پڑے تھے جو یہاں رات گزارنے والے مسافروں کو کرائے پر دیئے جاتے تھے۔

یہاں اُس گورے سے بھی طاقت ہوئی جو ہماری ہی دیگن میں کسی روپوں تھا اور جس کا ہاتھ مطیع صاحب کے ہاتھ میں تباہا جاتا تھا۔

"بادشاہ اس کا نام کرس ہے"۔۔۔ نظای صاحب نے متعارف کر دیا "بیدا سمجھ دار اور نیک تم کا گورا ہے۔ اور حیرت کی بات ہے کہ پڑھا لکھا ہے ابھی ابھی میں نے ذرا رعب ڈالنے کے لئے ٹھکسپیٹر کے ذریسے "ٹولٹھ ٹائٹ" کا ذکر کیا تو اس نے آرھا ڈرامہ سن دیا۔۔۔ شام بھی ہے۔"

میں نے کرس سے ایک عدد ہاؤ ڈو یو ڈو کیا اور ہاتھ ملایا۔۔۔ اور تب مجھے ایک شدید دچکا لگا۔۔۔ اس شخص کوئی جانتا تھا میری پسندیدہ قلم "پلڈرلن آف اے یمس گاؤ" اور "کس آف دی سپائنڈر وومن" کا بالکل اوکار ویم ہرست۔

"ایسا تم یقین سے کہ سکتے ہو کہ تم کرس ہو؟"

"میں الگینڈ سے چلا تھا تو کرس تھا بھی اصولی طور پر مجھے کرس ہی ہوتا چاہئے۔" اس نے اپنے سنبھلے ہالوں کو فزان پیشانی سے چینا اور پہنچنے لگا۔۔۔

یقیناً وہ اپنی شہرت کو چھپا رہا تھا اور سب کی نظریوں سے دور ہو کر الگ ہو کر سفر کر رہا تھا۔۔۔

"اور تم کمال جا رہے ہو کرس؟"

"نی الحال چلو۔۔۔ اور پھر واپس سکردو۔۔۔ گلگت، خجرا باب اور جہن۔۔۔ میری منزل ماونٹ ایورسٹ کا وہ بیس کیپ ہے جو جنگن میں ہے۔۔۔ مجھے وہاں پہنچنے کے لئے ایک وضع ہمرا ہیور کرنا ہو گا"

مطیع میرے قریب ہوا۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا ہے کہ یہ چلو میں کمال قیام کرے گا اور اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ کمال غیرے گا تو اسے اپنے کرے میں سلا لیں گے"

"پا نہیں کیا ہوں ہے۔۔۔ اور یہ بھی پا نہیں کہ وہاں جو کرو ملے گا اتنا بڑا ہو

دیا ہے۔۔۔ اورے مطیع تم کدھر ہو یا پار؟"

"میں ادھر ہوں" مطیع نے کہیں سے سر نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور ادھر تم کیا کر رہے ہو؟" نظای صاحب نے پوچھا۔

"ایک گورا قابو آگیا ہے اس کا ہاتھ دیکھ رہا ہوں"

"بادشاہ اس کا ہاتھ ہی دیکھ رہے ہوئا۔۔۔ اندازہ کرو۔"

"نظای صاحب، حسین آباد کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے آپ نے وہ بورڈ نہیں پڑھا جس پر غیر شرعی افعال کی محاذت کی گئی ہے۔۔۔" میں نے انہیں بورڈ کی صارت سے آگاہ کیا۔۔۔

"بادشاہ یہ ہمیں کمال لے آئے ہو؟" نظای صاحب کا تقدیر پوری دیگن میں ابھی کے شور سے بلند ہو کر گونجا "مشرک ہے حسین آباد میں دیگن روک کر ہماری چینگ نہیں کی گئی ورنہ ہمیں بھی غیر شرعی قرار دے کر روک دیا جاتا۔"

حسین آباد سے آگے الگ ہو کر وادی ہٹھ کو چلا گیا۔۔۔ کے نو اور سکنور ڈیا کو جانے والی کوہ پیا نہیں اسی راستے پر جاتی ہیں۔۔۔ داسو، اٹھکوئے، دریائے براللہ اور لی گو کے راستے دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے نوکی جانب ہو یہاں سے چدرہ روز کی پیدل مسافت پر واقع ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسافر حضرات کی ٹکلیں واضح ہونے لگیں اور جیکے دکھائی دینے لگے، میرے پیچے سودی عرب میں ملازم ایک ایسا بلتی تھا جو اپنی بوڑھی اماں جان کی آنکھوں کا پیچ کاپ کرائے کے لئے سکردو گیا تھا اور اب اپنے قبے کو لوٹ رہا تھا۔ اماں جان کی ٹھلل لداخی تھی اور وہ اپنے روایتی چوٹے اور ٹوپی میں ملبوس تھیں۔ ان کی درختوں میں ڈھیاں کندھوں پر لختی تھیں۔ چاندی کا زیور اور بھاری جھکے جن کی وجہ سے ان کے کان مہاتا بدھ کی طرح لانے ہو چکے تھے۔۔۔ ان کے چھرے پر پہاڑوں کی زندگی کی تمام تر مشقت کھددی ہوئی تھی اور ان کی آنکھیں غالی تھیں۔۔۔ وہ بالکل نہیں دیکھ سکتی تھیں۔۔۔ سکردو کی ناؤں کمپی کا ایک کلرک بھی اس دیگن میں سوار اپنے گاؤں کو جا رہا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ ہمارے ساتھ کسی نہ کسی طرح ٹھنکلو شروع کر دے۔۔۔

ویگن "گول" کے قبے میں پہلی بار رکی اور چائے کے لئے رکی۔۔۔ باہر لگلے تو تیز ہوا سے سفیدے کے درخت دوہرے ہوئے جاتے تھے اور راستے کی رست بلند ہو کر ہر شے کو دھنڈلاتی تھی۔۔۔ قریب تی ایک دیدہ زیب پرانی مسجد تھی

گا کہ ہم چاروں اس میں سا جائیں۔۔۔"

"بادشاہ وی آئی پی روم بک کروایا ہے خواجہ صاحب نے ۔۔۔ یہ سنگ روم میں سو جائے گا صوفی پر ۔۔۔ دیے کچڑو گورا ہے اس کے حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔۔۔" جب ہم اس کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو وہ ماتھے پر ایک سلوٹ ڈالے ایک شراری مکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھنا جا رہا تھا۔

گول کے بعد وادی و سیع ہوتی گئی دریا کے پار بلندی پر سربز قلعات دکھائی دیتے تھے ہو چھوٹے چھوٹے دہلات تھے، یہ نارتان کا علاقہ تھا۔ ڈرائیور نے ہتایا کہ ابھی پچھلے دنوں یہاں کے باسمیوں نے ایک ستو ٹانگر کو کپڑا تھا۔۔۔ اور یہ ستو ٹانگر یا بر قافی شیر بھی ایک بحیرہ تھے۔ ایک پرکشش جانور ۔۔۔ ایسا ہے کہ کسی غیر محلی سیاح مقامی گانیڈز کے ہمراہ میون ٹرا قرم کی بلندیوں اور بر فوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں مگر اس سفید شیر کا صرف دیدار کر سکیں یا ایک عدد تصویر اتار سکیں۔ ایک الگی سم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جنہوں نے عمر عزیز کا پیشہ حصہ ستو ٹانگر دیکھنے کی آرزو میں پہاڑوں میں برس کیا اور وہ اس بات پر نازدیکیں کہ انہوں نے ایک مردہ اس کی دم دیکھی تھی۔۔۔ بقیہ شیر چنان کے پیچے بیٹھا ہوا تھا۔

ویکن ایک ہمار، پکے اور قدارے پتھر لیے راست پر چلی جا رہی تھی لیکن یہ راست بلند پہاڑوں کے پیچے میں ایک میدان نمائانہ تھا۔

"وہ ہو بڑا پتھر دکھائی دتا ہے۔ صاحب تو اس پر پرانا تصویر ہے۔۔۔ نورست لوگ دیکھتا ہے" ڈرائیور نے لمحہ پر لو قریب آتے ایک جمازی سائز کے پتھر کی جانب اشارہ کیا جو راستے کے کنارے پر ایک عظیم کھڈر کی طرح پڑا تھا۔

"ہم بھی دیکھتا ہے۔۔۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "ویکن روکنا" "رفع کو صاحب کافر لوگ کا تصویر ہے آپ تو ماشاء اللہ مسلمان ہو" اس نے ویکن اور تجز کر دی۔

"اندازہ کرو" نکای صاحب کی بھی کی آواز مجھ تک آئی۔ ایک چنان دکھائی وی تو ڈرائیور نے پھر اطلاع کی کہ صاحب اوہر بھی کافر لوگ کی تصویر نہیں ہے اور نورست دیکھتا ہے۔ اس بارہ میں نے اس کا بازو پکڑ کر ڈرائیور کے چھ سے کما کر بھائی جان آپ ویکن روک لو اور میری مسلمانی کو اتنا کمزورتہ جانو کہ ڈرائیور ہاں دیکھنے سے خطرہ میں پڑ جائے گی۔

یہ ایک بہت بڑی سرخ چنانی تھی جس پر زمانہ قبل از تاریخ کے انسانوں نے اپنی خواہشوں کا اطمینان کیا تھا۔ بارہ سکے تمہار کان۔۔۔ درخت۔۔۔ شکاری اور ان کے علاوہ اس زمانے کے بعد بدھ کے پیغمبر یوسف کے ہاتھے ہوئے گوڑے اور بدھ کی شکلیں۔۔۔ ایک عظیم اور کھلی وسعت میں ایک ویکن جس کے سافر اوہر اور ہر کمر پر تھے۔۔۔ ایک چنان اور اس پر ان مصوروں کا اطمینان فن جو کبھی ان خطوں میں آباد تھے۔۔۔ شاید انہوں نے بھی کبھی اپنی بستی کے باہر حسین آباد کی طرح کوئی بورڈ لگایا ہو گا کہ خود اس بستی میں ظاہر بدھ تعلیمات۔۔۔

سفر دوبارہ شروع ہوا تو ویکن میں پربان آگئیں۔۔۔ ملستان اور ہمارے بقیہ ٹھال میں پری ایک خیال نہیں بکھر حیثت کے آس پاس ہے۔ ان میں محلہ ہیری پربان یعنی چہل بیس بھی ہوتی ہیں۔ بوڑھی اماں جان کے بیویوں پر بھی مکراہٹ کھیل رہی تھی اور ویکن کے مقامی مسافر ہمیں پریوں کے قصے سنارہے تھے۔۔۔ ان میں ایک مولوی صاحب البتہ قدرے خشمگین ہوتے تھے لیکن وہ بھی کھل کر پریوں کے خلاف کچھ نہیں کہتے تھے۔۔۔

سکردو ہاؤں کمپی کا کلرک تو پری پیش کیا تھا اور بقیہ مسافر سرہا ہا کر اس کی ہاؤں کی تائید کرتے جاتے تھے۔۔۔

"پری سے ملاقات کرنے کا کوئی آسان طریقہ تو بتا دیجئے" مطیع نے عینک کے پیشے صاف کرتے ہوئے نہایت ہریداری سے دریافت کیا۔

"صاحب بہت اچھا بس پہنچو خوشبو لگاؤ اور آدمی رات کے وقت گاؤں سے باہر کسی بلند مقام پر چلے جاؤ"۔

"آدمی رات سے پہلے نہیں آسکتی پری" نکای صاحب نے نہایت دلچسپی سے دریافت کیا۔

"نہیں صاحب۔۔۔ اندر ہمراہ ہونا چاہئے"

"لو آپ پری کے چاؤ میں ہیاں جاؤ اور اندر ہرے میں آجائے چیل تو پھر۔۔۔" نکای صاحب پھر بولے۔

"تو یہ چیل کی بد قسمتی ہوگی ہاں" مطیع نے فقرہ کسا اور نکای صاحب نے صرف "اندازہ کرو" کہنے پر اکتفا کیا۔

"تو جتاب بلند مقام پر پہلے جاؤ آدمی رات کے وقت۔۔۔ اور پھر بھلی سی خوشبو پہلے آئے گی پھر ہوا پہلے گی اور پری آجائے گی اور اگر وہ آپ کو پسند کر لے تو آپ کو

کام میں برابر کے شریک تھے۔۔۔ یہاں یاک اور گائے کے اختلاط سے پیدا کردہ جانور زندہ کھنقوں میں چڑا نظر آیا۔ یہاں لے لے پاؤں اور موٹی دم والا زندہ جو یاک اور گائے کے درمیان ایک سمجھوتہ ہے۔۔۔ یاک کے لے لے یہ بلندی کم ہے اور گائے یا بل کے لے لے اتنی بلندی بہت زیادہ ہے۔۔۔ دونوں اس موسم میں زندہ نہیں رہ سکتے بلکہ کام نہیں کر سکتے۔۔۔ اس لے لے دونوں کا آواہ آدھا۔۔۔ یعنی زندہ۔۔۔

"صاحب دیکھیں اور ہر بیوگو کے قبیلے میں کٹائی ہو رہی ہے" ڈرائیور نے ویکن زرا آہست کی۔ یوگو کے پاشدے جو اور گندم کے گھنٹے سنبھال رہے تھے اور ان میں سے بیشتر کے کالوں میں یا نوپیوں پر پھول جئے تھے۔ بلتی پھولوں کے بے حد شوقین ہیں۔ کچی کوٹھری کی چھٹ پر نہن کے گلبوں میں پھول اور نیلیں بمار ویتی ہیں

"براه" میں سعودی عرب میں کام کرنے والا شخص اپنی نایماں الام کے ساتھ اتنا اور اس نے ہمیں ایک ائمہ دعوت دی جو اگر میں اکیلا ہوتا تو ضرور قبول کر لے۔۔۔ کشیری طرز کا لکڑی کا بنا ہوا مکان ایک درے کے پتوں کے قریب ایک سربراہی کیتے کے ساتھ اور وہ اس کا گھر تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ہم ایک شب کے لئے اس کے مہمان بن جائیں۔ وہ بہت دیر ویکن کے باہر اپنی اندھی لام جان کے ساتھ کھڑا ہمارے ہواب کا انتشار کرتا رہا تھا۔۔۔ بہت بوجھ ہوتا اور ہم نے بو جمل دل سے انکار کر دیا۔

پلو کے راستے میں ایک ایسا ٹھراڑا بھی تھا جہاں خوبیوں کے باخون میں جیٹے بہتے تھے۔ ایک نایمات سوہنے کا بونا بلتی بیبا آٹا پینے والی چکی کے اندر آئٹے کی سفیدی میں نظری نہیں آتا تھا اور مجھے دیکھ کر وہ آئٹے سے بننے ہوئے ایک پارے بجوت کی طرح غمودار ہوا اور پوچھلے منہ سے مکرانے لگا۔۔۔ میں اسے چکی کے اندر ہر بڑے سے باہر لایا تاکہ ایک تصویر ایمار سکوں تو وہ سورج کی روشنی سے جیسے اور چھوٹا ہو گیا۔

تصویر کھنچنے کے بعد وہ فوراً چکی کے اندر سکھ گیا۔۔۔ شاید وہ دیں اس کی کوٹھری کے اندر آئٹے سے بننے ہوئے اندر ہرے میں پیدا ہو کر جوان ہوا تھا اور بوزھا ہوا تھا۔ اس ٹھراڑا کے بعد ہماری ویکن ایک ایسے راستے پر سے گزرو جس کے دونوں جانب خوبیوں کے بالغ تھے اور ایک شانصیں راستے پر جھلکی، سورج کو روکتی تھیں اور یہ راستہ تمام کا تمام زرد رنگ کا تھا اور روشن تھا کہ اس پر درختوں سے

اس سے شادی کرنی پڑے گی"

"سبحان اللہ" نقایی صاحب نے جھوم کر کہا۔

"پری سے شادی کس طرح ہو سکتی ہے؟"

"صاحب ہمارے گاؤں میں ایسے لوگ ہیں جن کی یہاں پریاں ہیں۔۔۔ اور وہ وہ سرے لوگوں کو نظر تو نہیں آتیں تھیں میں آپ کو پریوں کے پیچے دکھا سکتا ہوں"

"پریاں نہ سی پریوں کے پیچے سی" "پیار

نقایی آپ ذرا بات سننے دو" مطیع نے جھینکا کر کہا۔۔۔ "تھی تو پریوں کے پیچوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی"

"تھی صاحب۔۔۔ ہمارے گاؤں میں ہیں"

"صاحب یہ بالکل تھیک کہتا ہے۔۔۔" بڑی اماں جان کے بیٹے نے سرہلایا ہمارے گاؤں میں بھی پریوں کے پیچے ہیں"

جو بات ایک بلکے چکلے اور نئم نجیدہ انداز میں شروع ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے عمل یقین کی وجہ سے ہم پر اڑ کرنے لگی۔۔۔ کیا پہنچ یہ حج کہتے ہوں اور ہم یہ لا علم ہوں۔۔۔

"میری شادی پری سے ہو سکتی ہے۔۔۔" مطیع نے پوچھا۔

"اندازہ کرو تارڑ صاحب۔۔۔" نقایی صاحب پہنچنے لگے۔

"اس میں پہنچنے کی کوئی بات ہے۔۔۔ اگر پریاں ان لوگوں کے ساتھ شادی کر سکتی ہیں تو میرے ساتھ کیوں نہیں کر سکتیں" مطیع مکراتے ہوئے بولا

"اس لے کر پری آخر پری ہوتی ہے اس کا کچھ تو تذوق ہو گا۔۔۔" جواب آیا واڈی کی وسعت سکنے لگی۔ پہاڑ قریب ہوئے۔ ہم ایک ایسے مقام تک آگئے جہاں سندھ ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ دریائے سندھ اور هر لداخ کی جانب سے آرہا تھا اور ہم اسے عبور کر کے دریائے شیوک کے کنارے سفر کرنے لگے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سندھ اور شیوک آپس میں ملتے تھے۔ یہاں شیوک ایک عظیم پانیوں والا دریا تھا اور سندھ نبہتا چھوٹا تھا تھا لیکن ملاب کے بعد یہ شیوک کی قیست کہ اس کا نام سندھ ہو جاتا تھا۔۔۔ اور یہیں سے گدم اور جو کے سفرے تھے وہیں چھپ میں ایسے چکتے تھے چھپے ایک ایک بولے اور خوشے کو سونے کے پانی سے پونٹ کیا گیا ہو۔ کٹانیاں شروع تھیں اور ان علاقوں کے کسان کھنقوں میں تھے۔ ان کی عورتیں اور پیچے بھی ان کے

وکھتا تھا۔

"کم آن کرس ... " میں نے اندر جیرے میں پکارا۔

"تینک یو ... " وہ ہمارے پیچے پڑنے لگا۔

چلو کی رات میں اس خفتریت ہاؤس میں وہ پراسرارست تھی جو ہر بھجے ہوئے سافر کو ایک ابجی مقام میں اور رات کے اندر جیرے میں پختے پر کسی نامعلوم رہائش گاہ کو دیکھ کر بدن میں پھیلتی ہے۔ ہم نے اپنا سامان برآمدے میں رکھا اور ادھر ادھر تاک جھانک کرنے لگے۔ ایک کمرے میں ڈائینگ ٹیبل پر دو سفید قام سیاح سر جھکائے پیٹھے تھے اور کچھ کھا رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک دروازہ کھلا اور ایک جھکا ہوا شخص ایک چھاتی کو چکلی میں دبائے ہوئے باہر آیا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اور صرف دیکھا اور پھر چھاتی سیاح ہوڑے کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔

"لیکسکووز ی ... " ظایا صاحب نے مجھے دھکیل کر پیچے کیا اور ان سے براہ راست مخاطب ہو گئے۔

"چوکیدار کہاں ہے؟"

وہ جوڑا اتنا بڑھا نہیں تھا جتنا ہے زار تھا۔ ہم تینوں کو دیکھ کر وہ کچھ خوش نہ تھے۔ شاید ہم اگلی مکمل تھائی میں مغل ہوئے تھے۔ مرد نے سر اٹھایا۔ اس کے سامنے اس کا ہاتھ تھا جس میں ایک کانٹا تھا جس پر پتنے کی وال کے چند دانتے لرز رہے تھے۔ "چلائی" اس نے کما اور پھر وال نوش کرنے لگا۔ چوکیدار پانچ منٹ بعد چلائی لے کر آیا تو ہم نے کھاس کر اسے اپنی موجودگی کی اطلاع دی اور پھر ریز رویش سپ اس کے سامنے پیش کی جس پر وہ آئی پی روم ہمارے نام لکھ تھا۔ اس نے سپ دیکھی اور سرہلا یا۔

"او صاحب ... " وہ باہر آیا اور برآمدے میں رکھے ہمارے سامان پر ایک نظر ڈال کر ایک دروازہ کھول دیا۔ چلو کے مطابق یہ یقیناً نہایت آرام وہ رہائش تھی لیکن ظایا صاحب قدرے مایوس ہوئے۔ "بادشاہ یہ وہ آئی پی روم ہے تو عام روم کا کیا حال ہو گی۔"

"عام روم میں کری نہیں ہے صاحب" چوکیدار بولا۔ "اور قالمیں بھی نہیں ہے۔"

تب ہم نے غور کیا کہ واقعی وہاں دو کریساں بھی تھیں اور فرش پر کچھ بچھا ہوا

گرنے والی بے انت خوبیاں تھے در تھہ بھجی ہوئی تھیں اور ان پر ہماری ویگن کے ہزار کچھ کچھ کی آوازیں نکالتے چلتے تھے۔ اور ہم پیچے دیکھتے تھے تو زور راستے میں وہ سیاہ لکیریں نظر آتیں تھیں جو ہمارے ٹانروں کے نشان تھے۔ شام ہو رہی تھی اور گھیت مزید سنترے ہو رہے تھے۔

ویگن کچھ دیر کے لیے غواڑی کے خوبصورت قبیلے میں بھی رکی اب ہم دریائے شیوک کے اوپر معلق چنان میں بھی ہوئی ٹنگ اور نہم پختہ سرڑک پر تھے اور چنان کا سایہ دریا کے پار تک پھیلا جاتا تھا اور اتری شام کے ان خاموش لمحوں میں اور اس لینڈ سکیپ میں جو لاہور سے بہت دور لداخ کی بلندیوں کے آس پاس دریائے شیوک کے کنارے پر تھی، میں نے ویگن کی گھری سے باہر دیکھا جس کا سکھ میں اسکے کنارے پر تھا۔ اور وہاں ایک وادی تھی کوئی درہ تھا اور ایک چھوٹی سی سفیدی تھی جو ایک خواہاں اور دھیمی آبشار تھی جو بہت بلندی سے پیچے گر رہی تھی۔ قاطے کی وجہ سے آبشار ایک تصویر کی طرح ساکت تھی اور کبھی واہمہ ہو تاکہ نہیں یہ پانی ہے اور تب پر تصویر آہست سے حرکت میں آ جاتی یہ ایک اور خواہش تھی جو بہت قاطے پر تھی اور بس سے باہر تھی۔

شام گری ہو چکی تھی جب ہم دریائے شیوک کے کنارے پہنچ جس اور پر بلندی پر وادی چلو کو راست جاتا تھا۔ نہ تاریکی میں ایک تیز نالے کا شور ابھرا۔ ویگن رکی اور پھر گیر بدل کر اس ندی میں اتر گئی جو کہیں اور پرے سے آری تھی اور دریائے شیوک میں شامل ہوتی تھی۔ ہم سرڑک چھوڑ کر ندی میں اس لیے اترے کہ ندی کے پانیوں نے اس ٹنگ کو چھوڑ دیا تھا جس پل ہالیا گیا تھا اور اب ایک نئے راستے پر چلتے تھے۔ مجھے لیکن تھا کہ پانیوں کی تیزی ہمیں شیوک میں لے جائے گی اور میں پہلی دفعہ خوفزدہ ہوا۔ ندی سے نکلنے تو سرڑک پر پانی بستا تھا جس میں ہم بکھ ویگن تحریق چلی گئی اور پھر ایک درخت کے قریب رک گئی۔

"رست ہاؤس آیا ہے صاحب" ڈرائیور اپنی نشست سے اٹھ کر اتر گیا۔ کنکن ہمارے رک سیک اتارنے لگا تاریکی پسلے سے کم ہو چکی تھی کیونکہ کہیں پہاڑ کی اوت میں چاند اونچا ہو رہا تھا۔ ہم نے سامان اٹھایا اور رست ہاؤس کی جانب پہنچنے لگے انگریز سیاح کرس اس تاریکی میں دریائے شیوک کے کنارے اپنا رک سیک اٹھائے کھڑا تھا اور ہمیں رست ہاؤس کی آسائش کی جانب پڑھتا ہوا حسرت سے

بھی تھا۔

"کھانا لے گا؟" مطیع نے دریافت کیا۔

"کھانا ختم ہے صاحب۔" چوکیدار نے جواب دیا
"نہ نہ بزرگو۔" نکای صاحب نے آگے بڑھ کر چوکیدار کی تھوڑی کو
ہاتھ لگا کر مت سادت شروع کر دی۔ "پرسی آؤ ہیں۔" سافر ہیں۔ چوکے
ہندوست کر دو۔ بازار سے کچھ لے آؤ۔"

"بازار تو اور ہے صاحب اور بند ہو چکا ہو گا۔ ویسے بھی اس وقت تالہ زور پر
ہوتا ہے، ہم اس کے پار نہیں جاسکتے۔"
"لینی رات کے وقت رست ہاؤس اور چلو کے درمیان ندی نالے منہ زور ہو
جاتے ہیں؟"

"جنی صاحب۔ اچھا صاحب میں انداز کھتا ہوں۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے۔" نکای صاحب نے ہاتھ اختاکر دعا کی۔ "جا جا
کر انداز کیجھ۔ ایک نہیں جتنے دیکھ سکا ہے دیکھ اور پھر ان کا ہنا آٹیت اور کھلا
سافروں کو۔"

چوکیدار نے نکای صاحب کو شک کی لگا سے دیکھا اور پھر چلا گیا۔ تھوڑی دیر
کے بعد پھر واپس آیا "صاحب چلو کے اے۔" صاحب کا فون آیا تھا کہ مہاتوں کو
ہنا دو کہ وہ صح تو بے آئیں گے اور پھر آپ کو چلو کی سیر کرائیں گے اور صاحب
انداز میں ملا۔"

"او تیرا بیرا غرق۔" نکای صاحب نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا "اب کیا
ہو گا؟"

"صاحب انداز میں ملا لیکن مرغی مل گئی ہے۔ وہ ہنالوں؟"

"تیرے پیچے جیں۔" نکای صاحب بترے اٹھے اور چوکیدار کے گال
پر ایک واچی سایوسہ دیا۔ چوکیدار نے اب ذرا زیادہ شک کی نظروں سے نکای
صاحب کو دیکھا اور چلا گیا۔ کرس نے اپنا سلیپنگ بیگ نکلا اور فرش پر بچا کر اس
میں گھس گیا۔ مطیع کے حصے میں قالمین والا حصہ آیا اور وہ اپنا سلیپنگ بیگ اس پر
بچا کر آلتی پالتی مار کر بینٹ گیا۔ میں اور نکای صاحب دونوں بسترتوں پر قابض ہو گئے۔
"اوہ مجھے چلو پسند آگیا۔" کرس نے ایک گمراہنس لے کر کہا۔

"تم نے چلو میں دیکھا کیا ہے پر خودار جو ابھی سے پسند آگیا ہے۔" نکای
صاحب نے کبل میں سے سرٹال کر پوچھا۔
"یہ ہرگز ضروری نہیں کہ انسان کچھ دیکھ کر ہی اسے پسند کرے۔" یہ
سب کچھ ہوا میں ہوتا ہے، "ماہول میں ہوتا ہے۔ میں نے ایک گمراہنس اس کرے
میں لیا ہے تو میں جان گیا ہوں کہ چلو مجھے پسند آئے گا۔" کرس نے مہات کے تقری
کی۔

"پادشاہ ہے ہاں دانشور گورا۔" کیسی الٹ پٹ پاس کرتا ہے جو بھجہ
میں نہیں آتیں۔" نکای صاحب بھی کبل سے باہر ہو گئے۔
"میری خوش تھتی ہے کہ مجھے اتنے پڑھے لکھے پاکستانیوں کے ساتھ سفر کرنے
اور رات گزارنے کا موقع مل رہا ہے۔"

اس بیان پر سب حضرات نے بینے پھلا کر کرس کی تائید کی۔
میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کی قومیں اگر۔۔۔" کرس اپنی ہتھیلی پھیلا کر پھر
تقری شروع کرنے کو تھا کہ مطیع نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا "آہا۔۔۔ دا۔۔۔ کیا ہاتھ
ہے۔" مطیع نے جھوم کر کہا۔

"یہ میرا ہاتھ ہے۔" کرس نے ہاتھ چڑائے کی کوشش کی لیکن مطیع دست شناس
کم اور دست کیز زیادہ تھا۔ اس پر کرس نے اسے شک کی اپنی نظروں سے دیکھا جن
نظروں سے چوکیدار نے چوئے جانے پر نکای صاحب کو دیکھا تھا کہ یہ سخت
انشور نہیں والا میرا ہاتھ کیوں اتنی محبت سے تھا۔۔۔ ہوئے ہے۔"

"واہ۔۔۔" مطیع نے زبان سے ایک پٹا خدا سا چالایا "یہ تو پولین کا ہاتھ ہے۔"
"پولین کا۔۔۔" کرس چوکنا ہو گیا اور پھر خوشدنی سے بولا "اس کا مطلب ہے کہ

گھر سے چلتے ہوئے میں اپنے ہاتھ کی بجائے پولین کا ہاتھ ساتھ لے آیا ہوں۔"
"میں جھوٹ نہیں کہ رہا۔" مطیع نے باقاعدہ وجہ میں آکر کہا۔ "تسارے ہاتھ
کی یہ انگلی۔۔۔" اس نے کرس کی پچھی کو ایک بھٹڑی توری کی طرح چکلی میں لیتے
ہوئے سرہلایا۔ "سو فھمد پولین کی ہے اور تمہاری شادی ایک ایسی خاتون کے ساتھ ہو
گی جو ایک جگہ گھربنا کر نہیں رہے گی۔"

کرس کی مکراہٹ یکدم سٹ گئی "کراٹ۔۔۔" میری ملکیت روڈارت
خارج میں کام کرتی ہے اور ان دونوں ہالینڈ میں پوٹھے ہے۔۔۔ گاؤ۔۔۔ تم نے یہ کیسے

شیوک میں؟ "نکای کئے گے

"ہم پر سوں واپس سکردو چلے جائیں گے۔ آج کی رات اور کل کی رات
تو آج کی رات۔" میں نے ابھی فقرہ کمل نہیں کیا تھا کہ نکای
صاحب نے ایک دلدوڑ "ہائے ہائے" کی اور بستر پر کھڑے ہو کر کئے گے "ہائے ہائے
آج کی رات سازدہل پر درونہ چھپڑے خالمو نوری نے کیا گناہ کیا تھا"
"عرض میں یہ کہ رہا تھا کہ ذرا باہر چل کر دیکھتے ہیں کہ وادی چلو کی رات کیسی
ہوتی ہے۔"

"ہائے ہائے آج کی رات۔" نکای صاحب سرہلاتے ہوئے بستر سے نیچے آ
گئے۔ کرس کو معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہے لیکن وہ بے حد
خوش نظر آ رہا تھا۔
کمرے سے نکلے۔ برآمدے سے پرے صرف اندر ہمرا تھا اور اس اندر ہرے میں
سے کہیں کہیں بھلی روشنی آتی تھی۔

"ہاں جی کہ ہر چیز... داں کہ باسیں؟" نکای صاحب نے پوچھا۔
"آپ تو یہ شہ باسیں چلتے ہیں۔ اس لیے باسیں"

ایک راست نیچے جاتا تھا جس پر ہم چل کر آئے تھے۔ یہ اب دکھائی تو نہیں دیتا
تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ وہاں ہے پھر اس پر شور نالے کی موجودگی کا احساس ہوا
اور وہ قریب آگیا۔ ہم سب ایک ہی لمحے میں ایک کیفیت سے دوچار ہوئے کہ
ہمارے شوز بھیگ چکے ہیں، اور ہم پانی میں چل رہے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو بچانے
کی خاطر ادھر ادھر پاؤں رکھنے کی کوشش کی لیکن اندر ہرے میں صرف پانی تھا اور پاؤں
پانی ہی میں پڑتے۔ یہ وہ راست تھا جس پر نالے کا پانی کناروں سے نکل کر پہر رہا تھا۔
اس راستے کے اختتام پر ہمیں روشنی دکھائی دی اور یہاں وہ تالہ دریائے شیوک میں
شامل ہو رہا تھا۔ جہاں سے ہم آئے تھے وہاں گئے درخت تھے اور اس لیے تاریکی تھی
اور یہاں دریائے شیوک کے کنارے اور پورے دریا پر اور دوسرے کنارے پر جو
بست دور تھا اور جہاں چٹائیں بلند ہوتی تھیں وہاں ہر جگہ روشنی تھی، بھلی چاندنی تھی۔
ہم اب دیکھ کر چل سکتے تھے اور ہم پھد کتے ہوئے، چھوٹی چھوٹی نالیوں کو پھلا لئے
ہوئے دریا کے کنارے تک چلے گئے جہاں پانی کی سفید چادر بے چینی سے ایک گرم
بدن کی طرح کساتی تھی۔

جان لیا؟"

"میں ہاتھ پڑھ سکتا ہوں۔" مطیع نے عینک اتار کر اس کے شیشے چکائے اور اسے
دوبارہ پہنچتے ہوئے دانت نکال دیے۔

"مجھے کچھ اور ہتاو۔" کرس نے اتنا تیلی لجاجت سے درخواست کی اور اپنی
اصلی مطیع کی عینک کے نیچے کھول دی۔

"اندازہ کرو۔" نکای صاحب نے بیزار ہو کر میری طرف دیکھا "یہ یہاں
چل دیکھنے آیا ہے کہ ہاتھ دیکھنے"

اوھر کرس مطیع کے ہر فقرے پر بڑی سعادت مندی سے سرہلا رہا تھا اور اس
کے کان صرف اس کی آواز پر لگے ہوئے تھے "بچپن میں تم ایک بار مرتے مرتے پچھے
تھے! تمہارے دل میں محبت کے لیے بہت جگہ ہے لیکن لوگ تمہاری محبت کا جواب
نفرت سے دیتے ہیں۔ تم بے حد حساس ہو۔ تم دل کے بہت سادہ ہو اس لیے دوست
و حمکار دے جاتے ہیں۔ تم لوگوں پر آسانی سے اعتماد کر لیتے ہو لیکن دل کے امیر ہو۔
اگلے سے اگلے برس تمہاری زندگی میں ایک بست بڑی تبدیلی آتے گی۔ تم دوستند بن
جواؤ گے۔ تم ایک ملشار شخص ہو لیکن۔" اور کرس مطیع کے ہر فقرے پر
سعادت مندی سے سرہلا رہا تھا۔

"کرس جب تم اپنے مستقبل کی خبروں سے قاریغ ہو جاؤ گے تو میں تمیں چار
برطانوی خواتین کے بارے میں چار نہایت ناقابل بیان لٹینے سناؤں گا۔" نکای نے
اپنے گھنے اور سفید بالوں میں ہاتھ پھیرا اور شرارت ان کے چہرے پر جنگل کی آگ کی
طرح پھیلتی تھی۔

"کیا واقعی؟" کرس فوراً متوجہ ہو گیا "میں ہمہ تن گوش ہوں۔ سنائیے"
میں نے کہا تھا ان کے لٹینے ناقابل بیان ہیں تو میں ایک شریف آدمی کی حیثیت
سے ایسے لٹینے کیسے نا سکتا ہوں۔" نکای نے ایک پر شور قتنہ لگایا۔ اور اسی
لمحے ہمیں احساس ہوا کہ ہم ایک دور دراز کی وادی میں ایک چھوٹے سے رست
ہاؤس کے کمرے میں بیٹھے ہیں اور باہر رات ہے اور خاموشی ہے اور اس خاموشی میں
صرف ہماری باتیں ہیں اور نکای کا قتنہ ہے جو ابھی ابھی گونجا ہے۔

"باہر چلیں۔"

"لیٹئے رہو یاد شاہو۔ آرام کرو۔ بست سفر کیا ہے اور باہر جانا کہ ہر بے؟ دریائے

صاحب شاید دریا کی قبرت کی وجہ سے موج میں تھے۔

" غالب کا شعر نا دوں؟" مطیع نے کھانس کر پوچھا۔

"مرٹ کرس اب آپ کو مطیع صاحب ہمارے ایک گرفت پورٹ غالب کا شعر نہیں گے۔ ناؤ بھی۔"

مطیع نے کھانس کر شروع کیا "دل نہادن تجھے ہوا کیا ہے۔"

نکائی صاحب فوراً دل انداز ہو گئے۔ "اویے انگریزی میں ترجمہ کر کے ناؤ" چنانچہ مطیع صاحب نے پھری بدل لی۔ "دل نہادن تجھے ہوا کیا ہے۔" او شوپڈہ ہارت وہاث بیز پھٹڈ نو یو۔ اور آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔ ایٹ لاست وہاث ازوی میرڈیں آف دس چین۔

کرس یہ شعر من کربت دیر تک عالم استفزاق میں رہا۔ پھر باہر آیا تو سراخنا لیا اور کئے گا۔ "آیا واقعی یہ کسی گرفت پورٹ کا شعر ہے۔" اکر بے تو وہ گرفت نہیں شوپڈہ پورٹ ہے۔"

"مرا دیا ہے تاں غالب کو" نکائی صاحب مطیع پر برس پڑے "یہ ترجمہ ہے؟" "چلنے نکائی صاحب آپ انگریزی پڑھاتے ہیں تو آپ اس سے بہتر ترجمہ کر دیں" مطیع ناراض ہو کر کئے گا۔

"ہماری شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا کرس۔" اور شاید کسی بھی زبان کی شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا اس لیے ہم جیسیں تمہاری شاعری نہیں ہیں۔"

پسلے نکائی صاحب نے بیڑا اوز لاست کے کچھ ہے نہیں۔ پھر میں نے بازن اور اسٹیٹ کی چند سطریں دہرا دیں اور آخر میں مطیع نے انگریزی کے چدائیے شعر نہیں ہے۔ جو بہت اچھے تھے یہیں کسی ہاصلوم شاعر کے تھے۔ بعد میں اس نے ہمیں بتایا کہ وہ ہاصلوم شاعر وہ خود تھا اور اگر وہ اس وقت یہ بتا دیتا تو نکائی صاحب ہرگز اتنی دادوہ دیجئے جائیں گے انسوں نے دی۔

خنکی زیادہ ہو کر سروی ہو گئی تھی۔ ہمارے آس پاس چھوٹی چھوٹی ہالیاں بھتی جیں اور ان میں کہیں کہیں وہ چاند بہتا تھا جو دریائے شیوک کے پھیلاو کو روشن کرتا تھا اور اس لیے ہم ایک درمرے سے الگ ہو گئے اپنی اپنی دنیاوں میں چلے گئے۔ ہم غاموش تھے کیونکہ ہمارے پاس کئے کو کوئی ایسی چیز نہ تھی جو غاموشی سے زیادہ خوبصورت ہوتی۔

"اگر ازہ کرو" نکائی صاحب نے کہا۔ "باہر یہ عالم ہے اور ہم کرے میں بدھنے نہیں۔"

اور واقعی باہر واڈیٰ پہلو کی چاندنی رات میں ایک عجیب عالم تھا۔ اور اس عالم میں صرف ہم تھے جو غیر ضروری تھے۔ دریائے شیوک ایک وسیع ریگستان کی طرح چاندنی میں لو دیتا تھا۔ ہم پتوں پر بیٹھ گئے۔ ہمیں متاب کا انتحار نہیں کرتا پڑا تھا یہیں۔ ہر سائے تھے اس کا انکس جھلکا تھا۔ اس کا انکس جس کا وجود دور ہو جاتا ہے یہیں وہ موجود رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ پلتا ہے اور آپ اس سے پاتش کرتے ہیں اور جب کبھی کوئی ایسا منظر سامنے آتا ہے۔ جب کبھی آپ کسی عالم میں جاتے ہیں تو پھر اس کی کمک اٹھتی ہے کہ وہ یہاں ہو اور تب اس کا انکس ہر سائے لئے جھلکا ہے۔ ہر شخص کے پاس اپنا ایک انکس ہوتا ہے اور جس کے پاس نہ ہو اس کی زندگی رائیگاں گئی۔

"کرس اگر تم زیادہ غاموش رہے تو میں چار انگریز خواتین کے بارے میں بتھی نہیں باتھ کے لیے سناوں گا۔" کرس نے جواب نہیں دیا۔ ماتھے پر آئے بالوں کو ایک جنگل سے پیچپے کیا اور جب رہا۔

"کرس ہم تمہاری شاعری نہیں گے" مطیع نے فرمائش کی۔

"نہیں" کرس لوزکوں کی طرح شرمگایا۔

"جیسیں اس سے بہتر سماں میں تو مل سکتے ہیں یہیں اس سے زیادہ خوبصورت ماحول نہیں ملے گا۔ سناوں"

"میرے پاس کتاب نہیں ہے۔" وہ ابھی شرم رہا تھا "یہیں میں کچھ پاکستانی شاعری سنتا پنڈ کروں گا"

"پل بھی مطیع شروع ہو جا" نکائی صاحب نے اس کے کندھے پر چھپ دی "ہمارا یہ شیر اسکول کے مبانی میں ہیئت اول آیا کرتا تھا۔ اور اسے بڑا بڑا شریاد ہے۔"

"بہت ہی دلچسپ" کرس نے سرہلایا "تو آپ لوگوں کو شعر پڑھنے کے لیے کتاب کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"پل بھی اسے سناوں والا۔" کہ لب پر آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" نکائی

"بہت ضروری ہے"

نقائی صاحب نے اپر دیکھا جمال کچھ دھنڈ تھی اور کچھ برف تھی اور ہمیں
دہانہ سک جانا تھا۔

آج پورے تو بے جب ہم ناشتے سے فارغ ہو کر رستہ ہاؤس کے چھوٹے سے
لان میں واقع ایک بستہ بڑے اخوت کے درخت کے نیچے بیٹھے وادی چپلو کی ہوا میں
لبے سانس لے رہے تھے تو فدا حسین صاحب آگئے ۔۔۔ دونوں بازوں بننے پر رکھے
شلوار قیض اور جری میں ملبوس دبليے اور لداخی نیں نقش والے فدا صاحب چپلو کے
اسٹنٹ کمپنیز تھے اور ظاہر ہے مراد اوس صاحب کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کی
ہدایت کے مطابق ہم مسافروں کو چپلو دکھانے اور ہمارے آرام و آسانی کا ذاتی
جاہزہ لینے کے لئے بخش تھیں پہنچ پکھے تھے۔

"کمال ہے بھی ۔۔۔" نقائی نے میرے کان میں کہا "بندہ اے سی ہے اور کوئی
پھول پھال اور پھنکار دغیرہ نہیں ہے۔ کتنا سادہ آدمی ہے"
فدا صاحب نے چپلو کی سیر کا لائچہ عمل تیار کر رکھا تھا اور اب ہم پر گرام کے
پسلے مرطے میں تھے یعنی خانقاہ پنچن کی جانب روائی تھے بلکہ روائی تو خیر کیا تھے ایک
اٹک کر چڑھتے جاتے تھے۔ آس پاس کھیت بست تھے۔ ان میں جو کی فصل سحری ہو
رہی تھی۔ یہاں بھی مل کے آگے بیلوں کی بجائے سیاہ نہہ نور لگا رہے تھے۔ ہم جیسے
ہیسے دریائے شیوک سے بلند ہوتے تھے آس پاس کا منظر وسیع ہوتا چلا جاتا تھا۔ ہمارا
راستہ ایک کچھ گھونڈے کے جنگلی باغ کے اپر سے گزرا تو بہت ساری نیز مکنے
بجھے رکتے پر مجبور کر دیا۔ یہ چھوٹا سا باغ کسی کے شوق نظر اور حسن جمال کی ایک صد
ریگ تصویر تھا کچھ گھونڈے کے اندر سے ایک بیچارگی کی مسکراہٹ والا شخص باہر
کیا۔۔۔ اس نے بڑے فخر سے بجھے پھولوں کے ہام جاتا۔۔۔
"یہ پھول یقیناً وادی چپلو میں ہی پائے جاتے ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"صاحب میں تو ان کا چیج لاہور سے لایا ہوں۔ ادھر ہم ایک بار پرچی ہے
صاحب۔۔۔" وہ میری جانب منہ اٹھائے کھڑا تھا۔ "آپ گھر میں آؤ صاحب جائے یو۔۔۔"
میں اس چھوٹی سی ارضی جنت میں کچھ دیر تھساڑا چاہتا تھا لیکن میرے ساتھی
بست آگے جا چکے تھے۔ یہاں سک کہ نقائی صاحب بھی ابھی ملکتے ہوئے گزر گئے
تھے۔ میں نے لاہور کے باورچی سے محدثت کی اور چڑھائی چڑھنے لگا۔۔۔ پانی کی آواز
اب زیادہ گوئھتی تھی۔ بلندی پر ایک وسیع تالاب میں چھوٹے چھوٹے پیچے نما رہے

وادی چپلو

میں سانس سنبھالا ہوا سر جھکائے ہوئے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا اور میں خاصا
تمکھ چکا تھا۔ میرا شری بے ڈول جسم اس چڑھائی کے قابل نہ تھا لیکن اس میں جو
خانہ بدوسوں والی ڈھنائی تھی اس کے سارے وہ دھیرے دھیرے آگے پڑھتا جا رہا
تھا۔ پونکہ میں سامنے دیکھ نہیں رہا تھا۔ سر جھکائے ہوئے تھا اس لیے صرف سن رہا
تھا یا حسوس کر رہا تھا اور بجھے پانی کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بست دور
کیسیں چند خوش نواز نہ دے چکتے تھے اور ان میں سے ایک پرنہہ ساتھیوں کے چپ ہو
جائے کے بعد ایک لبی "ہو ہو" کرتا تھا۔ ہوا جو پیسے سے بیکٹے چہرے کو چھوٹی تھی
سرد تھی۔ اور آس پاس جنگلی پھولوں کی سماں تھی پھر تھی۔
چند قدم آگے بمعطی گرس اور فدا حسین تھے۔

مجھ سے پہنچے نقائی صاحب کرپر ہاتھ رکھے نقارے دیکھنے کے بمانے بار بار
رکتے تھے اور ہو گئے تھے۔ "کتنی دور رہ گئی ہے یہ جن جی مسجد؟"
"جن جی نہیں" میں بھی بمانہ پر کرک گیا "پنچن مسجد۔۔۔ بلکہ خانقاہ صوفیہ
پنچن۔۔۔ انگریز موسخ جان ہارلے کے مطابق یہ اپنے منزو طرز قبری کی وجہ سے ایشیا کی
سب سے خوبصورت خانقاہ ہے۔ اس کی بنیاد حضرت میر سید علی ہدافی نے رکھی اور
اسے میر شمس الدین محمد عراقی نے پایہ تھیل کو پہنچایا۔ تقریباً "چھ سو برس قدم
ہے۔۔۔"

"جن جی میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ یہاں سے یہ مسجد کتنی دور رہ گئی ہے
اس کی وہ تاریخ نہیں پوچھی جو آپ نے کسی گائیڈ بک میں پڑھ کر لی ہے"
"ابھی بست دور ہے۔۔۔" میں نے بیزار ہو کر کہا
"یار ضروری ہے اس مسجد کو دیکھنا؟" نقائی صاحب بمشکل مجھ سک آئے۔

ہم جوئے اتار کر اندر واصل ہوئے تو سامنے دو بڑھے چڑھے آرہے تھے جو ہمیں
دکھ کر رک گئے۔ انہوں نے سلام میں پہل کی۔ ”آپ کماں سے آئے ہو صاحب؟“

اس کا جواب فدا صاحب نے اپنی زبان میں دیا اور جب بھی لاہور کا ذکر آتا تو
ہم سب مکرا کر سرپا دیتے یہ بڑھے اتنا مزدار تھے۔ یوں تو بڑھے بت پکھ
ہو سکتے ہیں۔ یعنی سکلی بُد مزاج، خوش مزاج پُمارے یا خوناک لیکن ان دو پاہوں کے
لئے یہرے پاس صرف مزیدار کا لفظ تھی ہے۔ وہ ان چھوٹے پوچھوں کی طرح تھے جو
اسکوں کے قیمتی ڈریس کے لیے پابے بن کر آگئے تھے اور اب ان کی مکراہت ان
کے قابوں میں نہ تھی۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ بٹنے لگے۔ پہلی حمل پر انکاف کے لئے
کوٹھریاں تھیں۔ ان میں بیٹھکلی داخل ہوا جائیکا تھا، اور اندر سے ان کی چھت پنجی^۱
تھی اور کل رقبہ اتنا تھا کہ عبادت گزار اگر انکھاں تی لینا چاہے تو ہاتھ چھت یا دیوار سے
جا لگیں۔ فرش پر ایک خاص گھاس کی گھاس پنجی تھی جو اتنی زم اور بچکلی تھی کہ اس
کی موجودگی میں کسی بسرا یا بچوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس گھاس میں بھی ایک
خخصوصی ممکن تھی۔ ان کوٹھریوں میں پچھلے کئی سو برسوں کی عبادت کی پاکیزگی محسوس
ہوتی تھی۔ لکڑی کی بیڑھیوں پر اختیاط سے قدم رکھتے ہوئے ہم اپر گئے۔

خانقاہ پنجن تماں کی تمام لکڑی سے بنی تھی۔ یہ اتنی بڑی نہ تھی کہ لاہور کی
شای مسجد دیکھنے والی آنکھ کو بڑی لگے لیکن یہ اتنی بڑی ضرور تھی کہیں کیشیز کے
دامن میں واقع دس جھونپڑوں پر مشتمل گاؤں کے کسی بڑی کو جیت زدہ کر دے۔ اس
کی وجہ باکلوں اندر ہون لاہور کے کسی قدم مکان کی بالکلوں سے مشابہ تھی۔ فرش پر
دریاں پھیجی تھیں۔ ہم سب ان پر بیٹھ گئے۔

”کاڑا از گریٹ“ لکھاں صاحب نے دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”تیڑا از“ کرس نے خانقاہ کے ماحول سے متاثر ہو کر ہم سب کی طرف دیکھا۔

”پنجن کے معنی کیا ہیں؟“ کسی نے پوچھا۔

”اگر اجازت ہو تو میں بتاؤں؟“ فدا صاحب جو بلیتی شرافت کا نمونہ تھے کہاں
کر بولے ”کہا جاتا ہے کہ ۴ پنجن کا مطلب ہے لوہے کی چیز۔ یہاں ایک ستون ہے جس
کے ساتھ ایک زنجیر ہوتی تھی اور مقامی آبادی کا لیکن تھا کہ یہ زنجیر ایک زمانے میں

تھے۔ اپنی اس بچ پانی میں نہاتے دیکھ کر کچھی سی چھتی تھی۔ تالاب کے پس مختصر
میں برف پوش پہاڑوں کی خاموشی تھی۔ اور باہم مجھے یہ کہنے دیکھئے کہ وادی پلہ اور
آس پاس کے خطے شدید خاموشی میں ہوتے ہیں۔ یہاں سوائے پانی کی آواز کے اور
کچھ سالی نہیں دیتا اور اس کے پہاڑوں میں گمراہی موت ایسی اداہی چیز کیس سے آگر
اتری رہتی ہے۔ اور مختصر میں چذب ہوتی رہتی ہے۔

اب راستے کے آس پاس آبادی نظر آنے لگی۔ لیکن بہت کم۔ پانی کی ٹالیاں
گھروں میں سے گزر کر کھیتوں میں جا رہی تھیں۔ یہاں بھی آپ پاشی کا وادی نکلام رانج
تحا جو وادی ہنرنہ کی ہر ہنری کا باعث ہے۔ کیشیز میں سے آئے والے پانیوں کو چھوٹی
چھوٹی نہیں میں تقسیم کر کے گھریلو اور زری ضرورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔
بس یہی راستہ تھا اور پانی کے تسلیل کی بھی موسيقی تھی اور اپر جہاں پنجن مسجد تھی
ابھی وہندہ تحریق تھی اور ہوا میں تیز سردی کھلی ہوئی تھی اور میں ایک چھوٹی نہر کے
کنارے چلتا تھا جب تھے اس بات کا ثبوت ملا کہ ان علاقوں میں واقعی پرباں ہوتی
ہیں۔ وہ چھرے جن پر وادی پلہ کے پانیوں اور چناروں کی سرشنی تھی اور ان کا حسن
زینت کا نہ تھا کسی بلندی کا تھا تو ایسے چھرے مٹی کی دیواروں کے اوپر سے بھی کھمار
خاہر ہوتے اور پھر چھپ جاتے۔ میں ان کی جاتب دیکھتا تھا کہ یہ محبوب بات ہوتی
لیکن ان کی موجودگی میں ایک شدت تھی کہ میں پھر بھی اپنی دیکھتا تھا۔ ان میں سے
ایک نے دونوں کانوں میں جنگلی پھول اؤس رکھے تھے۔ ایک کی صرف آنکھیں کچی
دیوار پر چھیسے دو نسلی دنیاوں کی طرح رکھی تھیں اور مجھے دیکھتی تھیں۔ میں اپنے
ساتھیوں سے بت پکھے رہ گیا تھا اور پکھے رہنے والے بیشگم ہو جاتے ہیں۔ میں
بھی گم تھا ان آبی گزر گاہوں کے سور میں اور اس لداخ کے آس پاس کے موسم میں،
اس بلندی میں جہاں آسمان چیپے آتا جاتا تھا اور ان شکوں میں جنہیں میں پہلی اور
آخری مرتبہ دیکھتا تھا اور صرف ایک ہاکانی بھلک دیکھتا تھا۔

وہ سب ایک پنچھی کے شور کے قریب میرے مختار تھے۔ ہم اکٹھے اپر
چڑھنے لگے۔ وہندہ کے اندر ایک دروازہ آیا جس کے ماتحت پر مندرجہ ذیل عبارت
درج تھی۔

خانقاہ پنجن

آسمان سے ملی ہوئی تھی جس کے سامنے زیادتی ہوتی تھی تو وہ اس زنجیر کو بڑا دتا تھا۔

"واہ" مطیع نے سر بیا بیا یہ تو اڑیکٹ ڈالنگ والی بات ہے۔"

"یقیناً" فدا صاحب مکارے "اس کے علاوہ اس مسجد کو سیاخ چن بھی کہتے ہیں اور اس کا مطلب ہے انصاف کی مسجد اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس مسجد کے اندر بیٹھ کر جھوٹی حرم کھائے تو وہ مر جاتا ہے۔"

"خوبیت اسی میں ہے کہ یہاں سے جلد از جلد روائی کر لی جائے" ظفای صاحب دھیرے دھیرے لیٹ گئے اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگے "ورنہ فوئیدگی کا خدو ہے۔"

بالکل وہی سے دھند اندر آتی تھی اور اوپر کیس دھند دھوپ میں آتی تھی تو اتنا منظر چکنے لگا تھا۔ خانقاہ چین ان دونوں پیٹ کی جا رہی تھی اور اس کے سینکلنوں پر س پرانے نقش دنگار پر بزرگ تصویر جا رہا تھا۔ اور جماں جماں رنگ کیا گیا تھا وہ حصہ کیمیائی اجزا کی کاشت کی وجہ سے اپنی نشت چھوڑنے پر آکا تھا۔ میں نے فدا صاحب سے گزارش کی کہ وہ اپنی افسری دکھائیں اور اس خانقاہ کو بزرگ کے پیٹ سے بچائیں۔

ہم خانقاہ سے باہر آئے تو کچھ اور دھند چٹانوں کے آس پاس سے اتری اور اس کی بالکل وہیں کے راستے اندر جانے لگی۔ شاید اس دھند میں کچھ پانی بھی تھا جو چکنے لگا اور ہم بھی گھستے ہوئے نیچے اترنے لگے۔

دوسرے کے کھانے کا بندیست فدا صاحب کی رہائش گاہ پر تھا۔ ہم ایک منظری بیٹھ کیں دیکھنے شروع کیوں کہ باہر تین بھرگڑھ چل رہے تھے جن سے وادیِ خلوکی ڈھونوں پر کھڑے پاہلے کے درخت دوسرے ہوئے جاتے تھے۔ کھڑکیاں بند تھیں لیکن ہوا ان کے کواڑوں کو دھکیلتی تھی۔ بیٹھ بالکل سادہ اور بیوادی ضرورتوں سے مزمن تھی۔

"تھنواہ میں آپ کا گزارہ ہو جاتا ہے فدا صاحب؟" ظفای صاحب نے پوچھا۔

فدا صاحب کرنے لگے "میری تو آدمی تھنواہ نیچ جاتی ہے۔ میری بھگ میں نہیں آتا کہ اتنے پیسوں کا کروں کیا؟ مگر سرکاری ہے۔ صرف کھانے کا خرچ ہے تو وہ اس وادی میں کتنا ہو جائے گا؟"

یہ ذرا قائل حیرت بات تھی کہ اسلام آباد کے قیام کے دوران میں نے وہاں ایک بھی مسلمان سرکاری افسر نہیں دکھا تھا۔ ہر افسر کے پاس کم پلاٹ تھے کم بیٹھ روم

آپریش فلاں امریکی سرجن کی بجائے فلاں برطانوی ڈاکٹر سے کوہا رہا تھا۔ کیونکہ وہ بے چارہ فلاں امریکی سرجن کو افورد نہیں کر سکا تھا۔

اس دوپہر کا کھانا ان خلوں کی وہ مخصوص خواراں تھی جو اہل خلوکاپنے معزز مسانوں کو پیش کرتے ہیں۔ چاہے یہ مسلم ہم یہی کیوں نہ ہوں۔ اپنے ہوئے چادر۔ گوشت اور مقامی سائگ۔ ہم نے جی بھر کر کھلایا اور غنودگی ایک خوبصورت پسندیدگی کی صورت ہمارے بدن پر حاوی ہونے لگی۔ ظفای صاحب قریب پنگ پوش تک ریختے ہوئے گئے اور دراز ہو گئے، مطیع عینک اتار کر آنکھیں بچکنے لگا۔ میرے لبوں پر بھی ایک احتفاظہ سولی سولی تھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور کرس ہم سب کی طرف دیکھتا تھا۔ اور اپنے ستری باؤں کو اپنے ماتھ سے میستا تھا۔

"آپ غالباً کچھ دیر کے لئے ستانہ پسند فرمائیں گے" فدا صاحب کچھ سرکاری کام پڑا کر واپس آگئے۔

"اگر ہم ستانہ پسند نہ کریں تو کیا ہو سکتا ہے؟"

"آج چار بجے خلوکے راجہ کے محل میں آپ چائے پر ہم ہوں۔ ابھی ڈیڑھ بجا ہے۔ ہم اس دوران سورمو کے پل تک جا سکتے ہیں جو سیاہن گھیشیر کے راستے میں ہے اور شہر بم کی چوٹی بھی دیکھ سکتے ہیں"

"شہر بم کی چوٹی تو دیکھنا چاہئے" میں نے ذرا بیدار ہو کر کما "ظفای صاحب دیکھی ہے شہر بم کی چوٹی؟"

"یادشاہ سو جاؤ" وہ بمشکل بولے۔ "چوٹیاں ساری ایک جیسی ہوتی ہیں اور یہ تجربے کی بات تھا رہا ہوں۔ کل دیکھ لیں گے"

"لیکن کل تو ہم چلے جائیں گے"

"ضرور دیکھنی ہے شہر بم کی چوٹی؟"

"ہاں ضرور دیکھنی ہے"

فدا صاحب کی سرکاری جیپ بڑی آنکھی سے نیچے آنے لگی اور اس کا انجم بند تھا۔ انہیں کے شور کے بغیر اس میں سواری ایک اڑن کھولے کی طرح تھی۔ نیچے دریائے شیوک کے کنارے پہنچ کر ڈرائیور نے انہیں شارت کیا اور ہم سورمو کی جانب سفر کرنے لگے۔ ریٹ پاؤس کے قریب سے گزر کر جب ہم ذرا آگے گئے تو جاں دریا کا پاٹ چڑا تھا دہاں پھولے ہوئے میکنزوں سے بنی ہوئی ایک کشتی مسافروں کی

میں ذرا آگے ہوا تو فدا صاحب نے میرا کاندھا پکڑ لیا "اعطاں... آگے کچھ نہیں
ہے"

مقامی صاحب نے مایوسی سے سر جھکا۔ "بادشاہو یہ تو بڑی شرمنیلی چوٹی ہے...
ساتھی نہیں آتی اور اس کے لئے آپ نے ہمیں سونے ہی نہیں دوا"
شہر برم کی اس بھلک کے بعد ہم سورہ موسیٰ کے پل تک گئے۔ پل کے پار ایک
دیران راستہ اور سیاہجن گلیشیر تک جاتا تھا جو ان دونوں دنیا کا بلند ترین محاذ بھگ تھا۔
وہاں پر سورہ موسیٰ کے گاؤں کے آغاز پر ایک مقامی شاہر تور علی خاں اور ایک مقامی
مولانا ہمارے مختار تھے۔

"آپ ہمارے ساتھ چائے ضرور چیجئے۔" انہوں نے ہمیں دعوت دی۔
اخروت کے ایک عادور درخت کی چھاؤں میں ایک ہی قالمین بچھا تھا، گھاس میں
ذکری تھی۔ ہم سب ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ گئے۔ مولانا صاحب سیاہ پکڑی اور
سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ نہایت پڑھے لکھے اور خوگوار طبیعت کے تھے اور پریوں پر
قیمین رکھتے تھے۔ بلکہ انہوں نے ہمیں متعدد ایسے قصے سنائے جن میں انہوں نے
پریوں کو مار بھگایا تھا۔ شاعر جو، کاچو تور حسین کہلاتے تھے ذرا شرمنیلی اور ذرا گمرے
تھے۔ وہ سنتے زیادہ تھے اور بولتے کم تھے۔ پلے ہمارے ساتھے شہتوں سے لبرز تعال
رسکے گئے۔ میں پھل زیادہ شوق سے نہیں کھاتا لیکن سورہ موسیٰ کے شہتوں ایسے تھے کہ
آپ آخری شہتوں تک تعال اور منہ کے درمیان ایک تانباً باندھے رکھیں گے۔ یہ
اتھے شد مثیلے اور منہ میں محل کر فرحت دینے والے تھے کہ ہم اپنے میزبانوں سے
غافل ہو گئے۔ اس دوران مثیلے کیک اور کیسر روٹی کے ہمراہ چائے آگئی۔ ہوا آہست
تھی گھر شہتوں اور خوبیوں کے درخوت میں سے آتی تھی اور اس میں شہر برم کی
قرہب کی تھنڈک تھی۔ ہم اس تصور اخروت کے ساتھ میں بیٹھے تھے اور یہ ایک
بیگب سر قدری قسم کا ماحول تھا جس میں ہم سانس لیتے تھے۔

یہاں سے لداخ تک کافاصلہ تیس میل کے قریب تھا۔
چند ہو رتیں اور پچھے شہتوں اتار کر گھروں کو لوٹ رہے تھے اور ہورتوں کے
کانوں میں پھول اڑسے ہوئے تھے۔

"کیا یہاں اس زمانے کی کوئی عمارت یا یادگار بھی موجود ہے جب ان خلدوں میں
ہمارا بادھ کے ہیو کا رہتے تھے؟"

تھے اس کے پچھے اتنی بڑی یونیورسٹی میں نہیں پڑھتے تھے۔ وہ اپنے دل کا بالی پاس
خھتر تھی۔ کشی کا ماں باتھ میں ایک لباساً بافس لے کرزا تھا۔ وہ اسٹنٹ کمشنر کی
جیپ دیکھ کر کر تک جھک گیا۔ مکہریوں کی یہ کشی از من قدم سے ان علاقوں میں
دریا عبور کرنے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اور اب بھی اگر آپ کو خلدوں کے
نواح میں دریا کے پار جانا ہے تو بس یہی طریقہ ہے۔ مقامی مسافر کے لیے دو روپے
اور ۳۵ روپے۔ یعنی سیاح حضرات کے لیے میں روپے۔ اس کشی کو "انڈس رافت"
بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اسے یہاں تو شیوک رافت کہا جاتے۔

خلدوں سے آگے سڑک چھان کے ساتھ چھٹ گئی اور چھان بلند ہوتی چلی گئی اور
یہاں سڑک کے ساتھ عمودی گمراہی تھی۔ پیچے بہت پیچے شیوک کا پاٹ تھا اور اس میں
پانی کہیں دور تھا۔ بلکہ پانی تو کہیں نظری نہیں آتا تھا۔ ایک وسیع اور دیران صحراء نظر
آتا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی رستہ تھی اور یہ صحراء تھی ایک کلو میٹر پیچے
تھا۔

مقامی صاحب چپ پیٹھے تھے۔

مطیع، کرس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ فدا صاحب کے ساتھ ان کا گول مٹول پچھے
کرامت حسین تھا، جوان کی گود میں بیٹھا ہمیں جیت سے دیکھ رہا تھا۔ ہم سورہ موسیٰ کے
چھوٹے سے گاؤں کی خاموشی میں سے گزر کر آگے چلے گئے۔ گاؤں کے داخلے پر ایک
چھوٹا سا ہوش تھا۔ اسے ایک لادافنی سرائے کما جائے تو شاید اس کی تصویر زیادہ واضح
ٹھوڑا پر ساتھ آئے۔ راستے کے ایک جانب ایک چھوٹا سا کچکا کرہ جہاں چائے اور
خوراک تیار کی جاتی ہے، اس کروٹ میں چند بیتزا اور راستے کے پار ذرا بلندی پر انگور کی
بیلوں کے پیچے چند چارپائیاں جہاں آپ آرام سے چائے پی سکتے ہیں۔ ان علاقوں میں
بہت کم لوگ آتے ہیں اور اسی لئے یہ سرائیں مسافروں کی راہ بھتی رہتی ہیں۔ یہاں
مقامی لوگ بھی آتے ہیں جو پیدل راستوں سے کسی دور کی وادی سے خلدوں پہنچتے ہیں
اور پھر وہ سکردوں تک چلے جاتے ہیں اور سکردوں ان کے لئے تندب کی آخری چوکی
ہوتی ہے۔

ڈرائیور نے جیپ روک دی اور یکدم اس کے ساتھ یہ چیز کی طرح ہاڑک
لیکن بالکل غھری ہوئی و مخدود خاموشی میں ہم سب کان لگائے کچھ نہ سنتے تھے۔ فدا
صاحب جیپ سے اترے۔ یہ ساتھے دریائے شیوک کے صحراء کے پار ان پہاڑوں میں
جو چوٹی جھائختی ہے وہ شہر برم ہے۔

کے دونوں جانب دو عظیم چار کھڑے تھے۔ یہ زیان طے کر کے ہم چھوڑتے ہوئے آگئے۔

"والٹے کا دروازہ کہاں ہے؟"

میں نے ایک بند دروازے کو دھیلنے کی کوشش کی۔

"یہ محل تو بند پڑا ہے" فدا صاحب نے بتایا "راجہ صاحب کی رہائش اور ہر ہے"

اوہر محل کے پہلو میں ایک نیا مکان تھا۔ دروازے پر مار خور کے سینگ آؤیزاں تھے۔ یہ ایک عجیب، ہر شے سے کٹا ہوا اور ہر آب و ہوا سے مختلف اور ہر آبادی سے جدا اور کسی اور تاریخ اور وقت کا ایک بزرگ تھا اور یہاں بھی ان خلقوں کی خاموشی کھڑی ہو رہی تھی اور اس چپ میں ہوا کی دھیمی چال تھی یا کہیں زیر زمین چلتے والے پانی کی آواز تھی۔ اور یہاں ایک خوبصورت نمراؤ تھا جو بالکل الگ اور تھاتھا اور اس ماحول میں ہم چوکتے ہو کر اوہر اور دیکھتے تھے کہ ہم کہاں آگئے ہیں اور اس نمرے ہوئے طسم میں ہم جان نہ سکے کہ کب راجہ صاحب آئے ہیں اور ہم سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ سخ و سفید، نیلی آنکھوں والے ناصر علی خان جو مر جوم راجہ صاحب کے بڑے بیٹے ہیں۔ ان کے جانشین تو یہیں لیکن راجاوں کا عمد چونکہ انتظام پڑی ہو چکا ہے اس لئے وہ بڑے مزے سے پولیس میں سب انسپکٹری کرتے ہیں۔ اور ان کے چھوٹے بھائی محبوب علی خان بچوں کو پڑھاتے ہیں۔۔۔ یعنی دونوں نے حکرانی کے لئے ہی پسند کیے ہیں۔

ایک طویل برآمدے میں سے گزر کر ہم والان کے اور ہٹکنے والے ایک چھوٹے سے کرے میں داخل ہوئے۔ برآمدے میں بھی مار خوروں کے سر اور سینگ آؤیزاں تھے۔ راجہ صاحب اردو نہیں جانتے تھے اور ہم مقامی بھتی زیان سے ناواقف تھے اس لئے زیادہ تر گھنگوں مکراہوں کے ذریعے ہوئی اور کچھ ترجیحی فدا صاحب نے کی۔ ہم بے حد تحکم پکے تھے اور بس یہی وہ جگہ تھی جس کے لیے ہم ساری زندگی مارے جائے پھر تھے۔ اور یہی وہ آخری آرامگاہ تھی جس کے بعد انسان کہیں نہیں جاتا اور اپنے بدن کی تھکاوت کے ساتھ مٹی میں مل جاتا ہے۔ اس مختصر کرے میں راجہ صاحب کی چند پرانی تصاویر آؤیزاں تھیں۔ اور ان کے اور ایک تختے پر آرائش کی مختلف اشیاء قرینے سے تجھیں اور ان میں سے کسی ایز فریشن کا غالی ڈبے بھی تھا۔

ہمارے میزان سوچ میں پڑ گئے پھر مولانا نے سر اٹھا کر کما "یہاں کچھ گمراہیے ہیں جن میں چھوڑتے سے بننے ہوئے ہیں اور ان پر پیٹھ کر بدھ راہب شراب پا کرتے تھے"

"سبحان اللہ" نقایی صاحب چکے

"کیا مطلب" مولانا نے اپنی گھورا۔

"میرا مطلب ہے لا چوں والا۔" نقایی صاحب مکرائے۔

سور مو ہمارے سفر کی آخری حد تھائیں سکردو بست دور لگتا تھا اور لاہور تو تب دور گئے جب انسان سکردو میں ہو۔ ہمیں اب واپس جانا تھا۔

سور مو سے باہر میں نے اس سور مو سرائے کو حضرت سے دیکھا۔ جس میں قیام ایک خواہش تھا اور سرائے میں کون ہے جو زیادہ غصہ نہیں چاہتا لیکن غصہ نہیں سکتا اور میں بھی غصہ نہیں سکتا تھا۔ ہم پلے والیں آئے تو مسکیروں کی کشتی شیوک کے میں درمیان میں تھی اور پہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کدھر کو جا رہی ہے یا شاید اوہر کو آرہی ہے۔ یہاں سے سڑک اور پانی اور ہم تھوڑی دیر کے بعد پہلی بار پلے کے بازار میں سے گزر رہے تھے۔

"کمال ہے اصل پلے تو یہاں ہے اور ہم اس کے دامن میں ہی گھومتے رہے" مطیع کرنے لگا۔ یہاں ایک بڑے قبے کی تمام تر سوتیں دکھائی دے رہی تھیں اور بازار خاصا باروف تھا۔ راجہ کے محل کے راستے میں ہمیں دو تین نمائت عالی شان اور قدیم مکان نظر آئے جو غالباً راجہ کے خاندان کے تھے۔ ایک بگی گلی میں گھس کر جیپ رک گئی۔ ایک پھانک کے قریب جا کر فدا صاحب کرنے لگے "یہ وہ حصہ ہے جہاں اصلیں ہوا کرتا تھا۔ یہی محل میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔"

ہم اس راستے سے اندر گئے تو ہمارے سامنے ایک وسیع چھوڑتے پر ایک ایسی عمارت کھنڈی تھی جو یہاں کی نہیں لگتی تھی۔ شاید تبت یا مغلوں یا میں کہیں تھی اور اسے جوں کا توں اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک سفید دیوار میں سالمخورہ لکڑی کی محراجیں اور ان کے آگے چوبی جالیاں ایک بست بڑا جھروکا جو چھٹ سے شروع ہو کر نہیں تک آتا تھا اور جس میں برآمدے کھڑکیاں اور محراجیں تھیں اور اس دفتریب رہائش گاہ کے پیس منظر میں قراقرم کی بلندی اور شاندار دہشت تھی۔ میں اس عمارت تک گیا اور پیچے مڑ کر دیکھا تو صدر دروازے میں سے کرس داخل ہو رہا تھا۔ اور اس

سے نقش ثبت ہوتا ہے۔ اور پھر دھیرے دھیرے ہوتا ہے۔ مجھے غناظ کے قفر المرا کا وہ بہج یاد آیا جس میں نے کچھ وقت گزارا تھا۔ یہاں غناظ کی نسبت مذکور زیادہ شاندار تھا۔ محل کی کمی چھٹ پر ہوا تیز تھی اور اس میں ایک خطرے سے خبردار کرنے والی گونج تھی۔ چھٹ پر بھی ایک کپا کرہ تھا جس کے پہلو میں لکڑی کی ایک منقش حراب بس یعنی گراہی چاہتی تھی۔ چھٹ سے اپر قراقرم کی چنانیں دھوپ میں تھیں گھری نیچے پوری وادی اور دریائے شیوک سائے میں آپکے تھے۔ اور جب ہم نیچے محل کے باعث میں آئے ایک ایسے باعث میں جو کچھ بے ترتیب تھا کچھ بے آیا مگر سربز تھا تو وہ بھی سائے میں تھا اور اس کی گھاس میں سے غنڈک پھوٹتی تھی اور ہمارے ہو گز میں سرایت کر کے پاؤں کو سرد کرتی تھی اور سے چشوں کا پانی رکتا۔ انکتا اور ایک خاص سُر میں بتا نیچے آرہا تھا اور اسے مختلف نالیوں کے ذریعے پورے باعث میں پھیلا دیا گیا تھا۔ یوں یہ ایک چھوٹا سا شایار تھا جو قراقرم کے پھولوں اور منکار میں بسا ہوا تھا۔ یہاں خاص طور پر گاب بست ہوا اور اتنا زیادہ تھا کہ پودے دو ہرے ہو رہے تھے اور چھانوں کے سائے میں اس کا رنگ بست شوخ اور گمراہ تھا۔ اور ایک جانب چیزی کے دو شاندار درخت کھڑے تھے اور جیسے ہوتی تھی کہ اتنے بڑے درخت کا محل اتنا چھوٹا اور منی اپنے کیوں ہے۔

اس باعث میں بھی ان خلنوں کی تھائی اور اداہی تھی۔ یہ آپ کو خوبصورتی کے اس رخ سے آشنا کرتا تھا جس رخ کا انجام فتا ہے۔ فتا توہر شے کو ہے لیکن اس باعث کو دیکھنے تو گلا بے کر ابھی یہ آخری لمحہ ہے۔ آخری لمحہ ہے اور پھر فا بلند قراقرم سے جھاکے گی، اترے گی اور اسے اپنی لپٹ میں لے کر دنیا سے او جبل کر دے گی۔ یا پھر یہ فتا میرے اندر تھی اور اب قریب آرہی تھی ورنہ اس باعث کے صن کو تو دوام تھا۔ فتا میرے اندر تھی۔ یہاں ایک اور احساس بھی جی کو علک کرنے والا تھا کہ قراقرم کی چھانوں میں اس بے ترتیب گھنٹن کی گھنٹی غنڈک اور پانی کی سرسرابہت میں اور اس کے بے محل بولنوں میں اور چیزی کے درختوں کے بیانوں کی ماں کوئی اور بھی ہو۔ کوئی اور جو حسن کی آزردگی میں شریک ہو، وہ ان چتوں بولنوں کی ماں نہ بے شک چپ رہے، پر شریک ہو۔ صرف شرکت سے اس کی آزردگی ختم ہو سکتی ہے ورنہ کسی اداہی اور فتا کی قربت کی کیفیت۔

میں اس باعث سے لکھا تو میرے دل میں ایسا ممال تھا جو دنیا چھوڑنے پر دل میں

جمحوکا نما کھڑکی وادی چلو کی وسعت پر کھلتی تھی۔ ایک ملازم کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا تحال تھا اور وہ کمرے میں داخل ہوا اور اس تحال کو ہمارے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس میں سرخ چکتی ہوئی سیب نما جیزی کا ڈھیر تھا۔

"ہمارے دادا جان چیزی کے تین پوچھے سریجنگر سے لائے تھے۔ یہ ان کا پھل ہے جو ہم اپنے خاص مسامنوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں" راج صاحب نے چیزی کا ایک کچھ اخفاک میری چھلی ہوئی ہٹھلی پر رکھ دیا۔ چیزوں کو دیکھ کر ظہای صاحب بھی ہوشیار ہو گئے۔ کرس کو یقین نہیں کیں کہیں کسی میز پر اتنی زیادہ چیزی بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہم اگرچہ بڑی ممتاز اور داشمندی سے محظوظ کرتے جا رہے تھے لیکن ہماری آنکھوں میں نمیدے پھوجوں والی چمک تھی اور ہم چیزوں کے تحال پر ہمہ وقت نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد چائے آئی اور منوق آیا۔ یہ بھی مقامی خوراک تھی اور بے حد لذیغ تھی۔ میں راج صاحب سے ان کے خاندان اور وادی چلو کے پارے میں پوچھتا رہا۔" لیکن آپ کی آنکھیں نسلی کیوں ہیں؟"

"یہ میری والدہ کی جانب سے ہیں" وہ مسکرائے۔ اس دوران ان کے چھوٹے بھائی محبوب علی خان بھی آگئے اور وہ ہمیں محل دکھانے کے لیے لے گئے۔ نہدوش یہڑھیاں سے شمار کرے۔ کمی چھتیں۔ یہاں درمیان میں خراج کے طور پر وصول شدہ گندم کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ پلے بست عرصہ پھٹر یہ محل اور ان بلندیوں پر ہوتا تھا اور پھر اسی نقشے کے مطابق اسے یہاں تعمیر کیا گیا۔ اور وہاں بلندی پر کچھ آثار تھے جو دکھائی دیتے تھے۔ چند دیواریں۔ قلمہ نما بہج۔۔۔ اس بلندی سے آس پاس کا مظفر کتنا عظیم الشان ہو گا۔ محل کے مختلف کمروں میں حراب نما کھڑکیاں تھیں جو وادی چلو اور محل کے باعث پر کھلتی تھیں اور ان کھڑکیوں میں کیا شاندار جلال کے منظر قصور ہو چکے تھے، آپ دیکھتے رہئے اور پھر بھی بے یقین ساتھ نہ چھوڑ۔ قراقرم کا رعب اور شیوک کا بہاؤ اور ان کے اپر دور تک چوڑیاں، نسلی اور برف سے ڈھکی ہوئی۔

میں ایک ایسے ہی کمرے کی لکڑی کے فرش پر دیر نک لیتا رہا جب کہ میرے ساتھی محل کے کسی اور حصے میں جو ملکوں تھے اور وہاں سے جو مظفر دکھائی دیتے تھے جو تصویریں سامنے تھیں، محابوں کی گولائی میں اور بالکل کوئی کی جالی میں اٹھیں میں دیکھتا رہا۔ اس کیسرے کی طرح میرا لیز کھلا رہا جس کے اندر ایک الکی قلم ہے جس پر دیر

اور رعایا نے انہی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ ان کے بعد میر شمس الدین محمد عراقی بت سنک آئے۔ مسجد پنچن پر انہی کے نام درج ہیں۔ بختستان کے مشور بزرگ میر عمار اخیار اشیس کی اولاد میں سے تھے۔ وادی چپلو میں بھی بہت سے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اس خطے کو علم وہنر سے آراست کیا۔ ان میں میر محمد فور بخش سرفراست ہیں وہ ایک بلند پایہ ادب اور شاعر تھے اور ان کی لکھی ہوئی قرآن پاک کی تفسیر کا قلمی نسخہ کا نمیہ لاہوری نسخہ میں موجود ہے۔

میر عمار ایک بلند پایہ شاعر اور ادب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فلسفی بھی تھے۔ انہوں نے اسلامی فقہ پر ایک کتاب تحریر کی اور دیوان عماریہ کے نام سے ان کا شعری مجموعہ بھی موجود ہے۔ وہ ایک فکار بھی تھے اور بختستان کی کمی عظیم اشان خانقاہیں ان کی تغیر کر دے ہیں۔

خانقاہ کے راستے میں حجر سید عمار اور ان کے بیٹے کے مزار ہیں جو بے حد خداحت میں ہیں۔ ان کے چوبی دروازے اور جالیاں کلے آہان تھے پڑے ختم ہو رہے ہیں۔ ان مزاروں پر مختلف رنگوں کے پرچم لہر رہے تھے۔ کیرس کی معروف خانقاہ یہاں سے قریب ہی تھی اور یہ خانقاہ بے حد شاندار اور عظیم تھی۔ اس کا اندر درون لکڑی کے ائمہ اونچے ستونوں پر قائم ہے کہ وہاں تک نکاہ دیر سے جاتی ہے۔ خانقاہ کے ایک جانب انکاف کے لیے کوٹھریاں ہیں جہاں خواتین پڑھتی ہیں۔ یہاں پر دو منبر تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس مسجد میں شیعہ اور سنی مسک کے لوگ اکٹھے نماز پڑھتے ہیں۔ بختستان کے لوگوں میں مذہبی رواداری، اخلاقیات کا ایک حصہ ہے۔ کیرس کی یہ خانقاہ ہمارا عظیم دراثت ہے اور اس کی دیکھ بھال مناسب طریقے سے ہونی چاہئے۔

دھوپ تیز تھی لیکن تمام سائے بے حد سرد تھے۔
ایک مقام پر ویگن دریا کے ریتے پاٹ پر چلتے گئی۔ رست کے ایک سمندر میں رست اڑاتے۔ ایک بادبائی بکھشی کی طرح اس سمندر کو چھوڑتے۔
دن کے دو بجے تھے جب ہم سکردو کے بازار میں داخل ہوئے۔

ہوتا ہو گا۔ چپلو کے بازار کی دکانیں بند ہو چکی تھیں جب ہم محل سے نیچے آئے۔ اگلی صبح میں ذرا سوریہ سے بیدار ہوا اور پہنچے سے باہر نکل گیا۔ رست ہاؤس سے نیچے سور مو جانے والی سڑک دریا کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس کے اوپر چنانیں معلق تھیں اور اسی لیے یہاں ابھی نہ تاریکی تھی۔ ایک صاف پانی کے تالاب کی = میں بڑے بڑے پتھر کھاتی دیتے تھے اور وہاں طرف کسی باغ میں ببل بولے چلی جاتی تھی۔ یہاں امام کلینک تھا جہاں ایک معروف غیر ملکی ڈاکٹر اپنی مملکی پریکش پھوڑ کر ہر برس دو ماہ کے لیے آتا تھا اور اہل چپلو کے زخموں پر مردم رکھتا تھا اور اس کے بیاروں کو شفا دیتا تھا۔ میں ذرا آگے گیا تو بوڑھا ملاج ایک مکینے کو منہ لگائے اس میں ہوا بھرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا چڑھہ لال گلال ہو رہا تھا۔ مکینوں کی کشتی رست پر پڑی تھی۔ جہاں چٹان کا سالیہ ختم ہوا اور میں صبح کی دھوپ میں آیا وہاں سے میں واپس لوٹ آیا۔

سکردو واپسی کے لئے ہم اسی ویگن میں سوار تھے جو ہمیں چپلو لائی تھی۔ اور اب خواجہ صاحب کی ہدایت کے مطابق ذرا سوریہ میں دریا پار کے راستے سے واپس لے جا رہا تھا تاکہ ہم مختلف علاقوں کو دیکھ سکیں۔ دوسری جانب جانے کے لیے ہم نے کمرک کے پل کو عبور کیا جہاں ”ہوشے ۲۵ کلومیٹر“ کا سینگ آوریاں تھا۔ ہوشے وہ معروف گاؤں ہے جس پر شیرم کی چوٹی جھلی ہوئی ہے اور یہ میں یک پکے طور پر جانا جاتا ہے۔ کمرک کا پل ہماری ویگن کے بوجھ سے جھوٹا تھا۔

یہ راست بھی انتہائی خوبصورت تھا۔ راستے میں جو گاؤں پڑتے تھے وہاں کٹائی ہو رہی تھی اور مرو، سورتیں، نیچے کھیتوں میں اپنے جانوروں کے ساتھ تھے ہوئے تھے۔ ہاں اس مشقت کے دوران بھی وہ کاؤں میں پھول ضرور لگاتے تھے اور ان کے کچھ گھروں کی چھتوں پر پھولوں کے گلے بھی بجے تھے۔ دوپہر کو ہم کیرس ہنچ گئے۔

سجادیہ ہوٹل میں زرچون کھانے کے بعد ہم کیرس کی مشور خانقاہ ویگنے کے لیے گاؤں کے اندر گئے۔ وادی چپلو کے قدیم باشندے بدھ مت کے پیروکار تھے۔ ۷۸۶ میں سید علی ہدائی شیری سے دعوت اسلام کے لیے بختستان آئے اور چپلو کے راجہ

پہنچتے ہوئے پہنچے اور وہاں ایک سینٹل ایشن طرز کا پانچھہ ہمارا ختر تھا اور اس میں تبت کے جنگلی پھول اور سلااد ساتھ ساتھ تھے تو نکای صاحب کرنے لگے۔ ”مجھے بالکل بھوک ہے۔“

جب ان کا سائنس بھال ہوا تو کرنے لگے ”اندازہ کرو۔“

میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا ”کیا اندازہ کریں؟“

”یہ جو کاظمی صاحب نے ماڈٹ اول پس پر گمراہا لیا ہے۔“ میں نے کہا ”بادشاہو ادھر مہمان شuhan تو کم ہی آتے ہوں گے۔“

”تو کیا آپ اب کھرفوجھے دیکنا پسند کریں گے؟“ کاظمی نے پوچھا۔

”دیکھے تو لیا ہے یارا۔ یہ سامنے جو نظر آ رہا ہے۔ پھاڑی پر۔“ نکای صاحب نے اپنے آسودہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک گرا سائنس لیا۔

”نکای صاحب۔ کسی اگریز نے لکھا ہے کہ اس قلعے کی چوٹی سے دنیا کا بھرمن منظر دکھائی دیتا ہے۔“

”کس اگریز نے لکھا ہے؟ ذرا حوالہ تو دو۔“

”کسی نہ کسی اگریز نے تو لکھا ہی ہو گا نکای صاحب۔“ میں نے جھینپتے ہوئے کہا ”بمرحال قلعہ دیکھنا ضرور ہے۔“

جتنی دیر میں اور جتنی مشقت سے ہم کاظمی کے مکان سے اتر کر پہنچے بازار میں آئے، پھر گراڈ کے قریب سے گزر کر اس مقام پر آئے جماں سے قلعے کا راست دکھائی دیتا تھا، اتنی دیر میں ہم خلاص ہو پہنچے تھے۔ کاظمی کے کادر سے پر ایک قلاسک تھی۔

”قلعے تک جانے کے لیے پانی بہت ضروری ہے۔ چھالی اتنی شدید ہے اور سورج اتنا تیز کہ انسان خلک ہو جاتا ہے۔ کچھ واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ پانی کے بغیر۔۔۔“

”ہوئے ہیں تاں واقعات۔۔۔“ نکای صاحب فوری طور پر فکر مند ہو گئے ”اوپر ہے کیا کاظمی صاحب؟“

”اوپر کھرفوجھے ہے جسے تقریباً تمہیں صدی میں مقیون بونا نے تعمیر کیا تھا۔“

”تو بادشاہو ہم کو نہ کہتے ہیں کہ نہیں تعمیر کروایا تھا۔۔۔“ میں لیکن ہے پورا پورا اور جسے لیکن نہیں وہ بے شک اوپر جا کر دیکھ لے، کیون بھی مطیع؟“

”بالکل جناب۔۔۔ مجھے تو دیے بھی تھوڑی بہت شوگر ہے اور آج صحیح چلو سے روائی کے وقت جلدی میں یہکہ بھی نہیں لگا سکا اس لیے۔۔۔ آپ ہو آؤ تارو“

”جمیل کپورا سے راکا پوشی تک“

”وہ۔۔۔ اس چیل پھاڑ کی چوٹی پر کھرفوجھے ہے۔“

”کھرفوجھے؟“

”ہاں اس کے معنی عظیم قلتے ہیں۔“

تیز دھوپ میں ایک ایسا پھیلاؤ جو پھیلتا چلا جاتا ہے اور ایک ایسی وسعت جو ہر لمبے وسیع تر ہوتی چلتی ہے اور اس وادی میں وہ چیل پھاڑ جس کی سلیشی چٹانوں کے اوپر دیوار چمن سے مشابہ ایک قلعے کی دیوار بلندی سے خوفزدہ ان سلیشی چٹانوں کے ساتھ چمنی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔۔۔ میں اس سے نبھا کم بلندی پر ایک سینٹل ایشن بانیپی کی کچی دیوار سے نیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا اور میں بھی دھوپ میں تھا۔

ورمیان میں کہیں پہنچے سکردو کا بازار سنان پڑا تھا۔ ہم ابھی ابھی کاظمی کی اس بلند اور دھوپ میں پہنچی اور سامنے میں ٹھہر تی آجائگا، میں دوپر کا کھانا کھا کر قارغ ہوئے تھے۔ ہم نے چونکہ خصوصی بھتی سوب ”بائے“ پا تھا اور اخروت سے بنا ہوا منڈار پر اپو کھایا تھا اس نے ہماری روٹیں بت بلند حصیں یعنی ہم بائی پرس میں تھے۔ آج دوپر جب ہم وادی چلو سے سکردو بازار میں پہنچے تھے تو کاظمی چندی کرافٹ کی ایک دوکان پر ہمارا انتشار کر رہے تھے۔ اس چندی کرافٹ شاپ پر ہم نے صماتا بدھ کے چند سرو دیکھے جو میڈی ان نیکلا تھے۔۔۔ اور دوکان دوار کا کھانا کھا کر وہ پرانے ہیں اور سکردو کے کسی گھنڈر میں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ دوپر کا کھانا کاظمی کے ہاں تھا اور ان کے ہاں بہت سارے دوست تھے جو ہمیں ملنے آئے تھے۔ پہنچے سکردو بازار میں نکای صاحب نے کھانا کرے اسیں تو بالکل بھوک نہیں ہے لیکن جب ہم باقاعدہ کوہ پیائی کر کے کاظمی صاحب کی رہائش گاہ

صاحب"

میں نے مراد صاحب کی جانب نگاہ کی تو وہ نھوڑی کو مسلسل سمجھائے چلے جاتے تھے، کہنے لگے "میں بہت دفعہ دیکھ چکا ہوں آپ دیکھ آئیں" اور جب کاظمی میرے آگے دھوپ میں ہتھی چھان میں چھتے، بلد ہوتے پتھریلے راستے پر چلتا تھا۔ اور میں اس کے پیچے اور بہت پیچے من کھولے پیشے میں شرابور ہوا اور زندگی سے خالی جسم کے ساتھ اپنے پتھریاں بمشکل اٹھاتا تھا۔ تب میں نے جانا کہ نھایی، مطیع اور مراد مجھ سے یا نے لکھتے اور کاظمی نے میرے ساتھ ایک تاریخی فریب کیا تھا، مجھے یقین تھا کہ میں قلعے سک زندہ نہیں پہنچ سکتا۔ کاظمی مجھے ہر موڑ پر پانی پلا رکھتا اور پھر میری حالت زار بلکہ حالت زار زار کا اندازہ کے بغیر قلعے کی تاریخ دہراتے لگتا۔

"تو جتاب متین بوخا اسے ہنانے والا تھا اور اس کے اندر سک مرمر کا استعمال ہمارے عظیم بیرو علی شیر خان انہن نے کرایا"

"پانی-----"

"جس راستے پر ہم چل رہے ہیں تاریخ صاحب اسے انہن کی محل ملکہ گل خاتون نے بنوایا تھا"

"پانی-----"

"اور تاریخ صاحب اس کے پیچے جمال سے ہم چلے تھے وہاں بھی ایک محل تھا جسے اسی گل خاتون نے بنوایا تھا اور اس کے نام کی ممتازت سے وہ محل میمندوتن کھر یعنی پھول محل کہلاتا تھا۔"

"پانی-----"

"تاریخ صاحب پانی بھی یو اور تاریخ بھی سنو۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ کھوفتھے۔ یعنی عظیم قلعہ عالم میں اختیاب تھا اس کے بعد میں ایک پانچ منزلہ محل تھا، جسے یقین تھا کہ اگر میں اس وقت شدید کمزوری اور بیساک کے باعث انتقال کر مجھے پہنچتے۔ اسی ڈرگہ فوج نے جلا کر راکھ کر دیا۔ اور....."

جاتا تو کاظمی مجھ پر جھک کر کھلتا۔۔۔ پڑے افسوس کی بات ہے تاریخ صاحب آپ کو سکردو کی تاریخ میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔۔۔ دیے جاتے جاتے انہن کی محلہ گل خاتون کا ایک قصہ تو سن لیں۔۔۔

سکردو بہت پیچے رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ، وہ تمام آوازیں جو نہیں کے ساتھ

متعلق ہوتی ہیں اور یہاں صرف ہوا تھی اور تیز دھوپ تھی۔۔۔ اور اس لمحے مجھے پتھریلی فیصل میں ایک محضی دروازہ من کھولے نظر آیا۔۔۔ ہم قلعے کی چھت پر پہنچ گئے۔۔۔ میں کئی دیوار کے سامنے میں بہت دیر تک بیٹھا ہو گکھا رہا اور پھر ہوا نے پیسے کو شنڈک دی اور میں بہتر محسوس کرنے لگا۔۔۔ میں نے کھڑے ہو کر آس پاس نگاہی تو میری ناگلوں میں کپکاہٹتی ہوئی ویسی کپکاہٹت ہو کسی بلند چونی پر کھڑے ہونے کی کوشش سے ہوتی ہے یا کسی بلند منی پر چڑھ کر بدن کو سیدھا کرنے سے ہوتی ہے۔ چاروں جانب ناقابلِ لیفین منا عکر تھے۔۔۔

ایک وسیع ریگزار کے درمیان میں دریائے سندھ کی گز رگاہ اور پس مظہر میں وہ پہاڑی سلسلے جہاں وادی شتر تھی۔

ہم اس سلسلے پر تھے جس سلسلے پر وادی سکردو کے پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں۔

قلعہ تو ایک کھنڈر تھا۔ ایک مسجد کے آثار۔ چند کمرے اور حنافی فیصل۔۔۔ لیکن اس کے علاوہ یہاں وہ کچھ تھا جو اور کہیں نہیں تھا، ایک مکمل تھائی تھی۔۔۔ سرسراتی ہوا میں اس بلندی پر ایک الگ دنیا تھی جس میں مکمل خاموشی تھی اور ایک وسیع لینڈ سکپ تھی۔۔۔ پیچے جہاں ہم نے پہلی شب برکی تھی، اس کے نواح میں ایک بیل کا پہنچ بلند ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ اور وہ بمشکل نظر آتا تھا۔

قلعہ کی اس دیوار پر جس کے پیچے رہتے چٹائیں اور سندھ کم از کم ایک کلو میٹر کی عوادی گمراہی میں تھے وہاں اس دیوار پر ایک سیاح نیک لگائے بیٹھا تھا۔۔۔ پا نہیں کب سے بیٹھا تھا اور اس نے مجھے ہاتا کہ یہ اس قلعے کی دیوار سے یہ مظہر جو نظر آتا ہے یہ دنیا بھر میں میرا دوسرا پسندیدہ ترین مظہر ہے۔۔۔ جب میں نے پوچھا کہ پسلا کونا ہے تو کہنے لگا۔۔۔ بس یہ دوسرا ہے پسلا میں نہیں ہتا سکتا۔۔۔ پا نہیں کیا چیز تھی، ہم اس کے حال پر چھوڑ کر آگے چلے گئے۔

سکردو کی جانب ہر ہادل تھی اور وہ برف پوش پہاڑتے جن میں ایک راستہ دیوالی میدان کو جاتا تھا۔۔۔ میرا دل اس میدان کے لیے شاید ایک لمحے کے لئے رکا۔۔۔ صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ تمہاری بر قیں کب سمجھیں گی؟ وادی پہلو سے واپسی پر مراد اسٹاپ سے پسلا سوال میں نے دیوالی میں کہا تھا کہ ابھی چند روز اور مری جان تازہ ترین صورت حال کیا ہے؟ اور انہوں نے کہا تھا کہ ابھی چند روز اور مری جان ابھی چند روز اور۔۔۔ اور میں چند روز اور سھر نہیں سکتا تھا۔۔۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ہم اگلے روز یہاں سے گلگت جائیں گے اور وہاں پہنچ کر جی ایم بیگ سے مشورہ

پوری طرح یہنے آئی ہے۔ اس بازار میں ایک اٹمینان ایسا تھا جس نے بھے بست کو رہا۔ بکلی بند تھی اس لیے دو کانڈاروں نے لائیٹس روشن کر کے چوکشوں سے لٹکار کی تھیں۔ ہمارے چہرے نہم تاریکی میں تھے اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بولنے کی بجائے ایک دوسرے کو سن کر بولتے تھے، ہمیں منہ زور ٹڑک سے بچنے کے لیے صرف ایک پار تردد کرتا ہوا جب ایک بوڑھا باتی اپنے گھستے کو فل پیٹھ سے ہاتھا ہوا ہمارے قریب سے گزرا گیا۔ پاکستان اس لحاظ سے بھی متعدد ہے کہ یہاں جرم نہ ہونے کے برابر ہے، قتل ڈاکے اور پوری سے خالی یا سرزنش انہیں ان سوالات کا ملاؤ ہے۔ تو پھر سوچ لازمی کیا ہے؟

کافی میرے ساتھیوں کو قلعے تک جاتے ہوئے میری حالت زار زار کے بارے میں بتا چکا تھا اور نظایی صاحب چک رہے تھے۔ ”ہاں جی تارڑ صاحب پھر کیا دیکھا اس قلعے میں۔ کچھ ہمیں بھی تو ہتاڑ پھر دیکھنے کے تھے؟“

”پاکل دیکھنے کیا تھا اور وہاں سے دنیا کا دوسرا بہترن نظارہ دکھائی دتا ہے۔“

”اس نظارے نے کہیں جانا تو نہیں ہے تاں ابھی؟ تو پھر دیکھ لیں گے“ نظایی صاحب سکرائے۔

”آپ کیا کرتے رہے اس دوران؟“

”ہم؟.....“ نظایی صاحب نے کھل آسودگی سے اپنے دلوں پاٹوں پر نہدوں کی طرح پھر پھرایے ”ہم باشا ہو ادھر خواجہ صاحب کے کانج جا کر ایک تاری لگا آئے۔۔۔ مٹی نے ہمیں مراثن میں حص لینے والے چند گورے گھر لئے اور ان کے ہاتھ دیکھ ڈالے۔۔۔ کرس بازار میں بیٹھا وحوب سیکھتا رہا۔“

”ہمیں مراثن؟ میں چوک گیا۔“ یار وہ تو کل ہے اور کل مجھ ہم ٹگلت جا رہے ہیں۔۔۔“

”اور خواجہ صاحب نے بکل بھی کروادی ہے ہماری۔۔۔“ نظایی صاحب نے فوراً کہا۔

”نظایی صاحب۔۔۔ ہمیں مراثن میں حص لینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ موقع پھر بھی نہیں آئے گا۔“

”باشا ہو یہ ذرا اپر قلعے تک تو جا نہیں سکتے آپ، ہمیں مراثن میں حصے کر کیوں ہماری اور ملک کی بد ناتی کراؤ گے۔ دس قدم کے بعد آپ جتاب اور اس جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا جس کی زبان ہد وقت باہر ٹھیک رہتی ہے۔“

کیا جائے گا کہ اے مردانا ہم تم سافر کس وادی کو جائیں، کس اپنی مقام کے لیے سفر اختیار کریں کہ ہماری بے جنین روحوں کو سکون ملے۔۔۔ تو ہم اگلی صبح ٹگلت جا رہے تھے۔

ہم قلعے سے اترے۔ اور اب میرے دل میں کافی کے لیے صرف محبت کے چند باتیں تھے کہ اس کی وجہ سے میں نے وادی سکردو کا ایک ناقابل بیان منکرد بخال۔ ہم قلعے سے اترے تو شام ہو ری تھی۔۔۔ اور ایک شام سکردو کی میوں میں لاہوری میں ہمارے اعزاز میں تھی۔۔۔ لاہوری ایک کمرے پر مشتمل تھی اور مکالے کی میز کے ارد گرد مقامی شامر، ادیب اور دانشور تھے۔ ہم کچھ شرمند تھے کہ پاکستان کے ایک اہم علاقے کے بارے میں ہم بہت کم جانتے تھے۔۔۔ لیکن اس شام ہم نے اہل سکردو سے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ جانتا۔

ہم نے پہلی بار پاکستان کے ہبودھ علی شیر خان انہن کے بارے میں جانتا۔

اپنے کی رسائی مغل وریار عکس اس وقت ہوئی جب اکبر نے ۱۵۸۶ء میں کشیر قلعہ کیا۔ مغل تاریخ دانوں نے اپنے کا ذکر علی رائے کے نام سے کیا ہے۔ اپنے نے ایک مغل شزادی کے ساتھ شادی کی جو کہ گل خاتون تھی۔ بھی عوام نے اس مغل شزادی کو میندوں گیالمو کا خطاب دیا۔ علی شیر خان نے نہ صرف یہ کہ ایک مغل شزادی سے شادی کی بلکہ اس نے اپنی ایک بھی شزادہ سلیم سے بیاہ دی۔ گل خاتون سکردو آئی تو اپنے ہمراہ مویستار، بھیشیر، ملاج اور دیگر ہنرمند لے کر آئی۔ جن زمانوں میں اپنے اپنی سلطنت کی توسعہ کے لئے تقریباً چار برس کے لیے سکردو سے باہر رہا، ان زمانوں میں گل خاتون نے مغل شادت اور طرز تعمیر کو فروغ دیا اور میندوں کھر، ہلال باغ، چار باغ اور گنگوپی تعمیر کروائے اور۔۔۔ وہ راستہ جس پر چل کر ہم قلعے تک پہنچتے تھے۔

”ہمیں بتایا گی کہ بھی ادب کی ایک قدم اور تو اما روایت ہے۔ بھی زبان پلے جتنی سکرپٹ میں لکھی جاتی تھی لیکن مذہبی تجھ نظری نے اسے کانٹے سے سینوں میں خصل کر دیا۔ قدم لوک ادب کی بتیا و تاریخی اور روایتوی و استانیں ہیں۔ پاکستان میں اسلام ایرانی مبلغین کی کوششوں سے پھیلا۔۔۔ ہم لاہوری سے باہر آئے تو شام“ رات میں جاتی تھی۔ اور رات دھیرے دھیرے اس چھوٹے سے بازار میں اتری تھی جس میں ہم چل قدمی کر رہے تھے۔۔۔ سکردو میں ابھی دو منزلہ عمارتیں ذرا کم ہیں اور بازار کلے اور ایک منزلہ ہیں۔ یوں آسمان زیادہ نظر آتا ہے اور اسی لے رات بھی

کی غرض سے سکردو آئے ہوئے تھے اور اب اس لمحے کشیر ان کے نیرس پر بیٹھے ہوئے سالن کے ڈوگے سامنے رکھے ان روشنوں کا انتظار کر رہے تھے جو دیگر کسی قریبی تور سے لینے کیا ہوا تھا اور چھپلے پدرہ منٹ سے لینے کیا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک لیڈر ٹاپ تھا۔ وہ کہنے لگا ”دیکھو یہ تارڑ صاحب۔ ان بخوبیوں نے کیا خانہ خراب ہوئی بنا لیا ہے۔ چھپلے آئے گئے سے سالن رکھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔“

”اوے یار صدر صاحب۔۔۔ ان میں کسی نے اسے کہا اور پھر میری جانب ناطب ہوا۔ ”یہ جی ہمارا صدر ہے جو نہیں کا۔ اس خانہ تک نے کہا تھا کہ سکردو چلو وہاں پہاڑی بکرے کھانے کو ملیں گے۔ لوگی یہاں چکنچھی ہم نے ان لوگوں سے پوچھا کہ پہاڑی بکرے ہیں؟ یہ کہنے لگے کہ پاکل ہیں۔۔۔ ہم نے پوچھا کہاں ہیں؟ کہنے لگے پہاڑوں پر۔۔۔۔۔“

”آپ کا کس سمجھے سے تعقیل ہے؟“

اندھیرے میں ”وہ سب ہے اور پھر کسی نے کہا ”حکمہ ڈیکوریشن سے۔۔۔۔۔“

لیڈر ٹاپ کی آواز آئی ”جتاب کچپت روڑ نہیں ہے لاہور میں؟ کافنڈ کی مارکیٹ ہے جہاں پر۔ تو وہاں ہماری دو کافنیں ہیں ڈیکوریشن کی۔۔۔ کاروں کو اور پارٹیوں میں سجائے کے لیے جو چکلیے کافنڈ بنا دی پھول“ اور رنگیں گندستے وغیرہ ہوتے ہیں تاں تو یہ ہمارا کاروبار ہے۔۔۔۔۔“

”یہ صدر ہے ہماری یونیٹ کا۔۔۔۔۔“ پہاڑی بکوں کے شو قیم صاحب کی آواز آئی۔ ”ہر سال ہم سب اکٹھے نلتے ہیں موچ میلہ کرنے کے لیے۔ ہر سال مری جاتے تھے۔ اور وہاں تو آپ جانتے ہیں کہ کھانے پینے کی کوئی پر ابلم نہیں۔ اس مرتبہ صدر صاحب کہنے لگے کہ سکردو چلنے ہیں۔۔۔ اور یہاں کچھ کھانے پینے کا روانج ہی نہیں، دو دن ہو گئے ہیں مونگی کی وال اور آلو شورہ کھاتے ہوئے۔۔۔۔۔“

”اوے تم کھانے کو آئے ہو یا سیر کرنے؟“ ایک اور صاحب بولے اور اپنی بار بولے ”زرا یہاں کے نثارے تو دیکھو۔ ایسے پہاڑ دیکھے ہیں کبھی۔۔۔۔۔ اوے صد پاڑہ جمل اور پھوڑا جمل کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔“

میں نے اپنیں پہلو جانے کا مشورہ دیا۔ اس دوران ان کی روشنیاں آجیں اور میری جانب ایک ”اکوچی بسم اللہ کو“ کے بعد وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ مگر واپس اندر آیا تو ہمارا کھانا بھی لگ چکا تھا۔

”نکاحی صاحب۔۔۔۔۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”اندازہ کرو“ نکاحی صاحب نے میرے کندھے کو تھکا ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ضرور حصہ لو ہائیں مرا تھن میں لیکن میں اور مطیع کل گلگت ہی جائیں گے“

چنانچہ ہائیں مرا تھن میں حصہ لینے کی آرزو میں تمام ہو گئی۔

بھج سے فارغ ہو کر نکاحی صاحب نے کرس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دا ”کرس اولاد ہوائے کیا میں نے جیسیں چار اگریز عورتوں کے بارے میں وہ لطیفہ سنایا ہے جو سنایا میں جا سکتا“

کرس فراخ دل سے ہے۔ ”یہ چار اگریز خواتین کے بارے میں ایک لطیفہ ہے یا انگ اگ کچار لٹیفے ہیں جو سنانے کے قابل نہیں ہیں۔۔۔“

”جس طرح تم پسند کرو“ نکاحی صاحب بھی ہنسنے لگے۔

”میں تو یہ پسند کوں گا کہ چار پاکستانی خواتین کے بارے میں ایک ایسا لطیفہ۔۔۔۔۔“

”آہم۔۔۔۔۔“ نکاحی صاحب زور سے کھانے اور ان کا چڑھہ سرخ ہو گیا ”خبردار یہ گورا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟“

”مذاق صرف کہنا نہیں بلکہ سننا بھی سیکھو بادشاہو۔“ میں نے ان کے کندھے پر ایک دھپ رسید کی۔

”اندازہ کرو۔ ہماری خواتین کے بارے میں لٹیفے سناتا ہے۔ باہر کا پچھہ۔۔۔۔۔“

رات کے کھانے کے لیے ہم شرم بر مسوں کے مالک پابو رضا صاحب کی جانب سے کشیر ان میں مدعا تھے۔ کشیر ان میں اندازہ کھا۔ بکلی یہاں بھی نہیں تھی۔ ویژنے ایک تیزی سے چھپلی ہوئی موم حق میز پر جمادی۔ کھانا لگنے میں کچھ دری تھی۔ میں انھوں کر نیرس پر چلا گیا۔ سکردو بازار سہنан پڑا تھا۔ بت دوڑ کوئی جیپ ڈرائیور لاتکوں کو بار بار آن ایڈن آف کرتا تھا اور ان کی روشنی میں بازار کی چند دو کافنیں اور قلعے کی پہاڑی کا کچھ حصہ تھوڑی دیر کے لیے نظر آ جاتا تھا وادی میں کہیں کہیں چراغوں کی جھلک روشنی تھی تھی۔ یہاں نیرس پر کچھ ماوس لجے میرے کانوں میں آئے اور ان مسافروں کی جانب سے آئے جو ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ غالباً لاہوری انشل تھے۔ میں نے سلام دعا کی تو وہ مجھ سے ایسے انھوں کو بظہیر ہوئے جیسے پرانی دوستی ہو۔ وہ سیرو سیاحت

ہو جاتی تھی۔ چنانوں کے اپر سے چند برف پوش چمنیاں جماحتی حصیں اور یہ سب پانی میں بھی حصیں کہ ان کا عکس شیشے پر ایسا تھا کہ دھوکہ ہوتا تھا کہ اصل اپر ہے یا پانی پر ہے۔ کرس نے تصویرِ لینے کے لئے جب کیرے کو آنکھ سے لگای تو وہ بھی ایک لئے کے لئے جمجھا کر اصل مذکور کیا ہے، اپر جمیل کے پس مذکور میں یا جمیل کے پانی پر۔ پاندھیں پر اس مذکور کو صبح کی روشنی تیزی سے پھیکا کر رہی تھی۔

ایک لوگ ایسا آیا کہ درختوں پھیلیاں اس مذکور کا ظلم توڑ کر اعلیٰ اور میں نے ب کو الگ الگ دکھا کر وہ اتنی دیر تک ہوا میں محل رہیں اور پھر یکدم گریں اور جمیل کا آئینہ برابر ہو گیا۔

ہم تبت موٹل واپس پہنچنے تو سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم نے اپنا سامان پاندھا اور ستر کے دوران پہلی بار اسے اپنے کانڈھوں پر اٹھایا۔ اٹھانا کیا تھا مطیع نے میرا رک سیک مجھے پہنچایا کہ ستر پس کو بازوؤں میں پسناہی تو جاتا ہے۔ جو شنی مطیع نے رک سیک کو چھوڑا میں اس کے پوجھ سے یقینہ بننے گیا۔ پھر دوستوں نے بظلوں میں ہاتھ دے کر بڑی مشکل سے اٹھایا اور میں بڑی مشکل سے اٹھا۔

گلگت روڈ پر ہمیں دیگن کے لئے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔
وادی سکردو میں جتنی وسعت تھی اس میں سے باہر جانے کا راست اتنا ہی تھا۔

مسلسل میں کھاتی ایک سرک اونچائی پر اور یقینے شیر دریا مندہ اور دوسرے کنارے کی چمنیں اور پہاڑی سلسلے آپ پر جھکے ہوئے۔ یہاں شاہراہ قراقرم کے شاندار منادر دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ جیسے ایک وسیع عار ہو اور اس میں ایک سرک، ایک دریا اور چمنیں ہوں۔ ترقیا چھ کھنے کے ستر کے بعد روشنی تیز ہو گئی اور ہم کھلی فضا میں آگئے۔ ایک وسیع یہذ سکپ میں دریائے مندہ بتا تھا اور سرک کے برابر میں ایک چھوٹا سا حمرا تھا اور اس سے پرے ناگا پرست نظر آ رہی تھی۔

سکردو روڈ، فرباد پل کے پار ہوئی اور شاہراہ قراقرم میں جا می۔ یوں محسوس ہوا جیسے جی ان روڈ پر آ لٹکے ہیں۔ مچھلی نشست پر مطیع ایک مقابی نوہوان سے گنگو کر رہا تھا اور اس سے وحدہ کر رہا تھا کہ گلگت جنپتی ہی وہ اپنے سامان میں سے صد پارہ گولڈ کی پوٹلی نکال کر اسے سوتا دکھائے گا۔ اس نوہوان نے مجھے ٹھاٹب کیا "جناب آپ دیواری جاتا چاہتے ہیں؟"

رات گیارہ بجے ہم سکردو سے جمیل پکورا جائے والے راستے پر سفر کرتے تھے۔ تارکی اور خاموشی میں جیپ کی روشنیاں بیٹے ہم سے باتیں کہتی تھیں، ہمیں بت پکھہ دکھاتی تھیں۔ اور ہاں سردی تھی جو ہمبوں میں اٹھ کرتی تھی۔

ہم جمیل پکورا پر واقع تبت موٹل کے عیسویوں میں رات گزارنے کے لئے آئے تھے۔

صحیح سازی سے آئھ بجے گلگت روڈ پر دیگن ہماری مخفر ہو گی۔ لیکن اس سے پہنچ ہم نے پکورا گاؤں سے پرے بالائی پکورا بھی دیکھا تھی۔

ہم دیر تک سونے کی کوشش کرتے رہے لیکن سردی بت تھی۔ جمیل کنارے سردی تو ہو گی۔

"ہمیں بختستان آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے نقایی صاحب؟"
پہاڑیں نہیں نہیں ہو گئی ہیں گھر سے لگلے "نقایی صاحب رضائی کے اندر سے کہتے تھے "سو جاڑا پاڑشاہ ہو سو جاڑا"

پکورا گاؤں کے کچے مکان ابھی خوابیدہ تھے اور ان کی دیواریں اور چھتیں شب کی سیاہی میں لگتی تھیں جب ہم پکورا نالہ پار کر کے اپر پہنچے۔ جمیل پکورا کا ہترن مذکور یہاں سے نظر آتا ہے، مخفر طاکی سرخ چھتیں ابھی واضح نہیں تھیں، البتہ پوری جمیل صحیح کی سفیدی کو چذب کر کے اپنے کناروں سے الگ ہو پچھی تھی، جیسے کسی سیاہ آئینے پر پارے کا قطرہ ساکت ہو۔ ہم تیزی سے پہنچے لگے۔ ہمیں بہر صورت اپنا سامان اٹھا کر سازی سے آئھ بجے سے پہنچا گلگت روڈ پر پہنچا تھا اور ہم اپر پکورا کو بھی بہر صورت دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے اتنی سویرے بیدار ہو کر ٹھہر تے ہوئے اپنے نیجوں سے باہر آگئے تھے۔

جمیل، گاؤں سے زیادہ قابلے پر نہیں تھی۔ درختوں اور چنانوں میں گھری ہوئی اپر پکورا ایک بڑے تلاشب کی طرح پچھلی ہوئی تھی، اس پر بہلی بہلی دھند کے آثار تھے جو تیزی سے تحلیل ہو رہی تھی۔ میں اور کرس نیچے کنارے تک جانے کے لئے آہست آہست اترنے لگے۔ یہاں بھی کنارے کے درخت اور چمنیں غیر واضح تھیں لیکن پانی شیش ہو رہے تھے اور یہ شیش صرف اس لمحے نوٹ کر جلتا تھا جب کوئی پچھلی اچھل کر باہر آتی تھی اور پھر پانی پر گر کر پانی

"دنخ کوئی" — "نکای صاحب فوراً کرنے لگے" پاندر کا پچ آگے سے جواب دتا ہے" کرس جانتا تھا کہ ہم اس کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور کوئی اچھی بات نہیں کر رہے۔ دریائے گلگت کے پار جلی ہوئی چنانوں کا سلسہ ختم ہوا اور ہر واں شروع ہو گئی۔

گلگت پنجھی و گینوں کے اوپرے سے میں نے ریاض صاحب کو فون کیا ہا کہ ہم چنار ان میں قیام کر سکیں۔ معلوم ہوا کہ سیاحوں کے ہجوم کی وجہ سے نہ صرف چنار ان اور ہنڑے ان بلکہ ہر ختم کے ان، ان دونوں آؤٹ ہے۔۔۔ البتہ رور سائٹ نورست لاج میں ایک کروٹ مل سکتا ہے۔۔۔ لاج کے نوجوان مالک اپنی ذاتی جیپ پر ہمیں و گینوں کے اوپرے پر لینے آگئے۔

یہ نورست لاج دریائے گلگت کے قریب تھا اور بقیہ شرکی نسبت قدرے خلک آب و ہوا رکھتا تھا۔ نکای صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہی خصل خانے کا رخ کیا اور تاری لگانے لگے۔ مطیع کا شوگر لیول گر رہا تھا اس لیے وہ لیٹ گیا۔ دریائے گلگت کے پاندوں کا منہ زور شور کمرے کے اندر ایک بہلی گونج کی طرح داخل ہو رہا تھا۔

میں ایک مرتبہ پھر گلگت میں تھا۔ چنانوں سے گمراہوا ایک نامہ با جزیرہ جس میں ایک نامعلوم کشش تھی۔ یہاں نامعلوم کو جانے کی کشش تھی۔ چھپے پھر ہم تینوں گلگت کے بازار میں تھے۔ اب ہمیں آئندہ سفر کی منسوبہ بندی کرنا تھی۔۔۔ اور اس کے لئے ہم گلگت کے مرد و اہم ایم یگ کی بک شاپ کی جانب روآن تھے۔ وہاں پہنچنے تو معلوم ہوا کہ بیک صاحب کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے اکرام بیک دوکان میں بر ایمان تھے۔۔۔ اکرام نے فوراً قوہ منگالیا اور میں نے فوراً اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ "ہم تینوں کو کہیں بھیج دو"۔

"کہاں بھیج دوں تارڑ صاحب" اکرام کے یتھے لکھنے و نگار پر جیرت پہنچی۔ "ہمارے پاس دس بارہ دن ہیں" میں کسی دور افتادہ قراقروی وادی میں بھیج دو جو اس دنیا سے باہر کی جگہ گئے۔

"آپ کیسے جائے ہیں؟" اکرام نے ایک نظر میرے بحدے سراپے پر ڈالی

"ہا۔۔۔" میں نے فوراً اپٹ کر چکھے دیکھا۔ "تو پھر آپ جنگلوٹ اتر جائیے وہاں سے جیپ کے ذریعے استور جائیں گے اور وہاں سے شاکر چلم چوکی کے لیے کوئی سواری مل جائے۔۔۔" "لوگی تارڑ صاحب یہ آپ کے حق پانی کا پندو بست کر رہا ہے۔۔۔ چلم چوکی۔" نکای صاحب جو اس سفر کے دوران غیر معمولی سمجھیگی اختیار کئے بیٹھے رہے تھے اب بنس کر بولے۔

"چلم چوکی؟" میں نے پوچھا۔ "میں میں چلم چوکی کا رہنے والا ہوں اور وہاں سے میں آپ کو شنوں کا بندو بست کراؤں گا اور آپ ان پر سوار ہو کر بڑی آسانی سے دوسری سالی عبور کر کے سکردو پنج جائیں گے" "بڑی آسانی سے؟"

"راتے میں دلمل تو ہو گی۔۔۔ بر ف بھی پوری طرح نہیں پکھلی۔۔۔ نہ پھنس بھی سکتے ہیں لیکن پھر بھی آپ آسانی سے دوسری جانب پلے جائیں گے۔۔۔" "کیوں نکای صاحب۔۔۔ تجویز تو اچھی ہے" "نہ! اس عمر میں آپ ہمیں نہ پر بخواہ گے" نکای صاحب چکنے لگے۔ "میں ایک مر جنم کا پروفیسر ہوں نہ پر بیشا اچھا گلوں گا؟" "نہ بھی تو یہی سوال پوچھ سکتا ہے کہ میں ایک پیچھے سے مطیع نے فقرہ پھینکا۔ "نہ بھی تو یہی سوال پوچھ سکتا ہے کہ میں ایک مر جنم کا نہ ہوں نکای صاحب کو خدا اچھا گلوں گا"

"آخر ان شو رنس الجیٹ ہو تاں۔۔۔ کتنی گھنیا حصہ مزاح ہے۔۔۔" نکای صاحب نے بڑی مشکل سے تیوری چھا کر حاشت اختیار کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے تو صرف نہ کے خیالات کی ترجیحی کی ہے۔۔۔" مطیع نے بھی بڑی حاشت سے کہا۔

"پھر بھی سی۔۔۔" میں نے اس نوجوان سے کہا "میرے ساتھی اس بارے میں سمجھیدہ نہیں۔۔۔"

"نکای صاحب آپ فی الحال کرس کو ان تمیں یا چار انگریز خواتین کے بارے میں وہ لطیفہ نائیں جو سنایا نہیں جا سکتا" مطیع پھر بولا۔

پاپیر تک جائیں گے تو اتنے ہی دن مند لگ جائیں گے آپ فیری میڈو بھی جا سکتے ہیں - ہالگا پوت کے میں یکپ کے قریب دو دن جانے میں لگیں گے ' راست سلسلے دن کا بہت خخت ہے "

"یہ پریوں والی چاگاہہ نمیک ہے جی۔ شاہک دہاں کوئی پریاں شریاں ہی مل جائیں" نکاحی صاحب نے سر ہلا کا اور میں تو ایک عرصے سے فیری میڈو کے بارے میں بڑھ رہا تھا اور اسے دیکھنے کی خواہش میں تھا۔ میرے ذہن میں فیری میڈو تک ٹریکنگ کے بارے میں جتنے سوالات تھے وہ میں نے پوچھ ڈالے۔ ہمارے پاس کس حرم کا سامان ہوتا چاہے؟ خوراک کا کیا پیدوست ہو گا؟ کوئی دو ایساں ہمراہ لے جانا ضروری ہے؟ راست کیا ہے؟ سامان اٹھانے کے لیے یورٹرز کا پیدوست کیسے ہو گا؟

"آسٹریا کے ریکرز کا ایک گروپ دو تین روز تک فیری میڈو جا رہا ہے اور میرا سفری ادارہ اس کا بندوبست کر رہا ہے۔ میں آج شام تا تو گاؤں کو پیغام رسان روانہ کر رہا ہوں۔ اسے یہ بھی کہہ دوں گا کہ ۔۔۔۔۔ کل؟ نہیں دو دن بعد دو پورٹر چیخے رائے کوٹ پل پر بیچ گے۔۔۔ آپ کے پاس سلامان کیا کیا ہے؟ اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔۔۔ آپ خوراک کا بندوبست کیجئے"

اکرام نے ایک طویل فرست ان اشیاء کی ہنا دی جن کی ضرورت فیزی میدوں کے سرزمیں بُر سکتی تھی۔

"لیکے نقای صاحب بازار میں گھوم پھر کر یہ اشیاء خرید لائیے" میں نے فرست ان کے حوالے کی اور انہوں نے اسے بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔ "چاول، دال، بیکٹ، لالیں، چینی، چائے، بھنگ دودھ..... پارشاہیو یہ گھر بیلو کام کاج مجھ سے نہیں ہوتے.... ساتھ لائے ہو تو اس حم کی ڈیوبنی بھی آپ ہی دو" انہوں نے فرست واپس کر دیا۔

ہم اٹھنے لگے تو اکرام کرنے لگا "میں کل صحیح اپنی کار پر ہنڑ کرم آباد جا رہا ہوں۔ پرسوں صحیح والیں آجائوں گا۔ آپ کامی چاہے تو میرے ساتھ چلے....."

”یکن مجھے تو فیری میڈو کے بلے تیاری کرنا ہے بلکہ خریداری کرنا ہے۔۔۔“

"وہ آپ پرسوں کر سکتے ہیں۔ پچھلے پر دو بیجے دیکھن چلاس کے لئے چلتی ہے اس پر بینچہ جائیے گا اور رائے کوٹ پل پر اتر جائیے گا۔ رات دہاں بسر کجھے اور اگلی صبح نیزی میڈد" یہ ساری گفتگو چونکہ اکرام نے صرف مجھ سے مخاطب ہو کر کی۔ اس

"میں؟" میں نے فوج میں بھرپتی ہونے کے لیے آنے والی کسی توجہوں کی طرح سینہ پھلا کر پیٹ اندر کرنے کی کوشش کی "میں بالکل فٹ ہوں۔ سو فیصد۔ سو فیصد نہ کوئی بجا رہے تو ہوں۔ کوئی تکمیل قوت نہ کرو۔ مجھے باس ارادہ تو ہے۔"

یہ پھر اس یقین پر ہوں یہ مدد و سہ نے اپنے پاس رکھ دیا۔ اسی طبقہ کے
”میں ان کو سارا دے کر لے جاؤں گا بادشاہو“ ظلای صاحب نے گردان شیر می
کر کے بیان دیا۔

"ہیں؟" اکرام کے ہاتھ سے قوئے کی پالی گرتے گرتے پہنچی "آپ بھی جائیں"۔

"کیوں میں نہیں جا سکا؟" ظالی صاحب نے زرا بے عزتی محسوس کی "پارشاہو ہم ہبھی کی پہاڑیوں میں اکثر ماڈلینزگ دغیرہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ کے نواور ناتھا سوت، غصہ، تھلے، سامنے معمولی اہات سے"

"یہ بھی جائیں گے۔" میں نے زرا جیتنے ہوئے مطبع کی جانب اشارہ کیا جس نے فردا وانت نکال دیئے کہ مجھے نہ بھول جانا۔

"میں بالکل فٹ ہوں" مطیع نے فوراً کہا "صرف یہکہ لگاتا پڑتا ہے ہر روز"
 "یہکہ یعنی اچکشن؟" اکرام کا منہ کھل گیا۔

"جی ہاں میرا شوگر لیول بہت گر جاتا ہے"
 "اور آپ تینوں ٹرینکنگ یا کوہ پیائی کے لئے گھر سے لٹکے ہیں؟" اکرام حیرت
 اور اپنے سے مسکراہٹ کی طرف آگیا۔

ہم تینوں نے اچھے بچوں کی طرح سرہلا کر کما "ہاں" اکرام سوچ میں پڑ گیا۔ ہم اس کی جانب سالانہ امتحان کا نتیجہ سننے والے طالب علوم کی طرح دیکھنے لگے جنہیں قیصیں ہوتا ہے کہ وہ اس برس بھی پاس نہیں ہو سکیں۔

”دو ریک ہیں جو آپ کے معیار پر پورے اترتے ہیں لیکن آپ تینوں کی جسمانی صحت ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔“

اکرم نے بالآخر سر اخیا "ایک تو وادی شمشال کا ٹریک ہے۔ اگر آپ صرف شمشال گاؤں تک جائیں گے تو تمنی چار دن کا راستہ ہے، دشوار ہے۔ اگر شمشال

جاتا ہے، اسے اپنے اندر جذب کر کے جدائی کے کائنے کو نکالنے کے لئے۔
میں مشکل سے بولا۔ ”تو را کا پوشی کیسی ہے؟“
یکچھے سے کوئی جواب نہ آیا۔ میرے دنوں ساختی منہ کھولے خراۓ لے رہے
تھے.....

لے نکای صاحب قدرے بے آرام ہو کر کئے گئے ”میں نے کما باڈشاہو ہمیں اکیا
چھوڑ کر ہنڑہ جا رہے ہو؟“

”آپ اس دوران گلگت و کیجے لیں نکای صاحب“
”وہ تو ہم نے دیکھے لیا ہے۔ اب زرا ہمیں بھی ہنڑہ شنڑہ کی سیر کراؤ۔ کیوں
بھی مطیع چلانا ہے اکرام صاحب کی کار پر بینٹھ کر ہنڑہ؟“
”کیوں نہیں؟“ مطیع صاحب فوراً مان گئے۔

”جی ہاں یا کل آپ حضرات بھی چلتے۔“ اکرام نے سکرا کر کمل۔
اس شام گلگت کے بازار میں محوٰت ہوئے میں نے ایک الکی بے چینی بدن میں
محوس کی جو اس سے پہنچ میرے تجربے میں نہ آئی تھی۔ میں پرسوں اپنی زندگی کے
پسلے باقاعدہ ریکی پر جا رہا تھا۔ معلوم میں سفر کر رہا تھا۔ اس سفر کے لئے مجھے زندگی
کی تمام ضرورتیں اپنے ساتھ لے جانا تھیں۔ اور ظاہر ہے دہاں خطرہ بھی تھا.....

ہنڑہ روڑ پر اکرام کی سفید سوزوکی چلی جاتی تھی اور ڈرائیور کی نشست پر، میں
براجان تھا۔ خوبصورتی اور پہاڑوں کے جلال کے منظر ہمارے ساتھ ساتھ پڑے جاتے
تھے۔

ہنڑہ روڑ شاہد پاکستان کا سب سے خوبصورت راستہ ہے۔
میں خاموشی سے بیٹھا ڈرائیور کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے را کا پوشی کا انتظار تھا.....
چچلی نشست پر نکای اور مطیع اٹھیان سے ناٹکیں پارے پیٹھے تھے۔
”اپنی آنکھیں را کا پوشی کی پسلی جملک کے لئے کھلی رکھنا کیونکہ اس سفید بر قافی
معبد کا نقابہ ایک پوری زندگی کے برابر ہے۔“ میں نے ان سے کہا۔

خوبانیدوں کے پانوں میں بچے اور خواتین درختوں سے پچل اتار کر بڑے بڑے
تھالوں میں رکھ رہے تھے۔ گلگت کی گردی رخصت ہو پچھی تھی اور ہنڑہ کی لمحہ ک بدن
کو چھوٹی تھی..... کار میں خاموش تھی۔

بھوری چنانوں کے یکچھے اور آسمان کی نیلاہت میں را کا پوشی کی سفیدی غردار
ہونے لگی۔ جیسے وہ میری مختار تھی۔ اور پھر دیسرے دیسرے اپنا آپ ظاہر کرنے لگی۔
جیسے وہ میری مختار تھی اور میں اسے اس شخص کی طرح دیکھتا رہا جس کے اندر صرف
جدائی ہوتی ہے، اور وہ اپنے محبوب چرے کو سامنے پا کر غم آنکھوں سے اسے دیکھتا چلا

میں پوری ہوا بھر کر ایک دلوز کم کا بلند ہلہلا کم کا قتنہ لگایا" ایسا قتنہ جو قلم کا دلن ہیروئن کو تن تھا کسی تالاب میں نہاتے ہوئے دیکھ کر لگتا ہے" حالانکہ ایسے موقعوں پر خاموشی زیادہ سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ ققدر سن کر نکاحی صاحب باقاعدہ پنچ سے اچھل پڑے "بادشاہو کیا ہو گیا ہے؟! بھروسات آگیا ہے؟"

"نکاحی جی ہنڑے آگیا ہے۔ آپ زندگی میں پہلی بار یہاں آئے ہو۔ ذرا باہر کل کرتے دیکھو کہ سارا جہاں اس وادی کے حسن کی تعریف کیوں کرتا ہے" "لیکن وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولے "تم یہ کسی بھوکے گلزاری کی طرح نہ کیوں رہے تھے"

"بس سیرا جی چھا لتا تھا۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔ "اٹھے بینے مطیع ارجمن انہوں نے مطیع کے کبل کو ہلاستے ہوئے کہا" یہ تارڑ صاحب کے چیخ ڈھیلے ہو گئے ہیں ستر کرتے کرتے۔ مجھے تو اب ان سے ڈر گلا ہے جمل دیکھی ہی لیں ہنڑہ شنڈہ" میں دو برس پھرخراپنے پڑے بیٹھنے کے ہمراہ پہلی مرتبہ ہنڑے آیا تھا۔ اور ہم "ہنڑے ان" کے اس چھوٹے سے کمرے میں نہرے تھے جس کے پر آمدے سے راکا پوچھی اور گھر ہائے کا مخراجیے نظر آتا ہے جیسے ایک وسیع تصویر ہو۔ کم آباد بدل چکا تھا۔ اس کی بازی دالی سڑک اب پکی ہو چکی تھی اور اس پر ایک لڑاکا موڑ سائیکل چلا رہا تھا۔ فیر مکی سیاح گشیدہ بھیڑوں کی طرح اور ہر گھوم رہے تھے۔ یہاں ہم تینوں نے کرس کی فیر موبو ڈگی کو بری طرح محسوس کیا۔ وہ گلگت ہنڈنے پر چمن جانے والی بس پر سوار ہو گیا تھا کیونکہ اس کی خلی ایک صحراء کے پار دنیا کی بلند ترین چٹلی ایورسٹ کے دامن میں تھی۔ سڑکی دوستیوں میں بھی فائدہ ہے۔ جتنی دری میں ہماری خوبیاں اختتام کو پہنچتی ہیں اور خامیاں شروع ہونے لگتی ہیں۔ تو راستے چدا ہو جاتے ہیں اور ہم صرف ایک دوسرے کے بہتر پسلو کو یاد رکھتے ہیں یہ بات صرف سفری دوستیوں کی حد تک درست ہے اس کا اطلاق سفری ساتھیوں پر میں ہوتا۔

بازار کے بعد آسمان کو الحتا ہوا وہ راست نظر آیا جو پلو گراڈنڈ سے ہوتا ہوا، ہنڑے کے ڈر انگر روم اور پن چکی کے قریب سے گزر کر قدم قلعے کی بلندی تک جا رہا تھا۔

"بادشاہو اس وقت کیا کرنا ہے قلعہ دیکھ کر" نکاحی صاحب ایک دیوار کا سارا

"وادی ہنڑہ کا چراغاں"

"راکا پوچھی ان" کے کمرے میں بھی باہر کی شام تھی۔ کرم آباد ہنڈنے کے بعد کھانا تادول کیا گیا اور پھر فوری طور پر نکاحی صاحب نے فیصل دے دیا کہ "بادشاہو اب آرام کرو کیا بھاگ دوڑ لگا رکھی ہے کہ ابھی کچورا چلو اٹھ کر اور دہاں سے گلگت اور دہاں سے ہنڑہ تو اب ذرا رست ہو جائے" تو اب ذرا رست ہو رہا تھا اور دوتوں حضرات کمبل اوڑھے نیزد میں گم تھے۔ اس سے پہلے تھوڑی سی بد مرگی بھی ہو چکی تھی جب راکا پوچھی نظر آئے پر میں نے بیچھے دیکھا تو دونوں صاحبان خراۓ لے رہے تھے۔

"عجیب کور نوقی ہے کہ راکا پوچھی جیسی شاندار برف پوش چٹلی گزرتی جا رہی ہے اور آپ لوگ خراۓ لے رہے ہیں" میں نے گرم ہو کر کہا تھا۔

اس پر نکاحی صاحب نے ایک آنکھ کھول کر کہا تھا "گزرتی کماں جا رہی ہے یہ سامنے تو دیکھ رہے ہیں۔ نیک پانچ منٹ پسلے نہ دیکھی اب دیکھ لی آپ دنیا کو اپنی نظر سے ہمیں کیوں دکھانے پر مصروف ہیں؟"

ان کا کہنا شاید درست تھا۔ اور مطیع کا کہنا تھا کہ ضروری تو نیز راکا پوچھی نیز خراب کر کے دیکھی جائے۔ اسے واپسی پر بھی تو دیکھا جا سکتا تھا، یہی والی راکا پوچھی رہے گی بدل تو نیز جائے گی۔

اگرام ہمیں ہوٹل میں چھوڑتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ اگلی صبح سازی سے آنکھ بیکھنے گلگت والیں چلے جائیں گے۔ بارہ بجے کے قریب گلگت۔ پھر فیری میڈو کے لیے خریداری اور دو بجے چلاس جانے والی ویکن پر اس میں کے تینوں غیر چنانچہ ہنڑے دیکھنے کے لیے بس یہی ایک شام تھی میں نے باختہ روم میں جا کر اپنے آپ کو ہنڑے کے بر فیلے پانی سے رو تازہ اور نبستہ کیا اور کمرے میں والیں اگر اپنے پھیپھڑوں

لے کر کھڑے ہو گئے۔

"رات ہونے کو ہے۔ اندر ہرے میں کیا نظر آئے گا..... رہنے دو"

"میں تو برس پلے بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اسے دیکھا نہیں تھا۔"

"نہ تو آپ نے دو برس پلے بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اسے دیکھا نہیں تھا؟"

"دیکھا تھا۔"

"تو پھر دوبارہ کیا کرنا ہے دیکھ کر؟"

میں نے اس کا ہواب دعا مناب نہ سمجھا، یا شاید میرے پاس اس کا کوئی مناب جواز نہیں تھا۔ میں اگر کم آباد میں تھا تو مجھے بسر طور قلعے نکل تو جانا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ میں نے راستے پر چڑھا شروع کر دیا۔

"پادشاہو اب بھی واپس آ جاؤ۔ ابھی ہونکنے لگو گے زبان نکال کر۔" یہ نقائی صاحب کی آواز تھی۔

"ہم ہوئی چلتے ہیں۔" یہ مطیع کی آواز تھی۔

اور واقعی میرا سانس پھولنے لگا۔ اور میں غفرانہ ہونے لگا۔ آج کے لیے نہیں بلکہ پرسوں کے لیے جب مجھے فیری میڈو کے سفر کے لیے ایک دشوار پہاڑی سلسلے پر پیدل چلتا تھا۔ کرم آباد آج رات کچھ مخفی سالگ رہا تھا۔ جیسے کوئی پر سرست تماوار ہو اور وہ اندر مکانوں اور والائوں میں پوشیدہ ہو لیکن اس کی خوشی اہل کر کے پتھریلی گھیوں میں بھی ہو۔ خاتمنہ منزہ کے روایتی بس میں تھیں اور آپس میں مصلیں کر رہی تھیں۔ ان کی خوبصورت پر کشش نیوالی بھی تھیں۔ ایک بوڑا گزر اب سر جوڑے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ کچھ نوہوان پہنچتے ہوئے اور کچھ زیادہ ہی پہنچتے ہوئے گزرتے۔

جب میں پن پھلی کے قریب پنچا تو مجھے سانس درست کرنے کے لیے رکنا رہا۔ آپ نے ہمارا پانی پیا؟ راستے کے اوپر وہ منتش کرو تھا جس کے پیغے سے گزر کر قلعے کو جایا جاتا تھا۔ اور تاریکی کچھ زیادہ تھی اور وہند تھی اور سردی بھی تھی۔ میں وہند میں آہست آہست چلتے لگا۔ اور یہ ایک خواب میں چلتے کی طرح تھا۔ وہند قلعے کی دیوار تک پہنچنے پر فتح ہو گئی۔ کسی تبتی لاما سرانے کیلئے بنت کا قلعہ تھا، کسی بدھ بھکشو کی طرح اپنے گیان میں اپنے دھیان میں گمراہ تھا۔ میں ایک بلند جگہ پر چڑھ کر پہنچ گیا۔ اور اب میرے پیغے وادی منزہ وہند میں تھی اور اس سے پرے را کا پوٹھی کی سفیدی میم خیال کی طرح تھی۔ کہیں کہیں چڑھ جلتے تھے۔ کچھ گھروں میں

چڑھا تھا۔ کہیں بھلی روشنی تھی۔

میں بہت دیر تک وہیں اکیلا بیٹھا رہا۔ میرے آس پاس صرف تاریکی تھی۔ تھیل ہوتی ہوئی وہند تھی، اتر گلیشیر سے اترنے والی خلکی تھی، اتر کے درے سے گزرنے والی تیز ہوا کا دہم شور تھا اور سر کے اوپر سینکڑوں برس پرنا لکڑی کا ایک بوسیدہ کمرہ تھا جسے شہیروں کے سارے قائم رکھا گیا تھا۔ اور یہی وہ قلعہ تھا جو دنیا کے شاندار ترین مناظر میں سے ایک کے پہلو میں نظر آتا ہے۔

میں بالکل غالی الذہب تھا جب سامنے کی پہاڑی کے اندر ہرے میں ایک پچھڑی کی چھوٹی روشنی سے ہوئی۔ پھر وادی کے اندر ہرے گوشے منور ہونے لگے۔ اور اس چکا چوند کے پیچے ہزاروں چڑھ تھے یا لائیں تھیں یا شعلیں تھیں جو میرے چاروں جانب وادی منزہ کے گرد کھڑے پاٹوں کی بلندیوں پر بٹتی تھیں۔ کچھ نوہوان پیچے سے اوپر آئے اور قلعے کی دیوار پر موبل آکل سے بھکوئے ہوئے کپڑے رکھ کر اپسیں آٹ لگا دی۔ چھوٹے چھوٹے غالی ڈبوں میں بھی تیل تھا جو روشن ہو رہا تھا۔

وادی منزہ میرے سامنے روشن ہو رہی تھی اور اس میں وہ زرد جھلکلاہٹ تھی جو چڑھوں میں ہوتی ہے۔ مجھے اب یاد آیا کہ گلگت میں اکرام نے کہا تھا کہ کل پنس کر کم آغا خان کی تاج پوشی کی ساکرگہ ہے۔ اور یہ چڑھاں میرے لیے انعام تھا۔ ہر سیاح کو قدرت اس کی ستری مصوبتوں کے پیلے میں کہیں نہ کہیں انعام دیتی ہے۔ کبھی وہ جیل جنیوا کے کنارے والی رقص کی تحریکی ہوئی دھن ہوتی ہے۔ کبھی وہ گھٹالیہ کے دیر انوں میں ثوریا کی شام ہوتی ہے۔ دریائے ماں کو کے کنارے سفیدے کے جھلک میں ایک پکنک۔ قادر آباد پیرراج کے پانچوں پر سروبوں کی دھوپ میں تحریکی ہوئی ہزاروں مرغیاں۔ گھاس کے شتری میدانوں کے پس مختصر میں زرد چڑھ۔ رتی گلی کی جڑوں جھلکیں۔ کہیں نہ کہیں قدرت انعام ضرور دیتی ہے اور اس شب کرم آباد کے قدم تکے کی دیوار پر پہنچنے ہوئے میرے آس پاس پوری وادی میں جو چڑھاں ہو رہا تھا وہ میرا انعام تھا۔ وہ چڑھاں صرف میرے لیے ہو رہا تھا۔

میں اس وقت اپنی پتھریلی آنکھگاہ سے پیغے اترًا جب الاڈہم ہو کر پہنچنے لگے اور اندر ہر ایک سیاہ وہند کی طرح رینگتا ہوا اپس آئے لگا۔ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا پیغے اترنے لگا۔ بازار میں ابھی کچھ لوگ تھے

"آپ نے جو توں کا ہار پکن رکھا ہے....." ایک نوجوان نے اسے چھیڑا۔

"ہاں خود پہنا ہے کسی نے پہنایا نہیں" اس نے سرہلا کر کہا "یہ میرے شق
ہیں" وہ انسیں تھکنے لگا" مجھے بہت دور اور بہت بلندی پر لے جاتے ہیں....."

"آپ اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں؟" میں نے دریافت کیا
اور پر سے بہت بلندی سے وہاں ایک گلیشیر پر میں مرنے لگا تھا۔
لیا..... ان جو توں کی وجہ سے..... یہ میرے دوست ہیں"

"آپ اکیلے جاتے ہیں پہاڑوں میں؟" ایک نوجوان جو بے حد مرعوب نظر آتا
تھا پوچھنے لگا۔

"میں اکثر کسی مم کے ساتھ شامل ہو جاتا ہوں ان سے کہتا ہوں کہ خیہہ میرا
اپنا ہے۔ خوارک میں خود پکاؤں گا۔ صرف آپ کے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہوں اور آکٹھ
اوقات وہ مان جاتے ہیں۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں مجھے کوئی وادی نظر آجائی
ہے۔ مجھے کہیں کوئی جگل دھکائی دے جاتا ہے، کوئی آثار نظر آتی ہے تو میں مم سے
الگ ہو کر اوہر چلا جاتا ہوں..... اور اکثر اوقات مرتبے پہچا ہوں..... شامل میں
اب بھی ایسے علاقے ہیں جہاں مار خور انسان کے قریب آ جاتے ہیں بغیر کسی خوف
کے اور وہ اسے سوچتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے..... کیونکہ انہوں نے اسے پہلے کبھی
نہیں دیکھا ہوتا۔"

"واہ....." ایک نوجوان نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"اور آپ بالی سارا سال کیا کرتے ہیں؟"

"بنتا تو ہے کہ ٹپھر ہوں پچوں کو اپنے سفر کے قصے سناتا ہوں اور قدرت کے
قریب لے جانے کی کوشش کرتا ہوں..... انسان نیچر کا ایک حصہ ہے اسے اسی کے
پاس والہ جانا چاہیے..... اور انسان کبھی نہیں مرتا..... انسان اور اس کا جذبہ مٹی
سے کسی نے پوچھا تم میں خوشبو کہاں سے آئی؟ کئے گلی میں گلاب کے پاس رہی
ہوں..... مجھے میں پورے کائنات کی خوشبو ہے..... میں اس کا ایک حصہ بن چکی
ہوں....."

آپ کے بال پہنچے آپ کی آوارہ گردیوں پر معرض نہیں ہوتے؟"
میں نے شادی نہیں کی۔" اس نے چائے پینے سے پہنچا پہنچے جو توں کا ہار میز

پر رکھ دیا "کیونکہ میں پہنچے پیدا کرنا نہیں چاہتا۔"

"کیوں....." ایک نوجوان نے فوراً پوچھا۔

..... رامت ایک ہوٹل کے پادری ٹھانے کے روشن داں کی سُخ پر تھا۔ پادری ٹھانے
میں سفید اپرین باندھے ایک پادری نما صاحب میز پر پڑے ایک سالم بکرے کی ہاگہ
پہنچے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ سانسے سے تین نوجوان پڑے آرہے تھے۔ مجھے
دیکھ کر وہ رک گئے اور پھر ساتھ ساتھ مٹے گئے۔ وہ مانان میڈیکل کالج کے طالب علم
تھے۔ انسیں سفر ہموں کا اور سیاحت کا خطہ تھا اور ان کے پاس بہت سوال تھے اور
میرے پاس کم ہر آپ تھے۔ اندھیرے میں آہست آہست چل آیک فیر مکی شخص کا نہ سے
پر ایک رک سیک گئے میں ہار کی طرح ہموں میں بندھے ہوئے فل بوٹ، سر پر بیٹ
اور پٹکے فریم کی میک لگائے۔ وہ ہمارے قریب سے گزرا تو اس نے بلند آواز میں
"(السلام و ملکم)" کہا۔

"وَلِكِمُ الْلَّاْمَ" ہم رک گئے۔ وہ رکتے کے موڑ میں نہیں تھا لیکن رک گیا
"آپ اردو بولتے ہیں؟"

"مجی ہاں" اس نے سرپاہا۔

"کہاں سے آئے ہیں؟" ایک نوجوان نے دریافت کیا۔

"اوپر اونچے پہاڑوں سے....." اندھیرے میں اس کی میک کے شیشوں میں کچھ
روشنی ہی تھی۔

"آپ بہت اچھی اردو بولتے ہیں" میں نے کہا۔

"مجی ٹکریہ"

اور یہ زبان آپ نے کہا سے سمجھی؟"

"کراچی سے....."

"بہت خوب..... کون سے ملک کے ہیں؟"

"پاکستان۔"

ہم تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ وہ جان گیا کہ ہم شرمندگی سے چب
ہیں۔ اس لیے بولنے لگا "میرا ہم عبدالحق ہے اور میں کراچی کے ایک سکول میں ٹپھر
ہوں..... گرمیوں کی چھیڑا ہوتی ہیں تو میں اپنارک سیک اور سینپنگ بیک اٹھا کر
اوھر شاہ میں آ جاتا ہوں....."

"آپ ایک بیالی چائے ہمارے ساتھ بخیں....."

وہ ہمارے قبیلے کا آدمی تھا اور میں اسے بہتر طور پر جانا چاہتا تھا۔ ہم نزدیکی
ہوٹل میں پڑے گئے۔

”پھن مسجد کی چڑھائی بھی شامل تھی۔ اپنی دہل پکھو ہو جاتا تو؟ اور اب ہم اپنی ناٹا پریت کے میں یکپ کی جانب لے جانے لگے تھے۔ ابھی نیم بنائی ہے میں نے۔“
بھجے ایک دم فصر آگیا ایک صاحب روزانہ شوگر کا نیک خود لگاتے ہیں اور دوسرے دل کے مریض ہیں۔ ”نکایی صاحب آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“
”بادشاہو ہمیں کوئی نہیں ہمارت شارت کی پر اطمین۔“ کمبل کے اندر سے ان کی آواز آئی۔

”ذرا چھو کر ایس اور اٹھ کر بیٹھیں۔“ میں نے اپنی باقاعدہ ڈائٹ اور دو اچھے پھجن کی طرح فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔
”آپ کو اس سفر کے دوران پکھو ہو جاتا تو کون ذمہ دار ہوتا؟ میں۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں؟“
”بادشاہو بتا رتا تو آپ مجھے اپنے ساتھ لاتے؟“
”نہیں ہرگز نہیں۔“
”ای لے نہیں بتایا تھا۔“

میں بہت دیر تک کڑھتا رہا۔ مطیع بھی چپ بیٹھا آنکھیں جھپٹتا رہا۔ پھر نکای صاحب بڑی نرمی سے کہنے لگے ”یار یہ ڈاکٹر جو ہوتے ہیں ان پڑھ ہوتے ہیں۔۔۔ کہتے ہیں کہ انجاماتا ہے۔ اندازہ کرو گولیاں شولیاں بھی دے رکھی ہیں لیکن میں نہیں کہتا۔۔۔“

”بڑی عکندی کرتے ہیں تاں کہ گولیاں نہیں کھاتے۔۔۔“
”میں دل کے درد کو برداشت کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کہاں تک لے جاتا ہے۔“

وادی کی ڈھلوانوں پر کھڑے پاہلو کے درخت گھر گلشیر سے آئے والی ہوا کے زور سے اندر ہمیں شور کرتے تھے اور جب ہم چپ ہو جاتے تھے تو ان کا شور کھڑے میں بوٹا تھا۔

”آپ ہمارے ساتھ ناٹا پریت کے میں یکپ تک نہیں جا رہے۔۔۔“ میں نے بہت کر کے کہا کیونکہ نکایی صاحب کو بھی اسی فقرے کا انتشار تھا اور اسی لیے وہ فوراً بولے ”نہیں کیوں نہیں جا رہے۔۔۔ میں کیا سمجھتا ہوں دل کی بیماری کو۔۔۔ آپ فکری نہ کرو۔۔۔“

”وہ دوسرے بچوں کو بھوکا مار دیں گے۔۔۔ دنیا میں روزانہ لاکھوں بچے بھوک کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ اگر میں دو بچے اور پیدا کر دوں تو اس کا مطلب ہے کہ دو بچوں کی خوارک اور کم ہو گی۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا بھر کے بھوکے بچوں کو خوارک میسا کروں۔۔۔ وہ سب بھی تو میرے بچے ہیں۔ میں مزید بچے پیدا کرنا نہیں چاہتا۔۔۔ مجھے اجازت دیجئے میں تھکا ہوا ہوں۔“

”وہ اٹھ کر ڈا ہوا اور اپنے جوتوں کو پھر سے گلے میں ڈال لیا۔۔۔ بھی مجھے شب برسی کے لیے کوئی ستا کرو خلاش کرنا ہے۔“

”ہمارا ہوش بے حد ستا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔۔۔“ میڈیکل کے طالب علموں نے بڑے اشتیاق سے اسے دعوت دی۔

”چلیں۔۔۔“ وہ اٹھا ”جب تک انسان گلے میں جوتوں کا ہارن پہنے وہ اپنے آپ کو نہیں پہچاتا تاڑو صاحب۔۔۔ مٹی میں خوبیوں کاں سے آئی۔۔۔“ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلا گیا اور میں بہت دیر تک اس کی غصیت کے الجھاؤ میں گم دہاں بیٹھا رہا۔

وہ اپنی ”راکا پوچی ان“ میں اپنے کمرے میں آیا تو دہاں ایک اور الجھاؤ میرا خفتر تھا۔ نکایی صاحب بستر پر دراز تھے اور مطیع آلتی پالتی مارے اپنے بستر پر بیٹھا تھا۔ اتارے تیزی سے آنکھیں جھپک رہا تھا۔

”نکایی صاحب نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔۔۔“
”کیا ہوا؟؟“

”آپ کو یاد ہے ہزار کے بعد جب وہ بلند راست آیا تھا تو نکایی صاحب ایک دیوار کا سارا لے کر کھڑے ہو گئے تھے اور آپ سے کہا تھا کہ کیا کرنا ہے تو قدمہ دیکھ کر۔۔۔“

”آپ کے جانے کے بعد میں نے فور کیا تو نکایی صاحب کا چھوڑ زرد ہو چکا تھا اور یہ کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔۔۔ دہیں بیٹھ گئے۔۔۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے تو پلے چپ رہے پھر کرنے لگے کہ یار مجھے وہ ہمارت شارت کی تھوڑی سی پر اطمین ہے۔“

”ہمارت۔۔۔“ میں نے نکایی صاحب کی جانب دیکھا وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور یقیناً اس وقت ہماری باتیں سن رہے تھے۔ میرے سامنے وہ تمام بلندیاں اور پڑھائیاں گھوم گئیں جس کہ ہم نکایی صاحب کو لے کر گئے تھے۔۔۔ ان میں خلپوکی

چھوڑ کر اپنے دفتر گیا تھا۔ سازی گیا رہ بجے تھے اور چلاس کے لئے ویکن دو بجے روانہ ہوتی تھی۔ ان ڈھائی گھنٹوں میں ہمیں ویکن کے لئے بکل کرنا تھی اور فیری میڈو کے سڑکے لیے تمام ضروری سامان خریدنا تھا اور یہ ایک بہت طویل فرست تھی اور میں اسے جیب سے نکال کر بار بار دیکھتا تھا۔

"تو پھر میں جاؤں؟" نکایی صاحب اب بالکل تو آزاد تھے اور ہمیں چھپنے کے موڑ میں تھے "یار ہمیں بھی لے چلو اپنے ساتھ۔ ہم بھی دیکھیں ہاں پریاں شریاں" "آج شب تو یہیں گلگت میں بہر کریں اور کل صبح پوچھے جائیں۔ بہت پر سکون اور خوبصورت قصہ ہے اور وہاں میرے ایک دوست ماشر حقیقت بھی ہیں، آپ کی دیکھ بھال کریں گے اور دو ماشر اکٹھے ہو جائیں گے۔"

"نکایی صاحب یہ بہت اچھا آئیتا ہے" مطیع بولا "اتھی دور آکر گھرات واپس چلے جانا۔ بہت بے وقوفی ہے۔ آپ چد دون او ہر ہی گزاریں۔" "اکیلا ہی گھوٹا پھوٹو؟ یار اکیلے گھوٹت مجھے بڑا ڈر لگتا ہے" نکایی صاحب کی تازگی بکدم ماند پڑ گئی" دیے پوچھی جگہ ہے؟" "بہت۔"

"تو پھر تھیک ہے میں کل صبح یہ جاتا ہوں۔" کتنی دیر میں ہنچ جاؤں گا پانچ چھ گھنٹے میں؟ ہم تو تھی مجھے کیا پرواد ہے آپ کی۔ آپ جاؤ ناگا پرست۔ میں پوسو جا کر آرام کرتا ہوں۔" نکایی صاحب نے اپنا بیک اٹھایا "رور سائینڈ نورث لاج میں رات بہر کرتا ہوں اچھی جگہ تھی۔ اچھا بھی مطیع۔ لوچی تارڑ صاحب پھر ملاقاتیں ہوں گی"۔

"سوری نکایی صاحب۔" میں نے کما لیکن یہ دراصل ہم دونوں نے = دل سے کما کیونکہ ہم بے حد مجرم محسوس کر رہے تھے۔ ہم اپنے ایک ساتھی کو راستے میں پھوڑ رہے تھے لیکن اس کیلکی کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ نکایی صاحب نے سڑک پار کی۔ دوسری جانب پہنچ کر بیک کو فٹ پا تھوڑ پر رکھا اور چند گھرے سانس لے کر بیک پھر اٹھایا اور آہستہ آہستہ پہنچے چار ان کی جانب مڑ گئے۔

"آپ نہیں جاسکتے" مطیع نے بھی فیصلہ دے دیا اور نکایی صاحب کے چہرے پر زردی پھیلی ہو لاعلاج مریض کے چہرے پر اس لمحے پھیلتی ہے جب ڈاکٹر اسے آخری انکار کرتا ہے۔

"کیوں نہیں جاسکتے" نکایی صاحب نے ہت کر کے پھر کہا "اُن کی آواز شدت چند بات سے بینٹھ چکی تھی۔ تم نے کوئی مجھے اٹھا کر لے جانا ہے۔۔۔ خود چل کر جاؤں گا اپنے پاؤں پر۔۔۔ مجھے تم روک لو گے۔ میں خود آ جاؤں گا تمہارے پیچے پیچے۔۔۔" "نہیں۔۔۔" میں نے اس فرض کے لئے بے پناہ ہمدردی محسوس کرتے ہوئے کہا "نکایی صاحب وہاں اگر آپ کو کچھ ہو جاتا ہے تو۔۔۔ میں آپ کو واپس گھرات نہیں پہنچا سکتا۔۔۔ یہ میرے بس کی بات نہیں"۔

"تو باوشاہو ویں چھوڑ آتا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ کم از کم جگہ تو خوبصورت ہو گی ہاں۔ پریاں شریاں۔ مرتبا تو بندے نے ہوتا ہی ہے کہیں نہ کہیں۔۔۔" انسوں نے ہم دونوں کی جانب باری باری دیکھا۔۔۔ اور ہمارے چوڑیں پر اپنے لئے وکھ وکھا اور پھر نکایی صاحب اپنے بارے میں پاتھی کرنے لگے۔ زندگی کے ان گھوٹوں کے بارے میں جو ہم سے پوچشیدہ تھے۔۔۔ ان ٹھوٹوں کے بارے میں جو ان پر بھاری گز رہے۔۔۔ اپنی پہلی یوہی کے بارے میں۔

"میں اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ کافی میں دس منٹ کے لیے قارئ ہوتا تو مگر آکر اسے ایک نظر دیکھ جاتا۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتا۔۔۔ محلے والے کہتے ہیں تھے تو ہماری یوہیوں کو بھی چوڑ کر دیا ہے یہ کتنی چیز کہ ہمیں بھی اس طرح رکھو جس طرح ماشر اپنی یوہی کو رکھتا ہے لاؤ ہمارے اور عزت سے۔۔۔ اور پھر وہ مر گئی۔۔۔ لوگوں نے مجھے ذمہ دار نہ کیا۔۔۔ میں تو اس سے بے حد محبت کرتا تھا باوشاہو۔۔۔ محلے والے کہتے تھے ماشر نے تو ہماری یوہیوں کو بھی چوڑ کر دیا ہے۔۔۔"

وادی کی ڈھلوانوں پر کھڑے پا یار ہوا کے زور سے شور کرتے تھے اور بہت کرتے تھے۔ ہم تینوں گلگت بازار میں کھڑے تھے اور ہمارے رک سیک اونڈے پھوٹوں کی طرح فٹ پا تھوڑ پر پڑے تھے۔

کرم آپا سے واپسی کا سفر غامبوشی میں ملے ہوا۔ ابھی ابھی اکرام ہمیں یہاں

اور ہماری دیگن پچھے میں صرف پدرہ مت پا تھے اور ہمارا سلام گلت بازار میں ایک کلو میرز کے علاقے میں واقع مختلف دو کالوں میں بندھا پڑا تھا اور ابھی اسے سینتا تھا میں نے رکے بغیر پچھے پڑتے ان حضرات سے ہاتھ ملایا اور پھر پسندید پکاری بعد میں مطیع ہے حد تاراض ہوا کہ ان میں تو ایک کرع صاحب بھی تھے۔ آپ نے افت ہی نہیں کرائی۔ ان کے ساتھ ایک کپ چائے لیتے تھے تو کون سا طوفان آ جاتا زیادہ سے زیادہ چلاس جانے والی دیگن مس ہو جاتی تو کل چلے جاتے انہوں کو اتنا بھی مغور نہیں ہوتا چاہئے۔

اور جب ہم اپنی درجنوں پوٹیاں بنجاتے گئیں دیگن اشینڈ پر پہنچے تو چلاس جانے والی آخری دیگن کے لئے تمام گشتیں پر ہو چکی تھیں اور بگ کلر کو پلے ہماری طرف رکھتا تھا اب وہ ہماری سنتا بھی نہ تھا میں نے بت شور چالیا کہ میں ڈھانی گھنے پیشتر یہاں آیا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ بگ کلر ہو جائے گی دیگن بے سود تب اس کو متانی نوجوان نے دیگن کے اندر سے سر نکلا اور باہر تھوکا اور پھر ہنگامہ کر دیا کہ یہ صاحب اس دیگن میں ضرور بیٹھے گا کیونکہ یہ حق کرتا ہے اس کلر کے وعدہ کیا تھا اگر نہیں بٹھائے گا تو دیگن نہیں چلے گا چلے گا تو ہم روک دے گا اور اس کے ساتھ اس نے اپنی کمر کو پھیپھیایا یہ بتانے کے لئے کہ دیگن روکنے کے لئے اس کے پاس مناب بندوبست ہے چنانچہ دو حضرات کو اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا اور ہمیں جگہ دے دی گئی۔ ان حضرات نے بالکل احتیاج نہ کیا کیونکہ یہ دراصل ہماری نشتوں پر ہی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ اطمینان سے کپڑے بھاڑتے ہوئے چلے گئے۔

ڈرائیور اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور چالی گھنٹا کراچی گرم کرنے لگا اور تب اس لئے مجھے اس نئیے کا خیال آیا جو اکرام کے دفتر میں رکھا تھا اور جسے مطیع نے وہاں سے لانا تھا اور جس کے بغیر ظاہر ہے ہم فیری میڈو چانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے

”مطیع صاحب ہمارے پاس خیر نہیں ہے۔“

”ہاں وہ تو نہیں ہے۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور برابر بیٹھے ہوئے ایک ڈاکٹر صاحب سے پھر ہو گنگو ہو گیا۔
”اور اس کے بغیر ہم ٹریننگ پر نہیں جا سکتے“ وہ پرستور ہو گنگو تھا اس لئے میں نے ذرا گجدار آواز میں کہا ”خال صاحب ابھی اس وقت جائیں اور رکھے پر

”چینی شیر سندھ کی گھری گونج اور رائے کوٹ پل“

”مطیع ہمارے پاس تقریباً دو گھنٹے ہاتی ہیں۔ دیگن کی بگل اور پھر خریداری“ ہم دیگن اشینڈ پر پہنچے۔ بگل کلر سے گنگو کی۔ دیگن اس نے ہماری جانب دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ ایک نوجوان کو متانی ہماری مدد کو آیا اور اس نے ہتھیا کہ بگل دیگن شارت ہوئے سے آؤ گھنے پسلے ہو گی تب ہم بھاگ بھاگ بازار میں پہنچے ”ہم“ سے مراد صرف میں تھا کیونکہ مطیع الرحمن بڑے پر سکون انداز میں گلت بازار میں چل قدمی کر رہے تھے۔ چل کھا رہے تھے۔ پرانے کے اور زیورات خلاش کر رہے تھے۔ ان کے ذمہ رات کے کھانے کے لئے چلی کتاب اور ہانوں کی خریداری تھی۔ میں نے فرست ہاتھ میں پکڑی اور بازار کی تقریباً ہر دو کال میں جا کر مطلوبہ اشیاء خریدیں اور ان کے پیکٹ بندھوا کر اٹھیں وہیں رکھوادیا۔ ہمیں کم از کم ایک ہفتہ کی خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت خریدنا تھیں۔ اس روز گلت بازار کے فٹ پاتھ پر جو ٹھنڈاں پاگلوں کی طرح ادھر اور وہر رہا تھا اور تجوڑوں کی طرح اس کے ساتھ تھا، وہ میں تھا اور جو ٹھنڈا فٹ پاتھ تھا اس سے کمرا چد سیاہوں کے ساتھ گپ بازی کر رہا تھا وہ مطیع تھا اور جب بھی میں پہنچ دیکھتا اس کے قریب سے گزرتا وہ کہتا ”میری مدد کی ضرورت تو نہیں؟“ ایک مرتبہ جب میں شاید تیسویں مرتبہ اس کے قریب سے گزرتا تو اس نے چار پانچ حضرات کو یہ لائچ دے کر روک رکھا تھا کہ ابھی آپ کی ملاقات تاریخ صاحب سے کراسیں گے اور پھر اکٹھے چائے میں گے اور یہ جو منہ کھولے پہنچ دیکھتے چلے آ رہے ہیں میں تو تاریخ صاحب ہیں جناب یہ ہیں یہ کہ کہاں نے ان معززین کا تعارف کرانا شروع کر دیا“

روشنی ابھی تھی جب وہیں رائے کوٹ پل کے پار جا کر رک گئی۔
وہیں پلی گئی تو ہم نے آس پاس دیکھا۔

رائے کوٹ کا خوبصورت پل جس کے بہت پیچے سندھ کا خیالا پانی ایک گھری گونج کے ساتھ بتا تھا۔ پل پر چینی شیروں کے مجھے اتری شام اور پہاڑوں کی ویرانی میں۔ ایک نہایا جس میں صرف سندھ کے بہاؤ کی گواز تھی۔ اور سڑک کے کنارے ہم دونوں کے رک سیک اور پوٹھیاں۔ چدمر سے ہم آئے تھے اور ایک بہت بڑی چنان تھی جو پل پر سایہ کرتی تھی۔ ہائیس ہاتھ پر فکر طلا ہوٹل کی چھوٹی سی عمارت بند پڑی تھی، چند گیراج تھے۔ پل کے پہلو میں ایک چھوٹا سا کین بن تھا جس میں دو پولیس والے دبکے بیٹھے تھے۔ کین بن کے ساتھ بڑے بڑے پھوٹوں کا ایک مجموعہ تھا اور تھوڑی سی رتلی جگہ تھی۔ ہمیں ہتایا گیا تھا کہ نیزی میڈو اور نانگا پرست جانے والے کوہ پیا اسی مقام پر خیر نصب کر کے رات گزارتے ہیں۔

لیکن یہاں تھالی بہت تھی اور شاہراہ رشم پر سے گزرنے والی اکا دکا بس یا وہیں بھی اس خوف کو کم نہیں کرتی تھی جو اس عک درہ نما مقام پر دل میں بیٹھتا جاتا تھا۔ پل کے ہائیس ہاتھ پر تو پولیس کی بنیں تھی اور وہ رتلی جگہ جہاں شب بسری کے لئے نیمیں شیرد زن ہوتی تھیں اور دائیں جانب فکر طلا کے ساتھ ایک پھر طلا راست اپر جاتا تھا۔ راستے کے پیچے دریا کے قریب بھی ایک چھوٹا سا ویران تھا جو مجھے خیر لگانے کے لیے زیادہ موذنوں لگ رہا تھا۔ میں جائزہ لینے کے لیے پیچے اڑتا۔ وہاں چند کمی کوٹھریاں تھیں جن کے چھتیں وحیچے پچھی تھیں اور ان سے پرے ایک فوجی تنبو تھا جس کے باہر بنیان اور نیکر میں ملبوس ایک فوجی رات کے کھانے کے لیے ہائیس میں ڈولی چلا رہا تھا اور اس نے میرے سلام کرنے پر صرف ایک فکر مجھ پر ڈالی اور پھر میرے وجود سے مکمل طور پر غافل ہو گیا۔ وہ پل پر تعینات تھا اور شاید اکثر سیاح شام کے وقت جان بوجھ کر اور ہر سے گزرتے ہوں گے تاکہ وہ انسیں مروٹا کھانے کی دعوت دے اور وہ اسے فوری طور پر قبول کر لیں۔ اس کے علاوہ اس کی سردمی کا کوئی جواز نہ تھا۔ میں کمی کوٹھریوں کے آس پاس گھوم رہا تھا کہ ایٹھوں کے ایک ڈیکر کے پیچھے سے ایک کیتا کیلی، اس نے مجھے دیکھا اور یہ دیکھنا میرے لیے کافی تھا اور میں شتابی سے پل پر واپس آگیا۔ میرا اندازہ درست تھا، بعد میں پولیس والوں نے ہتایا کہ وہ پاگل تھی اور متعدد راہ گیریوں کو کاٹ پچھی تھی۔

ہم نے اپنے رک سیک اور دیگر سالمان اٹھایا اور کین بن کے ساتھ پھوٹوں کے

سوار ہو کر جائیں اور اگر اکرام کا دفتر بند نہیں ہو گی تو خیر لے کر آئیں۔

"ایک تو آپ کو جلدی بہت ہوتی ہے۔" وہ بیزار ہو کر بولا۔ وہیں تو پڑھے والی ہے اور ہمارا سالمان بھی اپر بندھ چکا ہے۔ خیسے کے بغیر گزارہ کر لیں گے فکر نہ کریں۔"

"غائب صاحب۔" میں نے صرف اسکا اور اور مطیع مکر آتا ہوا وہیں سے اتر گیا۔ اور وہاں اگر تمیں دیر ہو جائے تو کل صحیح کی وہیں پر بیٹھ کر آ جانا میں رائے کوٹ پل پر تمہارا انتشار کروں گا۔ اور وہاں۔ خیسہ لگانے کا طریقہ بھی معلوم کر کے آتا۔"

مطیع چلا گیا۔ وہیں حرکت میں آگئی۔ اب میں نے ان ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا جن کے ساتھ مطیع گپ لگا رہا تھا۔ ان کا نام قاضی سلمی تھا اور وہ سول ہسپتال دوغاٹے، مہستان میں میڈیکل آفیسر تھے۔ میں نے انسیں ہتایا کہ اگر یہ وہیں اٹھے سے باہر نکل گئی تو میرا ساتھی بھی بھی خیسے کے ساتھ رائے کوٹ پل پر نہیں پہنچے گا۔ وہ دو تین روز گلگت بازار میں پرانے سکے خلاش کرے گا اور پھر ایک فتحنامی آہ بھر کر جہاز میں سوار ہو کر راولپنڈی چلا جائے گا اور شاید وہاں جا کر اسے خیال آجائے کہ تاریز رائے کوٹ پل پر بیٹھا میرا اور خیسے کا انتشار کر رہا ہے۔ اس آہ دزاری کا منابع اڑھ ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے وہیں ڈرائیور سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ ان میں یار بار مہمان اور مسافر کا ذکر آتا تھا۔ ڈرائیور بھی یار بار کھڑکی سے باہر تھوکتا تھا، شدید غصہ کا اظہار کرتا تھا اور ایک سیلیشور کو پپ کرتا چلا جاتا تھا۔

وس منٹ کے بعد اس کی بے صبری کا پیانہ لبریز ہو گیا اور وہیں اٹھے سے باہر جانے کے لیے رسیگنے لگی۔ میرا دل بھی ریختا ہوا پیچے ہونے لگا۔ لیکن مطیع "تمہروں" کا شور چھاتا کا ندھر سے پر شیرہ رکھے اسی لئے وارد ہو گیا۔ وہ وہیں کے اندر داخل ہوا تو دیگر مسافرنے اسے خوب چھکیاں دیں۔

وہیں شاہراہ رشم پر آئی تو اس کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ لیکن ڈارائیور ماہر تھا وہ تیز گھر مکاٹ چلا آتا تھا۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے جنگلوٹ میں رکے۔ شاندار قراقم اتنے بلند تھے کہ سورج ابھی سے ان کے پیچے پوشیدہ ہو رہا تھا اور ان کے ساتھ وادیوں میں چلتے جا رہے تھے۔ وہیں کے اندر گری تھی۔ ہمارے آس پاس چھٹیل پہاڑ تھے جو سارا دن دھوپ سے گرم ہوتے تھے اور پھر شام کے وقت ان میں سے تیس خارج ہوتی ہے۔ یہ علاقہ گرم موسموں کا تھا اور بخوبی انوں کا تھا۔

یاد نہیں رہے۔ اب میں ان کر علی صاحب کو چھوڑ کر کیسے چلا جائیں۔

دہاں اگر امیر اعظم نہ ہوتا تو ہمارے ستر کی پہلی رات ایک بھوکی رات ہوتی۔ دہ ہمیں ان سیاحوں کے قصے سناتا رہا جو کبھی کبھار کسی بس یا ویگن سے اتر کر یہاں شب بسری کرتے ہیں اور اگلی صبح فیزی میڈو کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ روپیٹھی کی جانب سے ایک بس آئی اور میل کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس میں سے دو مسافر اترے۔ ایک چھوٹے قد کا باریش شخص تھا جو گزری پاندھے ہوئے تھا اور ذرا اکثر کچلا تھا اور دوسرا ایک بارہ تینوں برس کے بچے کو اٹھائے ہوئے بس میں سے باہر آیا۔ دہ ہماری طرف دیکھے بغیر دوسری طرف اس پتھریلے راستے پر چلتے گئے جو پہاڑ کی جانب جاتا تھا۔ تھوڑی دور جا کر وہ اپنا سامان درست کرنے کی غرض سے رکے اور انہوں نے ہماری طرف دیکھا۔ آپس میں کچھ گفتگو کی اور پھر بچے مڑ کر ہمارے پاس آئے اور بیٹھ گئے۔

"مسلمان؟" باریش شخص نے آتے ہی پہلا سوال کیا۔ میرے سر ہلانے پر اس نے اپنا ہاتھ آگے پڑھایا اور کہنے لگا "ہم مسلمان تم مسلمان۔ تم ہمارا بھائی۔" مطیع سے بھی بھی سوال پوچھا گیا اور پھر اسے بھی "ہم مسلمان تم مسلمان۔ تم ہمارا بھائی۔"

اس نے اپنا نام مولوی عبدالرحمن بتایا۔ وہ فیزی میڈو کے راستے میں پڑتے گاؤں آتا کی مسجد کا امام تھا۔ کسی کام کی غرض سے چلاس گیا ہوا تھا اور اب گاؤں لوٹ رہا تھا۔ اس کے ساتھی کام قدم خان تھا اور وہ اپنے بیار بیٹے کے علاج کی خاطر چلاس کے ہپتال تک گیا تھا اور اب اسے اخاکر گر لے جا رہا تھا۔

"آپ کے پاس بوجھ ہے؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔
"بوجھ؟"

"اور مسلمان۔ تم اور فیزی میڈو جاتا ہے تو ہم بوجھ اٹھاتا ہے۔" ہم پورڑ بہے۔ اس نے بیٹے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مولوی صاحب آپ کیسے پورڑ ہے آپ تو مولوی صاحب ہے" میں نے نہیں کہا۔

مولوی صاحب فوراً اٹھے اور ایک رک سیک با آسانی اٹھا کر میل کر اپنے پورڑ ہونے کا مظاہرہ کیا۔ یہ قدم خان ہے۔ یہ بھی پورڑ ہے۔ یہ بھی بوجھ اٹھائے گا۔" یہ بے چارا تو اپنے بیٹے کو اٹھائے گا۔" میں نے قدم خان کو دیکھا۔ وہ ایک

دریمان رتلی جگہ پر لے گئے۔ مطیع نے خیر مکھلا۔ یہ اگوکھم کا خیر تھا اور اسے نسب کرنا بے حد آسان تھا۔ یوں بھی مطیع آج صحیح اکرام سے اسے نصب کرنے کی زندگی لے کر آیا تھا۔ اس نے خیر نہیں پر بچھایا تو میں اس کی نیخن نہوں گئے تھا۔ پھر یہ گنبد خان خیر نہیں سے بلند ہو کر ایک چھوٹے سے خوبصورت اور پرآسانش مگر میں بدل گیا۔ میں سر جھکا کر ریختا ہوا اس کے اندر گیا تو چیزیں ایک ہاتم نہل کے اندر سفر کرنے لگا۔ بچھے بت پیچھے۔ میں آج تک پار کتنی سرزی میں، کیسی کیسی جسمانی اور ذہنی حالتوں میں اس طرح ریختا ہوا ان خیموں میں داخل ہوا تھا جو عمر کے مختلف حصوں میں میرے ساتھی تھے۔ سیاحت کا لطف اس لئے میں ہوتا ہے جب آپ کسی سر زمین پر پہلی بار اپنا خیر نسب کر کے اس میں ریختے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور آپ واپس اپنے گمراہی کیجئے جاتے ہیں۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اندر رکھا اور پھر باہر ہت پر بینے گئے۔ اپ شام گئی ہوئے گی تھی اور دریا کا شور پہلے کی نسبت بہت زیادہ بلند ہو چکا تھا۔ ہم جب سے یہاں آئے تھے مطیع کچھ چپ چپ تھا اور وہ حرث سے آس پاس دیکھا تھا اور گروں میں مل دے کر عینک سنجال کر ان پہاڑوں کو دیکھا تھا جو ہم پر بھکے ہوئے تھے۔

"فیزی میڈو کو کون ساراست جاتا ہے" اس نے پوچھا۔
"وہ شاید اوہ ہے اس پہاڑ کے بیچے۔"

"اس پہاڑ کے بیچے؟۔۔۔ لیکن۔۔۔ اس پر چڑھنا تو مشکل لگتا ہے۔" اور میں بھی جب سے رائے کوٹ پل پر اترا تھا اور ہر دیکھتا تھا چدھر دو دن کی مسافت پر فیزی میڈو ہے اور تین دن کی مسافت پر نالگا پریت کا میں یکپ ہے اور ڈرتا تھا کہ کل میں اس خوفناک اور آسمان کے اندر تک جاتے ہوئے پہاڑ پر کیسے چڑھوں گا۔۔۔ کیمین سے ایک نوجوان پولیس والا باہر نکلا اور ہمارے پاس آگیا۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں تھیں۔۔۔ اس نے چائے ہمارے سامنے رکھی اور پھر کیمین میں جا کر دو تمازہ روٹیاں لے آیا۔۔۔

"میرا نام امیر اعظم ہے صاحب۔۔۔ یہ کھائیں۔۔۔ آپ ہمارے سامان ہیں۔۔۔ روٹیاں سوکھی ہیں لیکن تمازہ ہیں۔۔۔"

"بت بت شکریہ" میں اس کے حسن سلوک سے بے حد تمازہ ہوا۔۔۔
لیکن ہم رات کا کھانا ساتھ لائے ہوئے ہیں۔۔۔"

"نہیں لائے ہوئے" مطیع پیچے سے بولا۔۔۔ "وہ چلی کتاب اور نان وغیرہ مجھے

رات خیبے میں گری تھی۔ کبھی کبحار گلگت یا راولپنڈی کی جانب سے کوئی دیکن یا بس وغیرہ آتی تو پل کے قریب آ کر اس کی رفتار کم ہو جاتی اور اس کی روشنی خیبے کے پردے پر لمحہ بھر کے لئے رونما ہوتی، نہ سرتی اور دور ہو جاتی۔ پورزوں کے گدھے پتوں کے قریب کھڑے تھے۔ ان کی گردنوں میں بندھی گھنینداں خاموشی میں آواز دیتیں تو ایک عجیب خوف خیبے کے اندر آ جاتا جیسے باہر کوئی ہے۔ میں کوئی بدلتا رہا۔ میری آنکھوں میں نند قیسی تھی۔ رات کے کسی پر من خیبے سے باہر آگیا۔ سندھ کی گونج کے شور کے سوا ہر شے فحری ہوتی تھی۔ ہاں اسی فحراؤ میں کبھی کبھی گدھوں کی گھنینداں دستک دیتیں۔ میں پل پر چلا گیا۔ یہاں قدرے مٹھنڈ ک تھی۔ پل کے فٹ پانچھ پر تاؤ سے آئے ہوئے پورزوں رہے تھے کوئی نکدی یہاں سندھ کی قربت تھی اور جھلکے کے نیچے سے ہوا آتی تھی۔ پل پر چینی شیروں کے چھوٹے چھوٹے بھنتے نشی میں بیجوں کی طرح پچکے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پاڑی بہت بلند اور بت ایک تھا جس پر ہمیں کل چڑھنا تھا۔ کل نہیں بلکہ آج۔ صبح ہونے والی تھی۔

ناخوش اور نا آسودہ کو متالی تھا۔ اس کے چہرے پر بیٹھے کی ہماری کی تشویش تھی اور وہ بار بار اپنی داڑھی کریدا تھا۔
”یہ بیٹھا اٹھائے گا۔“ مولوی صاحب بولے ”اور گدھا بوجھ اٹھائے گا۔“
”کون گدھا؟“
”اوھر سے آئے گا۔“ اس نے بلند پاڑی کی جانب اشارہ کیا ”ابھی آئے گا۔“ اور ابھی تاریکی گھری نہیں ہوتی تھی جب مولوی نے آنکھ بیچ کر اس بلند پاڑی کو دیکھا جسے کوہ چائی کی کہوں میں بولڈر رنج کا جاتا ہے اور میرا کنڈھا پکڑ کر کرنے والا ”اوھر پورڑ آتا ہے۔“ پسلے تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر جیسے بلندی پر جو نیاں رنگ رہی ہوں۔ یہاں کچھ تھا۔
”یہاں کیا ہے؟“

”یہاں گدھا ہے اور پورڑ ہے۔ تاؤ سے آتا ہے۔ نیم کو لینے۔“ اکرام نے ہمیں تھایا تھا کہ ایک آسٹرین نیم بھی فیری میڈو کے لئے رائے کوٹ پنچے والی تھی اور یہ پورڑ شاید اس کے پیغام کے نیچے میں اس نیم کو لینے آ رہے تھے۔ میں پاڑی کو دیکھتا رہا۔ تاریکی گھری ہو رہی تھی اور وہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔ جب وہ ہم تک نیچے تو امیر اعظم اپنی لاٹین جلا کر ہمارے درمیان رکھ رہا تھا اور ہم سب ایک دائرے میں بیٹھے تھے۔ انسوں نے درجن بھر گدھوں کو کھلا چھوڑ دیا اور خود ہمارے دائیرے میں شامل ہو گئے۔ وہ تقریباً پندرہ مزدور تھے جو تاؤ سے نیم کو لینے آئے تھے۔ اور نیم ابھی نہیں پنچی تھی۔ لاٹین کی روشنی میں میں نے سب کے چھوٹوں کو غور سے دیکھا۔ ہر ایک ایک الگ دنیا، ایک پورا جہاں، ہر ایک کی امیدیں اور دکھ اور محبتیں۔ اور زندگی کے بکھریزے۔ روزگار کے لئے وہ تاؤ سے نیچے آئے تھے۔ وہ مسلسل ہم دنوں کو دیکھتے رہے اور ہم رائے کوٹ پل کے پہلو میں ایک تاریک رات میں بلند پاڑیوں کے خوف اور سندھ کے مسلسل شور میں لاٹین کی روشنی میں۔ اسیں دیکھتے رہے۔ اور سوچتے تھے کہ قدرت کا یہ کیا کھیل ہے کہ وہ یہاں ہیں ہمارے سامنے اور ہم یہاں ہیں ان کے سامنے۔ وہ ہماری جگہ کیوں نہیں اور ہم ان کی جگہ کیوں نہیں۔ یا شاید وہ ہماری جگہ ہیں اور ہم ان کی جگہ ہیں۔

فیزی میڈو چک شریگ کے پارے میں میں نے جتنی کتابیں پڑھی تھیں اور جن تجربہ کارٹریکرڈ سے بات کی تھی سب نے یہی جایا تھا کہ وہاں جانے کے لئے من اور جس سے اٹھ کر روانہ ہو جانا از جد ضروری ہے بلکہ کافی کتابیں تو یہاں تک مشورے رہتی ہیں کہ بے شک ٹارچ کی روشنی میں چل دیں اور آدمی رات کو چل دیں ... سرف اس لئے کہ سورج نکلنے کے ساتھ ہی فیزی میڈو کا پتھر ٹرا راستہ جو "بولڈر رج" کہلاتا ہے، گرم ہوتا ہے اور پھر تنہے لگتا ہے۔ دس گیارہ بجے کے بعد وہاں چلتا ہمکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آس پاس صرف پتھر ہیں اور وہ گرم ہو کر پکھلنے کو آتے ہیں اور یاد رہے کہ پورے راستے میں چھاؤں بالکل نہیں ... فیزی میڈو کے راستے میں ایک بھی درخت یا جھاڑی نہیں جس کے نیچے آپ ستالیں ... اس کے علاوہ اہم ترین لمحہ یہ ہے کہ رائے کوٹ پل سے روانہ ہوتے وقت آپ کے پاس پانی ہوتا چاہئے ... یہ زندگی بچانے والا لکھتہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ بت عرصہ پہنچر کو ایسے ٹریکر جو زرا لپرواہ تھے "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ راستے میں پانی نہ ہو" یا "وکھا جائے گا" تم کے تھے، راستے میں یہ پاس کی شدت سے جاں بحق ہو گئے ... یعنی فیزی میڈو جانے والا راستہ کالاہاری صحراء کا چھوٹا بھائی تھا ... گلکت میں ہماری خریداری فرست پر سب سے اوپر "پالٹک کا بڑا جھری کین" تھا ...

رحمن اس جھری کین کو نیچے جا کر سندھ سے بھر لایا تھا ... اگرچہ رائے کوٹ پل کے نیچے سندھ کا جو پانی ہے وہ گدلا ہے اور بد ذاتیہ ہے لیکن بہر حال پانی ہے۔ "چائے صاحب" ... امیر اعظم ہمارے لیے کوستافی میزان کے طور پر چائے لے کر آگیا ... اور ہمیں یاد ولایا کہ ناشت بھی کرنا ہے ... اور ہمارے پاس ناشتے کے لیے ہنچاپ بیکری گلکت سے خرید کرہا ایک ڈبل روٹی کے سوا اور کچھ نہ تھا اور اس کا پکوئر نکل چکا تھا ... بہر حال چائے کے ساتھ اس کے ٹکڑے نکلنے کے بعد ہم دونوں پھر پولٹک میں جت گئے ... تھوڑی دیر میں ہم دونوں رحمن اور گدھا چاروں تیار ہو چکے تھے ...

"خال صاحب چلیں؟"

مطیع ارجمن خال نے اپنی چھڑی ایک پتھر پر رکھی اور بیک میں سے ایک باڑ کپٹکال کر پہن لی "چلیں" "مولوی صاحب چلیں؟" "مولوی صاحب کیوں نہیں چلیں..."

"اٹھو فیزی میڈو چلو"

خیسے میں واہیں جا کر میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ مولوی رحمن کا پاریش چڑھے خیسے کے پردے میں سے نمودار ہو گیا۔ "ہم مسلمان تم مسلمان ... تم ہمارا بھائی ... اٹھو فیزی میڈو چلو"

میں نے مطیع کے سلیپنگ بیک کو گرفت میں لے کر نور سے ہلا کا "ہم مسلمان ... تم مسلمان ... تم ہمارا بھائی ... اٹھو فیزی میڈو چلو" مطیع نے کوٹ بدی اور نیند میں بڑیا جایا "میکوں ٹھنڈ لگ ویکی ..."

میں نے خیسے میں سے مسلمان باہر نکالنا شروع کر دیا ... باہر ابھی نہیں تاریکی تھی ... پولیس کی بن کے باہر امیر اعظم آٹھ جلانے بیٹھا تھا ... قدم خان کا باپ جو پچھلی شب دوسرے پورٹوں کے ہمراہ نیچے آیا تھا، اپنے گھے کو تھپک کر دوسرے گدھوں سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحمن اپنے استرو شدہ سر پر بار بار ایک چپتی ہی لگاتا تھا اور پھر جانے کیوں بلند آواز میں ایک لمبی "ہو" لکھا تھا۔ اس تم کی چوتھی یا پانچھیں "ہو" پر مطیع آنکھیں مٹا ہوا خیسے سے باہر آگیا۔

"مطیع صاحب چلیں؟"

"بالکل چلیں چھپدری صاحب" وہ یکدم ہوشیار ہو گیا اور نہیں کی تھیں احکام کرائے سکتے لگا۔

"پانی آگیا مولوی صاحب" میں نے رحمن سے دریافت کیا ... "پانی آگیا؟ کیوں نہیں آگیا" رحمن بولا ... اور یہی اس کے بولنے کا انداز تھا کہ آپ جو کچھ پوچھیں گے اسے سوالیہ انداز میں دھرا کر خود ہی جواب سیاکر دئے ...

اور راستے اور پکڑ عذیاں دکھائی دینے لگے۔ میں نے اپنے سامنے دیکھا تو بس من کھولے دیکھتا ہی رہ گیا۔ سامنے ایک باقاعدہ عبور حرم کا انتہائی غیر و دستانہ پہاڑ جیسے آسمان تک چلا گیا تھا اور ذرا ترچا ہو کر چلا گیا تھا۔

"ہمیں وہاں جانا ہے؟" میں نے رحمٰن کو آواز دی۔

"ہمیں وہاں جانا ہے؟ کیوں نہیں جانا" وہ بولا "جد گدھا جاتا ہے اور ہر جانا ہے"۔ اور گدھا کہاں ہے؟۔ اور یہ کبھیت گدھے کا پچھے کہاں ہے۔ میں نے اس نیم نیالے عظیم توبے کو غور سے دیکھا جس کے ان گست پتوں میں اور ڈھلوانوں میں کہیں وہ گدھا نظر آنا چاہئے تھا لیکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

"مطیع گدھا کہاں ہے؟"

وہ اپنی چھڑی کا سارا لے کر کھڑا ہو گیا اور آنکھیں بیج کر بلندی کی جانب اس گدھے کو خلاش کرنے لگا جس پر اس کا سلامان لدا تھا۔ دراصل چھر کی وہ دنیا اتنی دسیع تھی کہ اس میں ایک گدھا آہست آہست بلندی کی جانب بڑھتا ہوا خلاش کرنا ایک ناممکن سا کام تھا۔ لیکن وہ یکدم نظر آیا۔ بلکہ اس پر لدے سرخ رک سیک کی سرفی نظر آگئی۔ میں نے فوراً کیرو گلے سے اتار کر تصور اتار لی۔ میرے پاس اس وقت جبکہ میں فیزی میڈو کا سزہار لکھ رہا ہوں وہ تصور سامنے میز پر رکھی ہوئی ہے۔ ایک بلند نیالے پہاڑ کی تصوری۔ ایک کونے میں رحمٰن دکھائی دیتا ہے لیکن۔

گدھا دکھائی نہیں دلتا۔ ہاں کبھی کبھار میں جب اس تصور کو بہت غور سے دیکھا ہوں تو وہ مل جاتا ہے۔ چنانچہ یہ تصور "آؤ گدھا خلاش کریں" کہلاتی ہے۔

ایک راستے کے نشان تھے جس پر ہم سورج طلوع ہوئے سے پہنچنے تھے اور چڑھتے تھے۔ شری زندگی اور آسانیوں کا عادی بدن تحکاوت اور پیٹے سے کپکا رہا تھا۔ اور پہبید ایسے بدہ رہا تھا جیسے تیز دھوپ میں کوئی کپا گلیشہر پھلتا ہو۔ اور یا اس۔ سوکھتی زبان۔ اور میں نے اپنا پسلہ پالی مانگا۔ "پانی"

"پانی؟" رحمٰن رک گیا "کیوں نہیں پانی" اس نے جمی کہیں میں سے تام چینی کے گک میں پانی اٹھا لیا اور بھجے دے دیا۔ خندہ کا گدلا اور بد ذاتہ پانی کسی مجرے کے اثر سے دینا کاشیری، ترین پانی بن چکا تھا۔

"مولوی صاحب۔ یہ جو پہاڑ ہے تو جب ہم اس کی چوٹی پر پہنچیں گے تو ادھر سے ٹانگا پرست نظر آئے گا؟"۔

"ہاں کیوں نہیں آئے گا۔" اس کی نگاہیں میری گھڑی پر جم گئیں "یہ گھڑی

مولوی نے میرا رک سیک اٹھایا جس کے سڑپیس کے ساتھ سلوک کی ایک دیکھی اور پانی کی ایک چھوٹی بوقت لٹک رہی تھی۔ قدم خان کے گدھے پر مطیع صاحب کا سلامان اور پانی کی سپلائی تھی۔ ہم سب نے بلند آواز میں بسم اللہ پڑھ کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

فیزی میڈو ہنگ پہنچنے کے لئے دو راستے ہیں۔ تاؤ نالے کے ایک جانب پہاڑ پر بریگینڈ سر اسلم خان کی کپی سڑک زیر تعمیر ہے۔ راستے میں جہاں جہاں پڑے پتھر ہیں وہاں سے سڑک نہیں بن سکی اور پیدل چلنے والوں کو چد انتہائی خطرناک مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جہاں، جہاں سے گزر جانے کے امکانات بھی قوی ہو جاتے ہیں۔ دوسرے پر اڑا راستہ ہے یعنی تاؤ نالے کے دوسری جانب جو پہاڑی سلسلہ ہے اس کے اوپر۔ یہ راستے انتہائی دشوار ہے، اور سورج نکلنے پر غور بن جاتا ہے۔ ہمیں اکرام نے چالیا تھا کہ تاؤ کا تمپردار ٹھکور شاید اپنی جیپ آپ کے لئے رائے کوٹ پل پر بیچ دے گا اور آپ جہاں تک کپی سڑک ہے وہاں تک اس پر سوار ہو کر جا سکتے ہیں اور باقی راستے پیدل ٹے کر لجھنے گا لیکن ایک تو جیپ کی ٹھکل دکھائی نہ دی۔ شاید ٹھکور کو پیغمبarm میں ملا تھا۔ اور یوں بھی تاؤ کے پورٹر ز کا یہی خیال تھا کہ پر اڑا راستہ اگرچہ مشکل اور طویل ہے لیکن یہ سڑک کی نسبت اتنا خطرناک نہیں۔ چنانچہ ہم نے پرانے راستے کا چھاؤ کیا۔

رائے کوٹ پل پر بھی چنان کے بیچے کہیں بھلی ہی سفیدی تھی۔ ٹھکلہ ہوئی کے پہلو میں سے جو پتھرلا راست اور جارہا تھا ہم اس پر چلنے لگے۔ سب سے آگے قدم خان کا باپ اور اس کا گدھا تھا اس کے بیچے رحمٰن سر جھکائے چل رہا تھا اور پھر ہم دونوں تھے، جو اپنے اپنے پتوں کی وجہ سے اور نیم تاریکی کے باعث کہیں کہیں ٹھوکر کھاتے تھے اور چلتے تھے۔ اس نیم تاریکی میں ہم نے تاؤ نالے کا بویسہ اور لرزائیں پل پار کیا۔ ہملا تاؤ نالہ سنده کے اندر لٹک مار کر تھا اور شور کرتا اس میں گم ہوتا تھا۔ اور اس کے پانیوں سے گندھک کی گرم بواختی تھی۔ پل کے بعد ذرا چھلائی شروع ہوئی۔ میں ہانپہ لٹک۔ میری عادت ہے کہ میں اپنی بدواشت سے تجاوز کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر میں دس قدم کے بعد تحکاوت محسوس کرتا ہوں تو وہیں رک کر آرام کر لیتا ہوں۔ میرا مقصد ایک خاص مقام پر پہنچتا ہوتا ہے، چاہے میں ایک دن کا سفر دو دن میں مکمل کروں۔ اس چھلائی کے بعد ایک میدان نما علاقہ آیا۔ اور یہاں پہنچنے تک سفیدی میں جیزس واضح ہونے لگیں اور پتھر

کتنے کی خریدی تھی؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے ہاتھ ہوئے کما۔

"چھپ گے؟ سو روپیہ دوں گا۔"

رحمن اس ٹریک کے دوران میری مختلف چیزوں کی قیمتیں پوچھ کر اپنی خریدنے کی کوشش کرتا رہا۔

مطیع اپنی چھڑی گھماتا آگے چل رہا تھا۔ "کیوں جی تارڑ صاحب رہ گے ہو؟" وہ بار بار مجھے چھینگتا اور میں جواب نہ دیا کیونکہ اگر میں جواب دیتا تو ہاتھا کس منہ سے؟ میں نے اپنے آپ کو ایک بڑے پتھر سے سارا دوا اور یکچھے دیکھا۔ پچھے اور دور دور تک پوری لینڈ سیکپ سلیٹی رنگ کی تھی، ہم خاصی بلندی پر سے قراقرم کا مشابہہ کر رہے تھے اور اس بلندیوں کی خاموش دنیا میں دریائے سندھ کے پالی خفیدہ لاوے کی طرح خاموشی سے بہ رہے تھے۔ چنانوں اور سلیٹی پہاڑوں کو کاٹ کر پکھلنے ہوئے بستے ہوئے اور ان کے اوپر ایک لکیر تھی جو ظاہر ہے شاہراہ قراقرم ہی ہو سکتی تھی۔ سورج ابھی طلوعِ شمس ہوا تھا۔

ایک خاص بلندی پر بچنگ کر راستے کی واضح علامات محدود ہو گئی اور ہم چھڑوں کے سارے بڑے بڑے پتھروں کو عبور کرتے ہوئے ان سے اپنے گھنٹے بچاتے ہوئے چلتے گئے۔ یہاں ہم ان لاتحداد گدھوں کے شرگزار ہوئے جو اس راستے پر چلتے اور مسافت کے دوران اپنی دشی الخاکر فراقت حاصل کرتے رہے اور یوں جانے والے اپنے نشان چھوڑ گئے۔ اور ان نشانوں کی حد سے ہی ہم راستہ غلاش کرتے تھے۔ اور پھر ہم یکدم روشنی میں آگئے۔ سورج ہم تک نہیں بلکہ ہم سورج تک آگئے تھے۔ بیچے دریائے سندھ اور رائے کوٹ پل ابھی اسی نیم تاریکی میں تھے جس میں ہم اپنی چھوڑ کر آئے تھے۔

"پالی" مطیع نے دیا دی۔

"پالی؟ کیوں نہیں پالی۔" رحمن فوراً رک گیا۔

مطیع نے چند گھوٹ پالی بیا اور بیچہ سر پر اغیل لیا "مولوی صاحب ہم دو تین گھنٹے میں تاؤ بچن جائیں گے؟"۔

"دو تین گھنٹے میں تاؤ بچن جائیں گے؟ کیوں نہیں بچن جائیں گے" مولوی رحمن سرہلا کر بولا۔

"اگر ہم دو تین گھنٹے میں تاؤ بچن جاتے ہیں تو آج یہ قبری میڈو کے لیے

روانہ ہو جائیں گے۔" مطیع کرنے لگا۔

"پہلے تاؤ تو بچن لیں۔"

"تاؤ تو بچن کے۔" رحمن نے جیسی کہن اخاتے ہوئے ہمیں فوید دی "اس

پہاڑ کے دوسری طرف تاؤ ہے۔"

ہم نے خاصی دیر پڑھنے اور چھٹنے کے بعد جب بھی مزکر دیکھا۔ وہاں رائے کوٹ کا پل اور دریائے سندھ نظر آتا تھا صرف ان کا سائز چھوٹا ہوتا جاتا تھا اور ہم ان دونوں سے بے حد ہزار ہوئے کیونکہ جانتے تھے کہ یہ ہمارے سفر کے آغاز کی ملائیں ہیں اور جب یہ نظروں سے او جمل ہوں گی تب دوسری جانب منزل وکھائی دینے کی آس بدرھے گی۔ دیسے یہ ایک شاندار منظر تھا جو صرف ہم جیسے جیالوں اور گدھوں کی تrest میں ہی لکھا تھا۔ اس بلندی سے اب شاہراہ ریشم فاصلے کا شکار ہو کر چنانوں کا ایک حصہ بن چکی تھی اور مشکل سے ہی نظر آتی تھی۔

وھوپ میں تھیزی کے آثار تھیزی سے نیالیاں ہوئے گئے۔ اس میں چبیں تھیں۔ بیچے سندھ کے دائیں جانب بلندی پر ایک وسیع میدان تھا جس میں ایک پر بچن راستہ دور تک جاتا تھا اور یہ استور روڈ تھی۔ دیسے ہم خوش قسم تھے کہ آج آہان بالکل خالی نہ تھا بلکہ کہیں کہیں پلکے پلکے بادل تھے۔ راستہ زیادہ خطرناک تو نہیں تھا لیکن احتیاط سے چلانا پڑتا تھا۔ ایک پتھر کے ساتھ لگ کر ذرا سستانے لگا تو پیچھے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، رائے کوٹ پل نظروں سے او جمل ہو چکا تھا۔ یہاں سے ایک راست مٹھائی کے گاؤں کو جاتا تھا۔ ہم پھر پڑھنے لگے۔ لیکن اب ہماری حالت بہت دگر گوں ہو چکی تھی۔ کم از کم میں بے حد تھک چکا تھا۔ میرے گھنٹے بے جان ہو چکے تھے، آنکھیں کھلی نہ تھیں اور ہاتھیں اٹھتی نہ تھیں تب مطیع نے پھر شیطانی نہیں ہنستے ہوئے کہا "تارڑ صاحب بورڈے ہو گئے ہو۔"

"ہاں۔" میں نے سرہلا بیا۔

"رو گئے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے بیٹھکل اپنے ٹھنے پر قابو پایا "لیکن میں پہاڑوں کے ساتھ مقابلہ کرنے نہیں آیا۔" میں نے قبری میڈو پہنچنا ہے اور میں انشاء اللہ پہنچ جاؤں گے۔ چاہے تم سے دو گھنٹے بعد پہنچوں۔"

"میں آہستہ چلتا ہوں۔" اس نے دیکھش کی۔

"نہیں تم اپنی چال چلو میں اپنے چال چلتا ہوں۔"

رہا تھا۔ ہم اس جہاز کو منہ کھولے ہاپنے ہوئے اتنے اشتیاق سے دیکھنے لگے جیسے یہ
ابھی بولڈر رج کے ان دیکتے ہوئے پتوں پر لینڈ کرے گا اور ہمیں اس عذاب سے
دور لے جائے گا۔

”مجھے یقین ہے کہ اس لمحہ پانٹ پرے شتر لجے میں اعلان کر رہا ہو گا کہ خواتین و
حضرات ہم اس وقت نالگا پرست کی وادی کے اوپر سے گزر رہے ہیں ذرا نیچے واکس
دیکھئے، دریائے سنہ کے ساتھ ہو چٹانی سلسلہ ہے۔ اس کی بلندی پر۔ اور ہو یہ کون
بے دوقوف کھڑے ہیں۔“

مطیع پہنچنے لگا۔ ”ویسے میں جہاز میں سوار مسافروں کو ہاتا چاہتا ہوں کہ خدا کے
لیے کوئی بھی اور ہر کوئی آئے۔ فیزی میڈو کی جانب رخ نہ کرے۔“

”تو ہاتا دے۔“ میں نے پیسے سے پھرستے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔
”اوے بھائی مسافرو۔“ مطیع جمعِ مخ پر ہاتھ رکھ کر گلگت کی جانب رکھتے
جہاز کو چاہب کرتے ہوئے چھیننے لگا۔ ”پانٹ کی پاتوں کا اعتبار نہ کرنا۔ دل دھتا ہے رو
رو دہائی کوئی کسی سے پمار نہ کرے اور کوئی تارڑ صاحب کی پاتوں میں نہ آئے۔
اوے لوگوں میں مارا گیا میں لوٹا گیا۔“ فیزی میڈو دیکھنے کے چاؤ میں میرا کچور نکل
گیا۔“

رحنمن جو زر آگے جا چکا تھا مطیع کی جنگ و پکار سن کر واپس آگیا۔
”یہ پاگل ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ پاگل ہو گیا ہے؟ اچھا یہ پاگل ہو گیا ہے۔“ رحنمن جیران بھی ہوا اور میں نے
نوٹ کیا کہ اس کے بعد وہ مطیع سے زر ایک محفوظ قاسطہ پر رہنے لگا۔
جہاز نظروں سے او جمل ہوا تو ہم پھر نارمل ہو گئے اور چلتے گئے۔
”ویسے تارڑ صاحب ایک بات ہاتا میں اور جمعِ تھا میں۔“
”جو کوئوں کا جم کوئوں گا۔“

”میرے والد صاحب سے آپ نے مسجد میں ورنی تعلیم حاصل کی تو کیا وہ آپ
کی پانی کیا کرتے تھے، آپ پر ٹلم و ستم کے پہاڑ و غیرہ ڈھاتے تھے۔“
میں چوک گیا۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ اللہ بنیتے مولوی صاحب مجھے بے دریغ
نزو کوب کیا کرتے تھے۔ ”نسیں بالکل نہیں۔ بس بھی کبھار ترگ میں ہوتے تھے تو
وہ میں پھر لگا دیا کرتے تھے لیکن تم کیوں پوچھتے ہو؟“

اور بالآخر تم اس وسیع چنانی سلطے کی آخری بلندی تک بکھنے لگے۔ یہاں تکہ
ویرانی تھی، سوائے دھیرے دھیرے گرم ہوتے ہوئے پتوں، گدوں کے نثانوں اور
تیزی سے اس پتھر سے نکل کر دوسرا پتھر میں پوشیدہ ہوتے ہوئے گرگنوں اور کرلوں
کے اور کچھ نہ تھا۔ ہاں بلندی تو تھی۔

”تاؤ کمال ہے۔“ مطیع نے پوچھا۔
”تاؤ کمال ہے یہ اور ہے۔“ رحنمن نے ایک چھوٹے سے راستے کی طرف
اشارہ کیا۔ ”ادھر تاؤ ہے۔“

ہمارے واکس جانب پیچے تاؤ تاہل تھا جسے ہم عبور کر کے آئے تھے اور ہو یہاں
سے دکھائی نہ دھتا تھا۔ اور نالے کے پار دوسرا پہاڑ پر ری گیڈیتھر اسلام خان کی کپی
سرک دکھائی دیتی تھی۔ اور وہ خطرناک مقام بھی دکھائی دیتے تھے جہاں بکھن کر سرک
انتظام پذیر ہو جاتی تھی کیونکہ راستے میں اتنا بڑا پتھر ہوتا تھا کہ اسے ہٹانا یا بارود سے
توزنا بھی آسان نہ تھا۔ انہی مقلات پر سے مسافر حضرات سرک چھوڑ کر نیچے اترتے
تھے اور تاؤ نالے میں گرنے کا خطرہ مول لیتے تھے۔ سرک پر کہیں کہیں کام ہو رہا تھا
اور دو تین مرتبہ بارود کے نوردار دھماکے بھی پہاڑوں میں دیر تک اپنی آواز برقرار
رکھے گوئے رہے۔

پتھر اسے گرم ہو پکے تھے کہ ہم ان کا سارا لینے کے لیے ہاتھ رکھتے تو
اگلیاں تیش سے جل اٹھتی۔ آنکھوں میں بیہدہ اور اس آبی پردے کے پار پہاڑ اور
سورج اور پتوں میں چلتا مانیکا۔ کچھ ایسے پتھر تھے جن پر تھل اور پچھناہٹ کے
آثار تھے اور یہ تھل بھی دھوپ میں گرم ہو رہا تھا۔ ہماری واٹر سپلائی بھی تیزی سے کم
ہو رہی تھی اور جو پانی رہ گیا تھا وہ بے حد گرم ہو چکا تھا اور اس میں پلاسٹک کی بو
ٹھی۔ میں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ قاسٹے اور وقت کے بارے میں ہم رحنمن کا اعتبار
نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے تاؤ۔ ”وہ اور ہے۔“ تھا اور تاؤ میں نظر نہیں آتا
تھا۔ اس راستے کی ویرانی مثالی تھی۔ ہم نے سارے دن کے سفر کے دوران اس
ڑیک پر کسی ذی روح کو نہ دکھا۔ اور ہر ہالی کا ایک پتہ تک نہ دکھا۔ بعض
مقامات پر ہم قدم خان کے گدھے کی چھاؤں میں بیٹھ کر آرام کرتے۔ اور چھدرے
بادلوں میں سے ایک شامسا آواز آئی۔ ہم خلک بیوں پر زبانیں پھیرتے اور پیٹ
پوچھتے اور دیکھتے گئے۔ پی آئی اے کا توکر فریڈ شپ طیارہ اسلام آباد سے گلگت جا

ہو رہی تھی۔

"تارڑ ساحب آپ کیوں اچھی بجلی زندگی چھوڑ کر اس حرم کی بھروسی پر آتے ہیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی خوار کرتے ہیں؟۔۔۔" مطیع پہنچ پوچھتے ہوئے کہنے لگا "آج کا تجربہ کیسا ہے؟"

"بہت ہی ہولناک۔۔۔ میرے لیے یہ تریک اتنا دشوار ہے، اتنا قاتل ہے کہ۔۔۔ میں دوبارہ تو نہیں آؤں گا۔۔۔"

"اور اگر فیری میڈو بہت ہی خوبصورت لکھا پھر بھی نہیں آئیں گے۔۔۔" "یہ ممکن نہیں کہ کوئی بھی جگہ اتنی خوبصورت ہو کہ اس کے لیے اس حرم کی خوناک مسافت طے کی جائے۔۔۔ فیری میڈو کتنا خوبصورت ہو سکتا ہے۔۔۔" ایک ہی مقام پر زیادہ دیر پہنچنے سے ہمارے بدن ذرا نارمل ہو گئے اور تحکماں خشنڈی ہو کر زیادہ دکھ دینے لگی۔

"مولوی صاحب تاؤ کتنا دور ہے؟" مطیع نے کپڑے جھاڑتے ہوئے پوچھا۔ "ہم مسلمان۔۔۔ تم مسلمان۔۔۔ تم ہمارا بھائی۔۔۔ تاؤ اور ہے" رحم نہایت خشوع و خضوع سے بولا۔۔۔

"بہت بہت شکریہ" ہم دونوں نے جھک کر اور پھر چلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم جیسے کسی دوسرے سیارے میں کسی دوسرے وقت میں سز کرتے تھے جہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ایک وسیع دریافتی پہاڑی کے ساتھ چمنا ہوا جنک پتھا ہوا راست اور ہی اوپر۔۔۔ گرگٹ۔۔۔ تاؤ نالے کی گندھک کی بوئے راستے پر پڑی ہوئی میکنیاں۔۔۔ اور ہمارا نہیں بدن پر چلتا ہوا اور رنگلتا ہوا۔۔۔ رحمن ہم سے چند قدم کے فاصلے پر جا کر رک گیا اور ہمیں آگے آنے کا اشارہ کرنے لگا۔۔۔ ہم بمشکل تمام اس کے پاس آئے تو کہنے لگا "ادھر ناگا پرست"

ادھر ناگا پرست تھی۔۔۔ ہم نے اسے بیزاری اور کچھ غرفت سے دیکھا۔۔۔ نیک ہے، ہو گی ناگا پرست، ہم کیا کریں۔۔۔ البتہ اس کی قربت میں کچھ ہر ہالی سی نظر آئی۔۔۔ لیکن وہ بہت دور تھی۔۔۔

"ادھر تاؤ۔۔۔" رحمن کرنے لگا۔۔۔ "ادھر" "ہو گا۔۔۔" میں نے آتا کر کرنا "جب دہاں پہنچیں گے تو پھر کرنا کہ ادھر تاؤ۔۔۔"

"مجھے کافی دیر سے ایک عجیب و غریب خیال نکل کر رہا ہے۔۔۔ کہ آپ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے یہاں لائے ہیں تاکہ آپ ان بھروسیوں کا بدھ لے سکیں جو آج سے چالیس برس پہنچر قبلہ والد صاحب نے آپ کو لگائی تھیں۔۔۔ ورنہ کسی بھی شریف آدمی کو ایسی جگہ لائے کا کوئی ہواز نہیں بنتا۔۔۔" اور مطیع صاحب یہ ٹھنگو ہری سنجیدگی سے کر رہے تھے۔۔۔ لگا تھا کہ تحکماں اس پر بھی اڑانداز ہو رہی ہے۔۔۔ اس کی چلبلاہت میں کمی الواقع ہو چکی تھی اور اس نے کافی دیر سے "تارڑ صاحب رہ گئے ہو؟" کا نعرو بھی نہیں لگایا تھا۔۔۔ ہم سائے کے لیے بھروسیوں کے ساتھ ہو کر چلتے تو ان میں سے خارج ہونے والی پیش بے حال کرتی تھی۔۔۔ میرے وہم و مگان میں بھی نہ تھا کہ فیری میڈو جانے والا یہ راستہ اتنا تکلیف دہ اور چان لیوا ہو گا۔۔۔ ایک فرانسیسی سیاح نے اس کے پارے میں درست کہا تھا کہ یہ راستہ نہیں قتل ہے۔۔۔

"اوے رحمن تاؤ کہاں ہے؟۔۔۔" مطیع بار بار پوچھتا اور وہ "تاؤ کہاں ہے؟ تاؤ ادھر ہے" کہ کر چلتا جاتا۔۔۔

دوپر کے کھانے کے لیے ہم ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہو کر بینہ گئے۔۔۔ بلکہ ذہیر ہو گئے۔۔۔ اور دوپر کے کھانے کے لیے ہمارے پاس ایک کیک کے چند گلے اور جوس کا ایک ڈبہ تھا۔۔۔ ہماری منصوبہ بندی کے تحت ہمیں دوپر کے کھانے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ ہم نے دوپر کو تاؤ چنچ جانا تھا۔۔۔ اور ہم کہیں بھی نہیں پہنچ سکتے۔۔۔ تاؤ نالے سے گندھک کی بو باقاعدگی سے آ رہی تھی۔۔۔ یہ راستہ جو پہاڑی کے ساتھ میں کھانا، الحتا بیٹھتا چلتا جاتا تھا بس چلتا ہی جاتا تھا۔۔۔ اس پر ایک گدھا اور ایک سیاح آگے پہنچے تو ہل سکتے تھے البتہ شانہ پر شانہ چلنے سے دونوں میں سے کوئی ایک جو نالے اور کھانی کی جانب چلتا ہو، نالے اور کھانی میں با آسانی ہنچ سکتا تھا۔۔۔ میری نظریں چند قدم دور راستے کے اس حصے پر ہیں جو بالکل ایک یہ زمیں کی طرح اور جا رہا تھا اور دوسری جانب سے دکھائی ہی نہیں رہتا تھا۔۔۔ ہمارا لمحہ بے حد گرم تھا۔۔۔ ہوں نے چائے کا مزا دیا۔۔۔ رحمن نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں کچھ فاصلے پر ایک پتھر میں بارش کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور اگر کسی گدھے نے اسے پی نہ لیا ہو تو وہ اسے ہمارے پیٹے کے لیے لے آئے گا اور یہ پانی بے حد جنک اور شیریں ہو گا۔۔۔ ہمارا پانی یعنی جمی کہنی کا پانی، تقریباً اٹھنے کو تھا اور اس میں پلاسٹک کی بواب ناقابل برداشت

"اخویار تاوب آئے والا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ نیند میں ڈلتا ہوا بولا "تاو بھی نہیں آئے گا۔"

اس کے چہرے پر بچوں جیسا اطمینان تھا، گھاس کا ایک تکا اس کے نخنوں میں جاتا تو وہ سر جھک کر بڑیا تما۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا کہ شاید وہ اٹھ کر بیٹھ جائے لیکن وہ مزے میں تھا اور اس کی نیند گمراہی ہو رہی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اسے وہاں سوتا ہوا چھوڑ کر آگے نکل جاتا۔ پڑھنی کیسا دریانہ تھا، کیسا علاقہ تھا اور یہاں کیسے کیسے چانور رات کو گھومنت تھے۔ میں نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر جب تھوڑا تو وہ سر جھک کر بڑیا تھا لگا "نہیں جاؤں گا۔ تم چلے جاؤ۔"

"مطیع۔" میں نے اس کے رخادروں کو زرا شدت سے تھپکا۔ پھر کندھوں سے جھکتا۔ خاصی مشقت کے بعد وہ بیدار ہوا اور ہر ہی سماجت کے بعد وہ چلنے پر راضی ہوا۔ لیکن اب وہ توانا ہو چکا تھا۔ ہمارا علاقہ ختم ہونے پر کچھ گھیت دکھائی دیئے اور ہم یقینے اترنے لگے۔ کھینتوں کے ساتھ ایک لمحہ درہ نمائانہ تھے میں چند گھرتے نیالے اور ہمارا چھتوں والے۔ گندھک کی بو بھی قریب آگئی، میں تا تو تھا۔

یہیں کہیں وہ چشمہ تھا جس میں پانی مجھ ہو رہا تھا۔ قطرہ قطرہ۔ رحمن اپنی پشت سے مسلمان اتار کر اوپر گیا اور آدھا کپ پانی لے آیا "بس اتنا ہے" اور پانی واقعی ہمارے جو بھی کہن کی نسبت تھا۔

اب ہماری آنکھوں میں بھی تھکاوٹ اور اس سے نوٹ کر گرنے والا تھا۔ اسی لیے میں صرف سامنے دیکھتا تھا، راستے کی جانب اور قدم اٹھاتا جاتا تھا اور اگر قدموں کی جانب دیکھتا تو یقیناً میرے قدم وہیں ڈھیر ہو جاتے۔ ٹھیکاں میرے چہرے پر بجھنا نہ گئیں۔ اور ان کھیندوں کی بجھناہٹ میرے لیے موہیقی سے کم نہ تھی کیونکہ یہ ظاہر کرتی تھی کہ ہم کسی الکی جگہ کے قریب ہو رہے ہیں جہاں زندگی ہے۔ تالگا پرست کی قربت کی ہراویں کا ٹھیکا ڈرا ڈرا ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ یہاں ہم اس پہاڑی راستے کے چکل سے آزاد ہوئے۔ آگے فہرنا ہمارا ختم کی جگہ تھی۔ اور ہم نے کتنے زانوں سے یہ دونوں چھیڑیں نہیں دیکھی تھیں۔ رحمن کا کہنا تھا کہ اب ہم تا تو میں تھے۔ سامنے سے ایک چھوٹا سا پچھہ گدھے پر سوار ناک پوچھتا ہوا آ رہا تھا۔ اس گدھے کو اور پچھے کو دیکھ کر رحمن بے حد خوش ہوا کیونکہ یہ دونوں اسی کے تھے۔ مولوی صاحب کی نیکم نے اس کے لیے اپنے آٹھ بچوں میں سے ایک کے ہاتھ کھانا بھیجا تھا۔ رحمن نے چلتے چلتے دستِ خوان میں جو کچھ بھی لپیٹا تھا وہ تگلا اور پھر کئنے لگا تھم آؤ میں بچنے کر تھا۔ میں تو دور دور نکل کسی گاؤں کا مسلمان۔ میں اور مطیع اب بڑے حالوں میں تھے۔ میں تو دور دور نکل کسی گاؤں کا ہم و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ سوlut تھی کہ چھ عالی ختم ہو پچھی تھی۔ تھکاوٹ کا یہ حال تھا کہ ہماری چھڑیاں بھی زمین پر چینے سے ٹاگوں کی طرح لرزتی تھیں۔ مطیع نے ٹھیک گھاس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے پاس بچنے کر آس پاس دیکھا اور چھڑی پھیٹک کر لیت گیا "میں آرام کرنا چاہتا ہوں"۔

میں تو بہانہ حلاش کر رہا تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ تقریباً نیند میں تھا "میں سونا چاہتا ہوں" وہ بڑیا یا۔

"اخویار۔" میں نے سکرا کر کہا۔ "نہیں۔" وہ فسے سے بولا "مجھے چھوڑ دو۔" میں اب نہیں اٹھ سکا۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں" میں سونا چاہتا ہوں"۔

دور کر دیتی تھی۔ لیکن یہاں تو کیفیت کچھ اور تھی۔

رحمٰن چارپائی پر بیٹھا گاؤں والوں کی جانب فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ ہم اس کے مسان تھے۔ اس سفر کے دوران وہ بار بار ہمیں اپنی نسلی برتری کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہا۔ ”میں کو متالی نہیں...“ وہ سینہ ٹھوک کر کہتا ”میں پختون ہوں اور اورہ روزگار کے لئے آیا ہوں... یہ تو جنگلی لوگ ہیں...“

آپ چائے پیو گے یا لئی؟“ اس نے پوچھا۔

”لئی؟“ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے خلک گلے میں اور زبان کی کڑواہٹ پر لئی کا لفظ ایک لعنتی آثار کی طرح ”گرا“ کیا واقعی؟“

اس نے یکے از پیکان کو کچھ کما اور وہ پچھے سیڑھیاں اڑ کر سجن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پچھے آیا تو اس نے ڈالڈا کا ایک نہیں اندا رکھا تھا۔ ”بھوپا!“ رحمٰن نے وہ نہیں دنوں ہاتھوں سے تھام کر میرے آگے کر دیا۔ یہ دراصل لئی نہیں بلکہ دی تھا۔ لیکن یہاں یہ لئی تھی کیونکہ شمالی علاقوں میں وہی کو لئی پکارا جاتا ہے۔ ڈالڈے کا نہیں اسی لئی سے لبرز تھا اور اسے پہنچے میں صرف یہ قباحت تھی کہ اس کی سفید سُلٹ پر چند کھیاں مردہ حالت میں تھی ہوئی تھیں۔ میں نے جب لئی پر جنگ کر اسے کچھ دیر کے لئے غور سے دیکھا تو رحمٰن جان گیا کہ کیا مسئلہ ہے اور اس نے فوراً اپنی چھوٹی انگلی سے ان کو جن چن کر کھلا اور پھیک دی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ صرف سلطی عمل ہے اور لئی کے اندر بھی اس حرم کے ذخائر موجود ہوں گے لیکن۔۔۔ میں پیاسا تھا۔۔۔ میں نے آنکھیں بند کر کے دل میں بسم اللہ پڑھی اور نہیں کو لوں سے لگایا۔۔۔ یقین بچھے میں نے لاہور کے رائل پارک یا گومنشی میں بھی اتنی شیرس سے لگایا۔۔۔ اتنی زندگی بخش لئی نہیں پہنچی۔۔۔ اس لئی نے میرے تحکاوت کو ختم کر دیا اور سفر کے دوران جو سرورد شروع ہوا تھا اس کا خاتمہ کر دیا۔۔۔ چند بچے تام جیمنی کی ایک تحالی میں مشتوت جا کر لے آئے جو ہم نے رفتہ سے کھائے۔۔۔ پھر رحمٰن کا پچھے ساگ سے بھری ہوئی ایک پلٹٹ اٹھائے بیچے سے آیا۔۔۔ اس کے ساتھ روٹی بھی تھی لیکن نہ ہم یہ ساگ کھائتے تھے اور نہ ہی یہ روٹی۔۔۔ ساگ میں پانی تھا اور صرف ابلا ہوا تھا اور روٹی شاید باجرے کی تھی اور ہم بھوک کے باوجود بھی اسے نہ نگل سکے۔

نگک درے کی جانب سے ایک فضی تیزی سے چلتا ہوا آ رہا تھا اور اس کے پیچے اس کا ایک ملازم اس کے قریب وچھتے کی کوشش میں ہانپا ہوا چلا آ رہا تھا۔۔۔ یہ فضی بر گینڈر اسلام کا نشی تھا جو کسی جنگل کی خریداری کے سلسلے میں اوپر گیا ہوا تھا۔

”تاؤ کے گرم چشمے“

کھیتوں کے درمیان میں تاؤ کے گردھ کے چشمے کا تقریباً ابلا ہوا پانی ایک نالی میں بس رہا تھا اور اس پر بھاپ اٹھتی تھی۔۔۔ اسی گرم پانی کی منابع سے گاؤں کو تاؤ کما گیا۔۔۔ اور یہی پانی جب ہانگار پرست کے رائے کوٹ گیشیر سے آنے والے نالے میں شامل ہوتا ہے تو یونچے رائے کوٹ پل تک اس میں گردھ کی بو شامل ہو جاتی ہے۔۔۔

”یہ گرم ہے۔۔۔“ مطیع نالی کے کنارے بینڈ گیا۔

”یہ بہت گرم ہے۔۔۔“

”اٹا بھجی کیا گرم ہو گا۔۔۔“ اس نے پانی میں انگلی ڈالی اور ”ہائے اوئے“ کہہ کر بھیخ لی ”گرم ہے بھجی۔۔۔“

کھیتوں کی میندھوں پر چند بچے نہیں دور سے آتا دیکھ رہے تھے۔۔۔ یہ بچے خیالات کی پرواز سے آگے نکل گیا تھے اور ان کے ناک بھرے ہوئے تھے۔۔۔

گاؤں کا پسلا گمراہ رحمٰن کا تھا۔۔۔ گمراہ کیچھی چھت اس پیڈنڈی کی سُلٹ پر تھی جس پر ہم آ رہے تھے۔۔۔ چھت پر ایک پرانی اور ایک چارپائی ہماری مختصر تھی۔۔۔

مشتوت کا ایک بڑا درخت اس پر جملکا ہوا تھا۔۔۔ رحمٰن ہماری حالت دیکھ کر ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا آؤ آؤ تم مسلمان۔۔۔ ہم مسلمان۔۔۔ ہم آ رہا تھا اور صرف ابلا ہوا تھا میرا دل بیٹھنے لگا۔۔۔ اس گاؤں میں اور اس کے آس پاس بھی ایک وحشت ہی تھی۔۔۔

ایک اجڑپن اور اس سے آگے کچھ نہیں ہے،۔۔۔ والی کیفیت۔۔۔ روکے سوکے گمراہ اور بے آباد چھرے۔۔۔ یہ ہم کہاں آگے ہیں۔۔۔ بیویش جب راستے ویران اور مشکل تھے،۔۔۔

تب ان کے آخر میں کوئی بستی ایسی آ جاتی تھی جو ساری تحکاوت اور سافت کی اواسی

اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے تا تو آیا تھا۔ اس نے کہ تاؤ ایں کا گھر تھا ورنہ کراچی
چھوڑ کر تاؤ میں گرمیوں کی چھٹیاں کون گزارتا ہے۔ دوسرا خوشحال خان تھا جو نیک
ن تھارے کوئی تھا اور خوش مزاج بہت تھا۔

”ہم نے سنا کہ آپ آئے ہوئے ہیں تو ہم آپ سے ملتے آ گے۔ ہم اور جل
میں رہتا ہے۔“ خوشحال خان بولا۔

”کون سی جیل میں“ مطیع ہٹنے لگا۔

”جیل ہمارے گاؤں کا نام ہے۔ اسے ہم لوگ سبیل کہتے ہیں۔ آپ لکھتے ہو
تھے؟“ پھر وہ مجھ سے تھاتب ہوا۔

”آپ کو کیسے پا چلا کہ میں لکھتا ہوں؟“

”آپ کا پیغام آیا تھا نگور صاحب کے نام۔ کہ آپ گلگت سے رائے کوٹ
آؤ گے۔ تو میں نے کہا یہ پھض تو وہی ہے لکھنے والا۔ تو آپ فیری میڈو پر کتاب
لکھو گے؟“

”شاید۔“

”وہ جگہ بہت خوبصورت ہے اور ہر کوئی اس پر کتاب لکھتا ہے۔ آپ تاؤ کے
بارے میں لکھو گئے۔“

”کیا لکھوں؟“

”یہ لکھو۔“ اس نے کبل میں سے چند کاغذات نکال کر میرے سامنے رکھ
 دیئے۔ ”یہ میں نے آپ کے لئے لکھا ہے کہ آپ باہر کی دنیا کو تباہ کر تاؤ میں
 لوگوں کو بہت مشکلات ہے۔“

”لیکن میں اس قسم کی کتاب نہیں لکھتا۔“

”تو کس قسم کی کتاب لکھتا ہے؟ جس میں لوگوں کی مشکلات کا ذکر نہ ہو اور
صرف خوبصورت جگہ کا بیان ہو۔“

یہ خوشحال اتنا بھولا کو مستانی نہ تھا جتنا میں اسے سمجھا تھا۔ میں نے کافی
لئے لاثین کی ناکافی روشنی میں ان پر جھکا۔ یہ تاؤ کے محل و قلع، تمذیب و
ثافت اور مشکلات وغیرہ پر ایک تفصیل رپورٹ تھی اور دیپھی سے غالی نہ تھی۔
خوشحال خان رائے کوئی کی روپرست کا عنوان تھا ”رائے کوت“ تھا۔ اور اس کا خلاصہ
کچھ یوں تھا۔

”ہمارے گاؤں کا نام متوجہ کیوں رکھا گیا یعنی وجہ تھی۔۔۔ ہمارے گاؤں کے

”خیر لگنے کے لئے کون سی جگہ مناسب رہے گی؟“ میں نے رحمن سے
پوچھا۔

”کون سی جگہ؟۔۔۔ جگہ کیوں نہیں۔۔۔ اور سکول کے سامنے نالے کے
ساتھ۔۔۔“

”تو پھر پھیں۔۔۔ میں بے حد تھکا ہوا ہوں۔۔۔“

گاؤں کے کمیت یہاں پہنچ کر قائم ہو جاتے تھے۔ یہاں صرف اتنی جگہ تھی کہ
تاؤ تالہ اور پسے نیچے آئے اور اس کے سامنے پرانی سکول کی عمارت ہو اور تھوڑی
یہ کھلی جگہ ہو۔۔۔ اس کے سوا دونوں جانب پہاڑ آپ پر ٹنک ہوتے تھے۔ رحمن اور
قدم خان کے والد نے مل کر خیر لگایا۔۔۔ اور مجھ سویرے واپس آنے کا وعدہ کر کے
چلے گئے۔۔۔ شام ہو رہی تھی۔۔۔ یہاں تاؤ نالے کا شور نہ تھا صرف ہلکی سی آواز
تھی۔۔۔ مطیع خیطے میں لیٹ گیا اور میں ایک پھر پر بیٹھ کر ڈاڑھی لکھنے لگا۔۔۔ ایک ٹنک
دورہ نما جگہ میں جہاں گھنٹن کا احساس ہوتا تھا۔۔۔ جہاں سے ہم آئے تھے اور جہاں تھا اور
کی چونی نظر آتی تھی جو یہاں سے سیکھوں میں دور تھی اور جہاں ہم نے جانا تھا اور
درے کے نالے کے پر نالٹا پرست کا ایک حصہ نمایاں ہو رہا تھا۔۔۔ اور ہم ان دو عظیم
چھٹوں کے درمیان ایک ویران گاؤں میں خیر زان تھے اور شام ہو رہی تھی۔۔۔

ابھی اندر ہمراہ کھلی خیس ہوا تھا جب رحمن ایک لاثین اخھائے چلا آتا تھا۔۔۔ ہم
مسلمان۔۔۔ تم مسلمان۔۔۔ تم ہمارا بھائی۔۔۔ تمہارے لئے لاثین۔۔۔ اس کے ہمراہ گاؤں
کے دیگر معززین بھی تھے جو ہم سے ملتے کے لئے آئے تھے۔۔۔ جیسے ہنگاب کے دیبات
میں کھانے کے بعد رات کے وقت دوستوں اور بزرگوں کی میٹنگ ہوتی ہے۔۔۔ ان میں
فریدوں خان بھی تھا جو گاؤں کے نبوار نگور کا بھائی تھا۔۔۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس
کے بھائی کو اگرچہ اکرام بیگ کا پیغام مل گیا تھا لیکن وہ رائے کوٹ پل پر جیپ لے کر
اس نے آسکا کہ شاہزادہ ریشم پر ایک ٹرک انڈس میں گر گیا تھا اور وہ مرنے والوں
کی لاثین جیپ میں ڈال کر چلاس چھوڑنے گیا تھا۔۔۔ یہاں ممتاز خان بھی آیا اور
ہمارے لئے چند اندھے ٹھنے کے طور پر لایا۔۔۔ لاثین درمیان میں رکھی ہوئی تھی اور
ہم سب حلقة بنائے اس کے گرد بیٹھنے ہوئے تھے۔۔۔

دو سائے درے کے اندر ہمراہ میں سے الگ ہوئے، ہمارے قریب آئے اور
لاثین کی روشنی کی زد میں آئے تو وہ نوبوان چڑے نہ تھے اور وہ بھی ہمارے قریب بیٹھ
گئے۔۔۔ ان میں سے ایک اکبر حسین تھا جو کراچی کے کسی کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا

اس لمحے سب لوگ کو شوش کرتے ہیں۔

زیورات سب زیورات چاندی کے ہوتے ہیں۔ یہ زیورات ہماری عورت کی ٹوپی پر استعمال ہوتے ہیں جو پانچ دس ہزار کے ہو سکتے ہیں۔ ان زیورات کے ہم ہماری زبان میں یہ ہیں۔

تو مر یہ تقریباً ہیں تو لے سے زیادہ کا ہوتا ہے۔ دو بندوق ہوتے ہیں ان کے علاوہ سولہ کی تعداد میں مزدک ہوتے ہیں۔ گلے کے لئے "غیرے" پہننے ہیں۔ پینا پیدا ہوا تو رسم۔ جب ہمارے ہاں پینا پیدا ہوتا ہے تو اپنے قریبی رشت داروں کے سب تجھ ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب جب پچھے کے کان میں اذان پڑھتا ہے تو ہمارے لوگ سب سے پہلے اس پچھے کے کان سے گوش گزار بندوق کی فائز کرتے ہیں۔ اور سب مر آ کر فائز کرتے ہیں اس طرح تقریباً سو ڈریڈھ سو فائز کرتے ہیں۔

پسندیدہ مشغل۔ ہمارے لوگوں یا مردوں کا پسندیدہ مشغل شکار کھلنا ہے۔" تاؤ کی رات آہست آہست سرد ہونے لگی اور لوگ اٹھنے لگے۔ اور وہ رات بے حد سرد تھی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ہم کسی گلیشیر پر خیمہ زن ہیں۔ لیکن شدید سردی کے باوجود ہم ہر شے سے بے خبر سوئے جیسے ایک شہری جماں پڑا ہوتا ہے دہاں پڑا رہتا ہے، ایسے ہم جس کوٹ لئے اسی کوٹ پر سوتے رہے۔ ہم نے بولڈر رنج کو عبور کیا تھا ایک پتھر لیے صراکو پار کیا تھا اور ہم فیزی میڈو جا رہے تھے۔

صحیح کی سفیدی پھیلی تو میں جاگ گیا۔ اور اسی لمحے رہن کا باریش چڑھنے کے کا پروہ اخفاکر نمودار ہوا "ہم مسلمان۔ تم مسلمان۔ تم ہمارا بھائی۔ انھوں فیزی میڈو چلو"

شروع میں گرم پانی کا ایک چشمہ واقع ہے۔ مقابی لوگ اس پانی کو تماں دیئے کرتے ہیں جس کے معنی گرم پانی کے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ہمارے گاؤں کا ہام ممتوہ رکھا گیا۔

گرم پانی کی چند خصوصیات۔ اس میں نہانے سے ہمارے لوگ شفا پاتے ہیں یا جن لوگوں کے جوڑوں میں درد ہوتی ہے یا کر میں درد ہوتی ہے تو وہ لوگ اس پانی میں جو کہ ایک چھوٹی سی تالاب بنی ہوئی ہے، اس میں چند منٹ کے لئے ڈوبے بیٹھنے ہیں۔ اس کے علاوہ موٹے آدمی اور بانجھ عورتیں شفا پاتی ہیں۔ جماں سے یہ پانی لکھا ہے وہاں کی مٹی سخت اور سفید رنگ کی ہے۔ اس پانی میں جماں سے پانی باہر لکھا ہے کوئی سخت چیز اندر ڈالو تو پک کر باہر آتی ہے۔ اس پانی کو لیبارٹری نیٹ کے لئے لے کر گئے ہیں۔

تعلیٰ معیار۔ تعلیٰ معیار صفر کے برابر ہے۔ ہم لوگ جیب سے چندہ کر کے ایک ماشراستور سے پکڑ کر لائے تھے۔ علاج معاملہ کا بندو بست۔ جب ہمارا کوئی آدمی نیکار ہوتا ہے تو اس کو سڑپچھہ پر لٹا کر کندھوں پر اخفاکر میں روٹنک پہنچاتے ہیں۔ وہاں سے ٹلکت علاج کو لے جاتا ہے۔

قومیت۔ عام طور ہمارے علاقے میں دو بڑی قومیں ہیں (۱) شین (۲) میکن۔ شین قوم اعلیٰ ذات ہے۔ ہمارے علاقے کا زبان شینا بھی شین قوم کے ہام پر منسوب ہے جو ہماری ماوری زبان ہے۔

عام پیشے۔ کھتی پازی اور موٹی پالنا۔ ایک ایک گرانے کے پاس تقریباً سو دو سو بھیڑ کھوان اور گائے نیل ہوتے ہیں۔

شادی یاہ کی رسوبات۔ ہمارے ہاں شادی کی رسوم سادہ ہیں جس میں لڑکے اور لڑکی کی پسند اور ناپسند کو دھل جیسے۔ ملنکی کے لئے لڑکی والے لڑکے والوں سے اپنی بیٹی کے عوض ایک کیسر رقم طلب کرتے ہیں جس کو مقابی زبان میں "ٹپ" کہتے ہیں۔ یہ رقم پانچ، چھ ہزار روپے سے لے کر پچاس ہزار تک ہوتی ہے۔ پھر سال دو سال بعد شادی کی تاریخ مقرر ہوتی ہے اور لڑکے والے ٹپ کی رقم ادا کرتے ہیں جس کے ساتھ لڑکی والے زیورات اور کپڑے وغیرہ بناتے ہیں۔ شادی کے دن لڑکے والے ہاجا والوں کو بلاستے ہیں۔ جو شیئے جوان ہاتھے ہیں۔ پھر نکاح زبانی ہوتا ہے۔ بعض اوقات تقریباً پچاس فٹ اونچے ایک ڈنڈے پر نشانہ باندھتے ہیں اور شرط رکھتے ہیں کہ جب تک لڑکے والے بندوق سے لکڑی کا ڈھنڈا نشانہ نہیں کریں گے۔ نکاح نہیں ہو گا۔

کے قریب سے گزرے اور یہاں پر خوشحال خان ہمارا مختصر تھا۔ اس نے ہمیں چائے کے لئے روکنے کی کوشش کی لیکن ہمارے سامنے نیزی میڈو تھا ہم کمال رکتے تھے، ہم نے اس سے مhydrat کی اور چلنے لگے۔

ہم نے ایک چھوٹی سی ندی کو عبور کیا اور اس دوران اس کے خلک پانچوں میں سے ابھرے ہوئے پانچوں پر بینہ کر ہم نے اپنے چہرے ترکیے اور جی بھر کے پانی پیا کہ یہ کتنی روز کے بعد تھا کہ ہمارے سامنے صاف شفاف پانی بنتے تھے ورنہ جانے کتنی مدت سے ہم ایک پتھریلے صحراء کے مسافر تھے... یہاں میں کل کی تحکاوت کی بخشی ابھی باقی تھی لیکن شاید اس آب و ہوا میں کچھ تھا جو ہمیں تو نمازہ اور شفاف کر رہا تھا اور ہم کل کے دکھ بھول کر سکھ میں چلتے تھے۔ ایک اور ندی کے پار ایک اور ہموار جنگلی گلابوں کی جھاڑیوں کی جگہ ہم نے تھامس مشائلہ اور گاؤفرے کو اپنا مختصر پیا۔ انہوں نے ہمیں اس راستے پر دیکھا تھا جو نیزی میڈو کو جاتا تھا اور وہ ہم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے ہمراہ دو پورے تھے جو ہماری سلامان الخانے ہوئے تھے۔ مطیع ارجمند خان نے جب یہ کہشت تین فیرمکی سامنے دیکھے تو ہاتھ دہ پھر پھر لے لگا۔ تھامس اور مشائلہ میان یوں تھے اور جرسن تھے اور بت سادہ طبیعت کے تھے۔

گاؤفرے بھی جرسن تھا لیکن اب آسٹریلیا میں رہتا تھا اور اپنی اکتوپی بیٹی کی شادی کے بعد دنیا کی سیر کو لکھا ہوا تھا، تن تھامس فیرمی میڈو کی جانب روان تھا کہ راستے میں ہم وطنوں سے ملاقات ہلایا اور ان کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔

مطیع نے فوراً اس سے ہاتھ ٹالیا اور ان کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ "ہم یہ جانا چاہیے ہیں کہ فیرمی میڈو یہاں سے کتنی دور ہے؟" تھامس نے گھرے جرسن لجھے کی انگریزی میں دریافت کیا۔

"ہم بھی یہی جانا چاہیے ہیں۔" میں نے ہواب دیا۔ "اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ فیرمی میڈو کیوں جا رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ نیزی میڈو کا ہام ایک جرسن نے ہی تو دیا تھا..."

"واقعی" مطیع نے حیرت ناک انداز میں کہا۔

"شاید آپ نے ڈاکٹر ہرگل کو فر کا نام سن رکھا ہو۔ کو فر کو ہانگا پریت سے مشق تھا" تھامس ستانے کے لئے ایک پتھر پر بینہ گیا۔ اس کے پورٹوں نے بھی رک سیک زینٹ پر رکھ دیئے اور ہم بھی آرام سے بینہ گئے کہ ہانگا پریت سامنے نظر آ رہی

"فتوری ایک فیٹشی اور فیرمی میڈو کے آسمان سے گرتے ستارے"

تاؤ سائے میں تھا اور دھوپ اور تھی اور ہانگا پریت کا ایک حصہ میلے آسمان میں نہیاں تھا۔ قدم خان اپنے گدھے پر ہمارا سلامان لاد رہا تھا اور رحمن ہمارے لئے اپنی پختون روایت کے مخابق پر اٹھے پکوا کر لایا تھا ہو اس سرد مجھ میں تاؤ نالے کی قربت میں اور فیرمی میڈو جانے کی خوشی میں شاندار ذائقہ لے ہوئے تھے۔ "مولوی رحمن آج تو ما دو کہ نیزی میڈو یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کتنی دور ہے؟ کیوں کتنی دور ہے؟ فیرمی میڈو اور ہے۔" اس نے ہالے کے دوسرا جانب کچھ قابلے پر اٹھی ہوئی ایک سر بربر پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ اسکوں سے کچھ دور وہ چھوٹا سا پل تھا جس کے ذریعے ہم نے ہالے کو عبور کیا اور دوسرا جانب چٹان کے پسلوں میں چلتے گئے۔ راستے میں ہر بڑے بڑے پتھر تھے اور کچھ دریہ تو تاؤ نالہ ہمارے ساتھ چلانے اور پھر ہم اس درے سے پرے ہو گئے اور ہم اس درہ نما نگلی سے پرے ہوئے جس میں تاؤ کا گاؤں بھیجا ہوا تھا۔ یہاں زمین تقریباً ہموار تھی اور جنگلی گلاب "سیا" کی بے شمار جھاڑیاں پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ آپ وہاں فرق نہیاں تھا اور ہم ایک سرخوشی کی کیفیت میں چلتے تھے۔ کچھ بے پروا سے اور کچھ کھلندڑے سے کیوں کہ یہاں چڑھائی نہ تھی، سامنے تم سیاہ جنگلوں سے ڈھکی ہوئی دو پہاڑیوں کے درمیان ہانگا پریت کی برنس تھیں، ابھی دور تھیں لیکن ان کی سفید نعنڈک ہوا میں ہم تک آتی تھی۔ تاؤ سے نکلنے کے بعد ہم "لیل" کے گاؤں

تھی اور اس کی آس پاس نیزی میڈو پوشیدہ تھا اور اب ہم اسے دیکھئے بغیر واپس
جانے والے نہیں تھے۔

"تو کوفر کو نالگا پرست کا خط تھا۔ ایک ہم کے دوران اس کا ایک عین بھائی
ایک برقلانی تودے تے دب کر بلاک ہو گیا۔ اورتب کوفرنے کما تھا کہ وہ اس
چونی کو ہر قیمت پر سر کرے گا۔ چنانچہ جس ہم نے نالگا پرست کو سر کیا اس کا لیڈر
کو فری تھا۔"

"لیکن اسے ہرمن بولنے کیجیا تھا؟"

"ہاں۔" مثالکہ جیرت سے بولی "تم ہرمن بولنے کو جانتے ہو۔؟"

"تو ڈاکٹر ہرلگ کوفرنے نالگا پرست سے واپسی پر ایک انتہائی حسین چاگہ دیکھی
اور اس نے کما کر یہ تو نیزی میڈو ہے۔ بلکہ نیزی شبل میڈو پر یوں کی کمائیوں کی
چاگہ۔ جو منی میں نالگا پرست کو جرمن ماڈنشن کما جاتا ہے۔ تو ہم جرمن ایک
جرمن ماڈنشن دیکھنے جا رہے ہیں۔"

"جو پاکستان میں ہے۔" میں فوراً بولا

"تو کیا ہم اکٹھے سفر کریں" وہ اپنے پتر سے انھوں بیٹھا۔

"جی نہیں کم از کم میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکا میں بہت آہستہ چل ہوں۔
آپ چلیں نیزی میڈو میں ملاقات ہو گی۔"

گاؤفرے اور وہ اپنے دونوں پورٹوں کے ہمراہ آگے چلنے لگے۔
"ان کے ہاتھوں میں سفر کی کیرس تھیں میں نے دیکھ لیا تھا" مطیع نے سر بلکہ
کہا۔

"اندازہ کرو۔" میں نے خس کر کہا۔

"کیا مطلب" مطیع نے ذرا غصے سے کہا۔

"بس بھی کہ اندازہ کرو۔"

واکیں جاتب سیاہ جگل سے ڈھکی پہاڑی کے قدموں میں قدم خان کا گدھا دکھائی
دیا، اور پھر وہ درختوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں اس پہاڑی پر چڑھنا تھا۔ لیکن یہاں
پھر بلا صحرانہ تھا چیز کے کھنے ہرواول کی خوبیوں والے درخت تھے اور درختوں کے نیچے
گھاس تھی اور زرد پھول اس میں سے سر نکال کر اپنی زردی کی شوہنی سے سکراتے
تھے۔ لیکن یہاں چڑھائی ایک ایسی سیڑھی کی طرح تھی جس پر پاؤں رکھنے کو جگہ نہ
تھی۔ لیکن یہاں بار بار رکنا پڑا۔ مطیع قدم خان کے گدھے کے ساتھ آگے جا چکا

تھا اور رحمن کی بھی خواہش بھی کہ وہ بھوٹ سے آگے نکل جائے لیکن میں اسے
روکا۔ "رحمن میرے ساتھ رہتا۔ مجھے پانی کی ضرورت ہے۔" پر رحمن آگے نکل
گیا۔ میں آہستہ اپنا سانس بچاتا جمع کرتا اور خوفناک چڑھائی پر جھکا قدم اٹھا
رہا۔ کچھ ایسے مقام تھے جہاں آپ کسی درخت کی جزا یا پتھر کو تھام کر اپر چھتے۔
چیز کے درختوں کی چھاؤں اور نکل آپ وہا کا کچھ قائدہ نہ تھا۔ یہاں بھی طلاق
سوکھتا تھا اور جہاں جہاں دھوپ تھی وہاں وہ بدبن کو سکھاتی تھی۔ شاید میں نے اپنے
آپ کو اپنی حدود سے پرے لے جا کر چھتے کی کوشش جاری رکھی، اپنی جسمانی
برداشت سے تجاوز کیا، کیونکہ بکدم مجھے سارا لے کر فوری طور پر بیٹھ جانا پڑا۔ میرا
طلاق نکل ہو چکا تھا اور آنکھوں کے آگے نیم تاریکی پھیلتی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ
شاید بلندی اور دھوپ کی وجہ سے میں ڈی ہائیڈر نیشن کا ٹھنکار ہوتے والا ہوں اور مجھے
پانی کی اشد ضرورت تھی۔ اور پانی کی سپالائی مولوی رحمن کے پاس تھی اور رحمن
"تم مسلمان ہم مسلمان" کا ورد کرتا ہوا اپر جا چکا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر
میں زبردستی پڑتے کی کوشش کروں گا تو اس کے نتائج ہوں گا کہ یہاں کے چنانچہ میں آرام
سے دیں بیٹھے گیا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد ایک گدھے والا اپر سے آیا۔ میں
نے پانی کا پوچھا یہ کہ اس کے پاس پانی نہ تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ
نکو ہٹک کر کسی بچے کے ہاتھ پانی روانہ کر دے۔ میری طبیعت بدستور خراب تھی اور
میں اس ساری صورت حال کے لئے رحمن کو زندہ دار ٹھرا رہا تھا کیونکہ پہاڑوں میں
یہ دستور ہے کہ آپ کا پورٹر ہیش آپ کو ساتھ لے کر چھتا ہے اور کبھی آپ کو اپنی
ناظروں سے او جھل نہیں ہوتے۔ اور رحمن مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اپر
جگل میں سے کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے جانوروں کا ایک رویہ ہے۔ قابو ہو کر بچے آ
رہا ہے۔ اور یہ دراصل صرف ایک جرمن کو یہاں تھا جو ایک بیگب غلائی تم کے
لباس میں ملبوس، دستافوں اور یونیک سیمیت ہاتھوں میں ہائی نکل رکھ لئے اپنے
بھاری ہوتوں سے تقریباً لڑکتا ہوا دھپ دھپ بچے آ رہا تھا۔ میں اگر باقاعدہ شور پھاکر
اسے نہ روکتا تو وہ بیتھنا مجھے رومندا ہوا گزر جاتا۔ اس کے بچے اس کا پورٹر تھا جو ایک
چھوٹا سا تمثیلا اٹھائے ہوئے تھا اور بیتھے مسلمان اس جرمن مل ڈو زر کی پشت پر تھا۔
اس نے یونک اتار کر مجھے غور سے دیکھا کہ یہ کیا ہے۔ وہ ایک نوجوان ستری
بالوں والا انسان کم اور مشین زیادہ تم کا جرمن تھا اور اتنے صاف سترے اور نی
نگور لباس میں تھا جیسے کسی سور کے شوکیس میں سے نکل کر باہر آ رہا ہو۔ میں نے

حالت ہوتی تھی اور مجھے معلوم ہوا کہ انہا شاعر ہو مرکے شائز اور مناگر "دیکھا" تھا کہ
صرف اپنی محوس کر کے اس نے کہی لازوال شاعری کی۔
اور پھر ایک سور دار گزگراہت ہوئی۔ پاٹیں کیا تھا۔ آسمان پر بادل تو
نہیں تھے، بلکہ دھوپ تھی۔ لیکن آسمان تو کم تھا اور نالا پرست کے ایک حصے میں
سید و حول اٹھ رہی تھی اور ہولے ہولے بھیل رہی تھی۔ تی ہاں وہاں کوئی برقلانی
تودہ اپنی جگہ سے کھسکا تھا اور اب برفوں کو میٹتا چیزیں رائے کوٹ گلیشیر میں گردہ
تھا۔ میں اس جنت ارضی کو اب بھی سن سکتا ہوں کیونکہ میں اس کی تیز ہوا کو سنتا
ہوں۔ جھاڑیوں اور گندھڑیوں کے ساتھ ہنسنے والے رم جھمپانی کو سنتا ہوں اور نالا
پرست پر گمراہی گونج کے ساتھ کھکھنے والے تدووں کی آواز سنتا ہوں۔ لیکن یہ فیری
میڈوں تھا۔ اس سارے علاقوں کا نام خستروی تھا اور فیری میڈوں کا ایک حصہ
تھا جس کا مقابی نام جنت ہے۔ یہ ایسا علاقہ ہے جو رائے کوٹ گلیشیر کے ایک
جانب بلند ڈھلوان پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے آغاز میں ایک بلند ہموار مقام پر ایک
چھوٹا سا لکڑی کا کین بن تھا۔ اسے تالا نگا ہوا تھا۔ یہاں چند پتھرتے ہو گھاس میں سے
سرنکلتے تھے۔ مقابی آبادی کا خیال ہے کہ یہاں کافروں کا قلعہ تھا۔ یہاں سے یعنی
جھاںکیں تو گویا آپ ایک بلند دیوار پر کھڑے جھانکتے ہیں اور یعنی تقریباً آدمی کے کلو میٹر
کے قابلے پر رائے کوٹ گلیشیر کا ہو ہے اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا دریا
ہے جو غالباً تاؤ نالہ ہے۔

اگر یہاں یہ سماں ہے تو آگے فیری میڈوں میں کیا حالات ہوں گے۔ ہم اپنی
تمام تکلیفیں، مسیتیں اور رنج بھول گئے۔ اور ایسے آرام سے چلنے لگے جیسے صبح کی
سیر کے لئے آئے ہوں۔ کھیتوں میں عورتیں کام کر رہی تھیں اور وہ دور رہتی
تھیں۔ ان کے لباس اور زیور کسی شافتی غائب گفر کی طرح تھے۔ جس راستے پر ہم
چل رہے تھے اس کے آس پاس بھی کھیتوں کے کنارے گلاب کی جھاڑیاں تھیں اور
سرد پانی کی جو نالی ہمارے راستے کے ساتھ تھی وہ بھی چھوٹا سا تالاب بنتی اور بھی
نخشی میں سی آبشار کا روپ دھار لیتی۔ اور میں ہر چند قدم کے بعد رکتا، اپنا چہوڑا پانی
سے ترکرتا اور چند گھونٹ پی کر پھر آگے چلتا۔ میں تو پانی کو ترسا ہوا تھا۔ سامنے
سے چند خواتین پلی آری تھیں۔ انہوں نے چارے کے گھنے سر پر بوجھ کے ہوئے
تھے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر انہوں نے سرگوشی کی۔ ایک کہ رہی تھی۔ انگریز
اگر نہ۔ کیونکہ ان خلوں میں صرف غیر ملکی سایج ہی جاتے ہیں اور دوسری بی بی سر

پانی کا سوال کیا اور اس نے فوراً اپنی بیٹ کے ساتھ لکھی ہوئی تحریک موس کا ڈسکن کھول
کر گئے کے گاس میں بھجے پانی پیش کر دیا۔ یہ پانی میں نے پاکم اور اپنے چہرے اور
باچھوں پر بہلا زیادہ۔

"وانکاش" میں نے ٹھریہ ادا کیا اور وہ ایک لمبا سانس اندر سمجھ کر شارت ہوا
اور پوری رفتار سے یعنی لڑکے لگا۔

اب میں بھتر محوس کر رہا تھا۔ میں انھا اور چڑھنے لگا۔ لیکن ذرا اختیاط سے
اتنی مشقت کے بعد اگرچہ جمع کی جنت بھی مل جائے تو منگل ہے۔ میں یہی سوچتا دل
کڑا کر کے آہست آہست قدم انھا تا چھٹا جا رہا تھا۔

"تارڑ صاحب۔۔۔ تارڑ صاحب۔۔۔"

میں نے بھٹکل اور دیکھا تو مجھ سے تقریباً سو گز کے قابلے پر مطیع خان ایک
شہنشیر پر بیٹھا بھجھے پکار رہا تھا۔ اور جلدی سے اوپر آئے کو کہ رہا تھا۔ اور پر میں آ
تو رہا ہوں یوقوف آؤی" میں فتحے سے بڑیڑا یا۔۔۔ اور جب میں اس کے قریب پکچا
ہوں تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سرخوشی تھی اور وہ مسٹر کے ان لمحوں میں تھا
جب انسان کمل طور پر نوزاںیہ ہو جاتا ہے۔ اور جس شہنشیر پر وہ بیٹھا تھا اس شہنشیر
سے چند قدم کے قابلے پر وہ سب کچھ تھا جو اس کے چہرے پر عکس ہو رہا تھا۔
چڑھائی ختم گئی۔۔۔ ہوا کی شدت میں اضافہ ہو گیا لیکن یہ خالی اور بے روح ہوا۔۔۔
تھی اس میں زندگی تھی۔ اور یہ زندگی کہاں سے آئی؟ ایک وسیع سربراہ خلے کے ہرے
بھرے کھیتوں سے اور جنگلی گلاب کی ان جھاڑیوں سے جن کی شنیاں نظر میں آتی
تھیں اور گلکان ہوتا تھا کہ جہاں جہاں ان کی شنیاں نگلی تھیں وہاں کسی نے کافنڈ کے
پھول ناک دیئے ہیں۔ ان گلاب کے ڈھروں کے یعنی کہیں پوشیدہ اور کہیں ظاہر پانی
چلتا تھا جو نالا پرست سے آتا تھا اور نالا پرست کا پھیلاوہ اتنا زیادہ تھا کہ یہاں آپ کے
سامنے آسمان کم تھا اور نالا پرست کا برف پوش جنم زیادہ تھا۔ یہاں آسمان کم تھا اور
سینہ اور گلاب اور پانی کا شور اور تیز تک ہوا زندگی سے لبریز اور نالا پرست کی برنس
زیادہ تھیں۔ میں جاتا ہوں کہ اس وقت جب میں اس مظکر کو جیت سے دیکھتا تھا تو
میرے چہرے پر بھی ایک عجیب سی خوشی تھی اور میں مسٹر کے ان لمحوں میں تھا
جب انسان کمل طور پر نوزاںیہ ہو جاتا ہے۔۔۔ اور بھجھے معلوم ہوا کہ جب یونانی دیو
مالا کا ہیرو جیسیں۔ ستری کھال کی ٹلاش میں اپنے جہاڑ آگر کو پر لکھا تھا اور جب وہ
جادوی سمندر میں سے کسی طیسی جزیرے کو ابھرتا ہوا دیکھتا تھا تو اس کے دل کی کیا

کچھ پرانے مکانوں میں دھویں سے سیاہ ہوتے دروازے کھول کر عورتیں ہمیں دیکھتی تھیں اور پنچھے ہمارے قریب نہ آتے تھے بلکہ دور سے شور پاتتے تھے "چاکلیٹ چاکلیٹ" وہ ہمیں بھی فیر تکلی کوہ دیا کہتے تھے جو انہیں چاکلیٹ کا عجھدے کر جاتے تھے۔

راتے کے ساتھ ایک نالہ آ رہا تھا اور ایک مقام پر کسی زندہ دل نے اس کے میں اپر شہریوں سے ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا رکھا تھا۔ رومن اپنی جگہ لیکن ایسے جھونپڑے میں سونا ذرا مشکل ہوتا ہو گا کیونکہ پانی کا بے پناہ شور ہر وقت کو نجھا ہے۔ یا پھر یہ جھونپڑا سونے کے لئے نہیں صرف جانے کے لئے ہو گا اور ایسے جانے کے لئے جس کے پیس مختصر میں اس قسم کا شور منید رہتا ہے۔ یہاں سے راست ذرا اپر الٹا تھا اور کھیتوں کی بجائے گھننا جگل آپ کو ڈھانپنے لگا تھا لیکن زیادہ دیر تک نہیں کیونکہ آپ لکڑی کے ہنائے ہوئے ایک بے ڈھنپ کا چانک کو دیکھتے ہیں۔ اور اس چانک کے پار فیزی میڈو ہے۔

اور جب اسی چانک کو پار کیا اور فیزی میڈو میں پہنچے تو دل بیٹھ گیا۔ کیا کسی فیزی میڈو ہے۔ بڑا شور سنتے تھے کہ نالا پرت کے پلوٹ میں فیزی میڈو ہے اور جو پہنچے تو یہ لکلا۔ خیال تھا کہ ایک دھنڈ آکوڈ ماہول میں واپسی ہوں گے اور جوں جوں دھنڈ تخلیل ہو گی اس میں سے پریاں ناچتی ہوئی برآمد ہوں گی اور۔۔۔ اور یہاں کوہستانی حضرات کا ہنکوئیں لے کر گھوم رہے تھے اور بکھاں پاں پاں کر رہی تھیں اور گھاس پر بیکھنیاں اور لید کے تدوے تھے اور ذرا ہٹ کر مولوی رحمٰن بیٹھا دانت نکال دیا تھا۔

"بس کی فیزی میڈو ہے یا آگے جانا ہے" میں نے ایک جانب ایک چھوٹے سے خیسے کو دیکھا ہو کسی سایج کا تھا اور سایج مجھس کمبوں کو خیسے سے دور کرنے کے لئے "ہو ہو" کر رہا تھا اور ان کو مستانوں کو دیکھا ہو داڑھوں کو سنوارتے ہماری جانب آ رہے تھے۔

"بس کی فیزی میڈو ہے؟"

"کیوں نہیں ہے، کی ہے" رحمٰن مجھے دیکھ کر اٹھو کردا ہوا۔ "ادھر خیرہ لگائے گا۔"

"کیوں لگائے گا خیرہ؟ یہ کوئی جگہ ہے اور مولوی صاحب آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر

ہلا رہی تھی کہ نہیں مسلمان۔۔۔ پاکستان۔۔۔
فستوری ایک ایسا مظہر تھا ہے دیکھ کر دکھ بھی دل میں بیٹھتا تھا۔۔۔ اور ایک نہیں بہت سارے دکھوں میں جگہ ہنائے تھے۔۔۔ دکھوں کے زیاد کا دکھ ہوتا ہے جو ان مناگر پر کیا جو زندگی میں نظروں کے سامنے آئے انہوں نے بہوت کیا اور مٹاڑ کیا اور آپ نے جتنے لفڑتے ان کی شان میں بیان کر دیئے اور جب کہ فستوری کا علاقہ آپ کے سامنے ہے اور تھک ہوا کے ساتھ بہر فیلے پانی آپ کے پاؤں میں پہنچے ہیں آپ کے پاس اسے بیان کرنے کے لئے کوئی نئے لفڑ نہیں ہیں اور پرانے لفڑ عرصہ ہوا برتر جا پکے ہیں، بوسیدہ ہو پکے ہیں۔۔۔ تو اب کیا کریں؟ قارئین کو کیسے دہاں لے جائیں جمال ہم تھے۔۔۔ ایک اور دکھ بجول میں جگہ ہناتا ہے وہ اس مظہر کو اکیلے دیکھنے کا دکھ ہے۔۔۔ وہ جو بیارے ہیں ان کو بھی تو اسے دیکھنا چاہئے۔۔۔ کیونکہ آپ اپنے بیاروں کے لئے ویباکی خوبصورت ترین چیزوں کی خواہش کرتے ہیں اور یہ یقیناً ان میں سے ایک ہے۔۔۔ اور ایک اور دکھ اس مظہر کے گم ہو جانے کا ہے۔۔۔ یہ ہو گا اور آپ نہیں ہوں گے۔۔۔ تو شاید دکھ اپنے گم ہو جانے کا ہوتا ہے۔۔۔ اس شام میں نے اپنی ڈاڑھی پر جنک کر جو کچھ لکھا ہو بھی ناکافی ہے۔۔۔

"فستوری ایک فیشی تھا۔۔۔ ایک جنت گم گشت۔۔۔ میں سمجھی بھی اس کے حسن اور نزاکت اور دل کو چھوڑنے سکوں کا اور آنکھوں میں نبی لے آئے والے ماہول کی بات نہ کر سکوں گا۔۔۔ ایسے پوشیدہ بخ جن میں برف لئے پانی کا شور کرتا تھا۔۔۔ جنگلی گاب سے گھرے راستے اور نالا پرت آسمان کو بھرتا ہوا۔۔۔ دوبار توہہ گرنے کی گزگزابا۔۔۔ مجھے اس حسن کے لئے اس حسن کو آپ تھک پہنچانے کے لیے کچھ پاگل پین چاہئے، مجھ میں کچھ ہے پر اتنا نہیں جتنا کہ فستوری کے حسن کے لئے درکار ہے۔۔۔ سدا نہ باگیں بلیں بولے سدا نہ باغ بماراں"

آسمان پر ابھی دھوپ تھی اور ابھی کمیں سے جھکے جھکے سے باول آئے اور ہلکی بھلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔۔۔ ہم نے اس بارش سے بچاؤ نہیں کیا بلکہ چلتے رہے۔۔۔ ہاں ہم نے یہ محosoں کیا کہ جب کوئی بوند گردن پر گرتی ہے تو ذرا بہتی ہوتی ہے اور بدن کو کچکپاٹی ہے جیسے برف بنتی رہ گئی ہو۔۔۔ پودوں اور کھیتوں کی ہریالی کو منید شوخ کر کے اور فضاء کو تمازگی دے کر وہ بارش کھتم گئی اور آسمان پھر سے صاف ہو گیا۔۔۔

"اور یہاں ہائے ہائے خوبصورت کو متالی اور ہائے ہائے خوبصورت بکریاں بھی ہیں۔" میں نے بھنا کر کیا۔ اور ہاں میں مذہر خواہ ہوں کہ میں مطحی کی ایک عادت کا تذکرہ کرنا بھول گیا اور وہ یہ ہے کہ وہ "بہت" یا "بے شمار" یا "متالی" کے لئے "ہائے ہائے" کا لفظ استعمال کرتا ہے چنانچہ اب تک جہاں کہیں اس کی گفتگو میں یہ تینوں لفظ آئے ہیں اپنی ہائے ہائے کر لیجئے۔

چراگاہ کی ہریالی میں چھوٹے چھوٹے زرد رنگ کے پھول تھے جو مجھے اب نظر آئے اور وہ بے شمار تھے۔ اور درمیان میں ایک چھوٹی سی ندی جو بیشکل ایک بیڑ پڑھی ہو گئی، جگل کی جانب سے بہتی آتی تھی اور اس کا پانی بہت شفاف تھا اور یہ بھی اپنے نظر آئی کیونکہ اس کے پانی کناروں سے ذرا پیچے تھے۔ چراگاہ کے پاسیں جانب ایک بڑا جھوپڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک پہاڑی تھی جس پر بے شمار درخت تھے۔ یہ پہاڑی ناٹک پرست کے میں سائنس تھی اور رائے کوٹ گلیشیر پر جگل ہوئی تھی۔

"رمضان۔۔۔ ادھر۔۔۔ ہم خیر ادھر کائیں گے پہاڑی پر۔۔۔"
"پہاڑی پر؟۔۔۔ نہیں لگائیں گے" رمضان کھرا گیا۔ "ادھر ہوا بہت تیز ہوتی ہے رات کو اور ہاں پانی تو پیچے ہے ادھر۔۔۔ اور پانی نہیں ہے۔ کیا کسے گا۔۔۔ ادھر خیر کا گاؤ"

"آپ مسلمان اخواز۔۔۔" میں جان گیا کہ رمضان اب ست پڑھکا ہے اور مسلمان اخواز کر اس پہاڑی پر چڑھنا اسے عذاب لگ رہا ہے۔ قدم خان کا گدھا بھی واپس جا پکا تھا۔

ویسے رمضان ٹھیک کرتا تھا۔۔۔ اس پہاڑی پر ہوا تیز تھی۔۔۔ یہاں سے پورا نیزی میڈو و دکھائی دیتا تھا۔۔۔ ناٹک پرست اور ہمارے درمیان کچھ نہ تھا لیکن پانی پیچے برس رہا تھا۔۔۔ بہر حال ہم یہاں نیزی میڈو دیکھنے آئے تھے پانی پیچے نہیں آئے تھے۔۔۔ اور یہاں ہمارے لئے ایک خوفگوار جیت خفتر تھی۔۔۔ تھامس اور مشائلہ کا چھوٹا سا ساخہ بھی یہیں نصب تھا اور وہ ہمیں دیکھ کر بے حد راضی ہوئے۔۔۔ وہ اپنا خیر لگا کر ابھی قارئ ہوئے تھے۔۔۔ گاؤفرے پیچے اتر کر ایک پتھر بیٹھا رائے کوٹ گلیشیر کا نقارہ کر رہا تھا۔

"میٹھے۔۔۔ ہم تمہارا انقام کر رہے تھے۔۔۔" تھامس آگے آگیا۔"یہاں سے مھر

کمال دفع ہو گئے تھے۔۔۔"
"کمال دفع ہو گیا تھا؟ یہاں دفع ہو گیا تھا۔۔۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور اگر میں یہاں سے عذبال ہو کروں ہو فوت ہو جاتا تو۔۔۔"
"فوت ہو جاتا؟ کیوں ہو جاتا؟ ہو جاتا تو ہم تمہارے کنفن دفن کا بندوبست ادھر کرتا۔۔۔ تم مسلمان ہم مسلمان۔۔۔ ہم تمہارا بھائی۔۔۔ ہم تمہیں نماز جانازہ پڑھا کر دفن کرتا۔۔۔ ادھر کو متالی جاہل لوگ ہیں۔۔۔ مجھے نماز جانازہ آتا ہے۔۔۔" اور یہ گفتگو رمضان کمل سنجیدگی سے کر رہا تھا۔

"تمہا بیڑا غرق رمضان۔۔۔" میں نے جلا کر کما اور دراصل میں قیزی میڈو کی مایوسی کا غصہ رمضان پر اتامارہا تھا۔۔۔ ٹھیک ہے یہ ایک وسیع چراگاہ تھی اور اس کے پیس میڈو میں ناٹک پرست یوں دکھائی دیتی ہے جیسے آپ کے مگن میں آگئی ہے اور ایک گھنا جگل ہے۔۔۔ یہاں بکریاں تھیں اور دھنی تم کے کو متالی گھوم رہے تھے۔۔۔ میں اس لئے اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ جس مقام پر چکنے کے لئے میں نے ہزار کٹ کاٹے ہیں وہاں لوگ تو ہوں گے اور چراگاہ میں ظاہر ہے۔۔۔ کاٹے اور بکریاں وغیرہ بھی چھل قدمی کرتی ہوں گی۔۔۔"

"یہ ہم ساتھ بندوق بھی لایا۔۔۔" رمضان نے جانے کمال سے ایک انتہائی وقیانوی تم کی بندوق برآمد کر لی۔" اس کے ساتھ مار خور مارے گا تمہارے لئے۔۔۔ کھائے گا؟؟"

"کھائے گا؟ کیوں نہیں کھائے گا۔۔۔ ہم مسلمان۔۔۔ تم مسلمان۔۔۔ لیکن شیمہ یہاں نہیں لگائے گا ادھر خشوری واپس ٹلے گا وہ اچھی جگہ ہے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ سب مسافروں ادھر خیر لگاتا ہے۔۔۔"
"ہم مسافروں ادھر خیر نہیں لگائے گا۔۔۔" میں نے قدرے کھرا کر کما کیوں کہ چار پاچ کو متالی ہمارے کرد گھرا ڈال کر پیٹھ پکھے تھے اور جیسا کہ خاورہ ہے وہ دانتوں تک سلیخ تھے۔۔۔ مطحی اس دوران اس اکلوتے خیرے کا جائزہ لے کر آگیا جس کے باہر ایک فوجوں بکریوں کو دور رکھنے کا چارہ کر رہا تھا۔

"اس خیر میں ایک ہائے ایک خوبصورت لڑکی بھی ہے۔۔۔" مطحی کئے گا
"میں خیر لگائیتے ہیں۔۔۔"

رقم وصول کرے۔

"مہاری صاحب آپ جاؤ۔" میں نے اس کے کندھے کو تھپکا "آپ کا بیوی صاحب اور آخر پنج آپ کا انتقال کرتا ہے۔"

"نہیں ہم بندوق لایا ہے۔ تم سارے لئے فکار کرے گا مارخور کھلانے گا۔"
"ہم مارخور نہیں کھاتا۔"

"مارخور نہیں کھاتا؟ کیوں نہیں کھاتا؟" اس کامنہ چیرت سے کھل گیا۔
"ہم کو مردہ مارخور اچھا نہیں لگتا۔ پہاڑوں میں گھومتا زندہ مارخور اچھا لگتا ہے۔"

"تو پھر ہم اور تم ساری چوکیداری کرے گا بندوق سے۔ اور کے لوگ کو متانی بہت خلڑاک ہیں۔"

میں اس بارے میں بھی معلومات حاصل کر چکا تھا کہ سیاحوں کے خیے یہاں بالکل محفوظ رہتے ہیں اور کو متانی اتنے خلڑاک نہیں ہوتے جتنے دکھائی دیتے ہیں "مولوی صاحب آپ تکرنا کرو اور اپنی بیوی صاحب کے پاس جاؤ اور چار دن کے بعد واپس آؤ اور ہمیں پنجے لے جاؤ۔"

"چلو قدم خان۔" مولوی صاحب نے ٹاکواری سے ہر حال میں شکر گزار قدم خان کو کھنی مار کر کما "ہم چار دن میں آئے گا۔۔۔ اگر تم زندہ پنج گیا تو واپس لے جائے گا۔"

ہم رحمن اور قدم خان کو پہاڑی سے اترتا دیکھتے رہے۔۔۔ وہ فیری میڈو کے میدان میں پڑتے تھے۔۔۔ پھر وہ ہماری نظروں سے او جھل ہو گئے کو متانی حضرات ہم سے روشنی ہوئے دوسری جانب منہ کر کے ابھی تک بر اجتنان تھے اور بھوری واڑھی والا دورہن سے برزل کو بے دل سے دیکھتا تھا۔۔۔ میں ان کے پاس جا کر پینچھے گیا لیکن انہوں نے میرے نہاد پر جوش "السلام علیکم" کا جواب بالکل نہ دوا۔۔۔

"کیا حال ہے خان صاحب۔۔۔" ان میں سے کسی ایک نے بڑیرا کر کچھ کما اور زمین پر تھوکا۔

"یار یہ دورہن تو دکھاو۔" میں نے دوستی کرنے کے لئے بھوری واڑھی والے کے آگے ہاتھ کر دوا۔۔۔ اس نے مجھے اک چشم خارت سے دیکھا کہ یہ منہ اور

ہمت شاندار ہے اور بھیڑ بکراں بھی نہیں ہیں۔۔۔"

"بیلو۔" مطیع نے ایک ہار پھر دنوں کے ساتھ دست پنجہ لیا اور خاص طور پر مشاکل سے۔۔۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "بڑی ہائے ہائے سیم ہے۔۔۔ چوبدری صاحب۔"

رحمن نے خیسہ کھول کر گھاس پر بچا دیا تھا اور اب اس کی نیخیں گاؤ رہا تھا۔۔۔ میں نے توٹ کیا کہ خیسے کا چڑھہ چڑھے درختوں کی جانب ہے "میں سے اکھاڑ کر اس کامنہ اور ہر کو رحمن۔۔۔ ناٹا پریت کی جانب"

"ناٹا پریت کی جانب؟ کیوں نہیں ناٹا پریت کی جانب۔۔۔ اور سے ایسا ہوا آئے گا برف والا رات کو کہ تم خود برف ہو جائے گا۔۔۔"

"خبر ہے۔ منہ ناٹا پریت کی طرف۔۔۔"

رحمن بڑیرا نے لگا۔۔۔ "رات کو برف کا ہوا چلے گا تو اس کو پہاڑے چلے گا۔۔۔" اور نیخیں اکھاڑنے لگا۔۔۔ انگو طرز کا خیسہ چھوٹوں میں استفادہ ہو گیا۔

فیری میڈو کے کو متانی ہمارا چھپا کرتے ہوئے یہاں بھی آگے تھے اور اب ہمارے خیے سے ذرا بہت کر ہماری جانب بظاہر لاپروا ہو کر گلیشیر کے دوسری جانب منہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ البتہ وہ بھی بکھار ترچھی نظروں سے اور ہر دیکھ لیتے کہ اب کیا ہو رہا ہے۔ ان میں سے ایک بھوری واڑھی والا نوجوان آنکھوں پر دورہن لگائے گلیشیر کے دوسری جانب بلند ہوئے برزل پاس کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ یہ دورہن بھی ایک بہانہ تھا۔۔۔ وہ ہماری حرکات دلچسپی سے دیکھتے تھے لیکن یہ ظاہر نہیں کرنا چاہجے تھے کہ اپنی ہم سے کسی حرم کی کوئی دلچسپی ہے۔

خیے میں سامان رکھنے کے بعد رحمن نے ایک گردبار کنگورا مارا اور کہنے لگا "تم اور ہر سوئے گا پنجے اپنے بھائی کے پاس۔۔۔ اور ہر مکان میں۔"

جمال ہم تھے یہاں سے پورا فیری میڈو پوری تفصیل سے نظر آتا تھا اور چونکہ یہ علاقہ تماویک کے لوگوں کی ملکیت ہے اس نے گریہوں میں وہ اپنا مال موٹی لے کر اپر آ جاتے ہیں۔ فیری میڈو کے ایک جانب باقاعدہ گھر ہے اور کھیت ہیں اور اور جس پہاڑی پر ہم تھے اس کے برادر میں بھیڑوں کا بازوہ تھا۔۔۔ جب رحمن نے شب بڑی کے حوالے سے اپنے خیالات کا اکھمار کیا تو میں نے جان لیا کہ وہ کسی نہ کسی بمانے اور فیری میڈو میں ٹھمرے گا اور پھر اس قیام کو ہمارے کھاتے میں ڈال کر ہم سے

سوچے ہوئے تھے پر آئیت نکلے شیو کر رہا تھا۔ اور ہاں اس پہاڑی پر ہو چھوٹا سا جگل تھا اس میں اور جہاں ہمارا خیر تھا اس کے آس پاس بے شمار سوچے ہوئے درخت اور ان کے تھے تھے۔ یہ درخت بارش اور برف کی وجہ سے پاکل کھوکھلے ہو چکے تھے اور مدتوں سے یہاں پڑے تھے صرف اس لئے کہ یہاں کسی کو لکڑی کی ضرورت نہ تھی اور جتنی ضرورت تھی وہ اپنی اپنے جھوپڑوں کے ارد گرد میسا ہو جاتی تھی۔ ہمارے خیے کے میں یہی ایک بست پیدا درخت ایک عرصے سے پڑا تھا اور دور سے کسی یا ہم اس کی اوٹ میں کھانا بناتے کھاتے اور دھوپ سینکتے کیونکہ خیر کے پاس، رحمن نجیک کھتا تھا، ہوا بست تیز ہوتی تھی۔

گاؤفرے عام جرمنوں کی نسبت پتہ قد تھا۔ تھوڑا سا بھلی یہیں نہایت خوش مزاج شخص۔۔۔ وہ سزر کے دوران کم سے کم سلان اخانے پر یعنی رکھتا تھا چنانچہ ایک سینپنگ بیک اور شاید ایک جوڑا کپڑوں کے سوا اس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ میں نے شب بسری کے ہارے میں پوچھا تو کہنے لگا۔

"میں بیش کم لے آسمان تے سونا پسند کرتا ہوں۔۔۔ خیے صرف بڑوں کے لئے ہوتے ہیں"

"اور اگر بارش آجائے تو؟"

"تھوڑا سا بھیگ جانے میں کوئی حرج نہیں۔۔۔ وہ اپنی واڑی میں انگلی سے سکھی کرتا ہوا کہنے لگا" ویسے تھامس نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ اگر زیادہ بارش ہو جائے تو میں ان کے خیے میں پناہ لے سکتا ہوں۔۔۔"

"اوہ ہمارے خیے میں بھی۔۔۔" مطیع نے فراہما۔

"مگری۔۔۔ کیا آپ کافی پیٹا پسند کریں گے؟ کیونکہ میرے پاس تھوڑی سی کافی ہے۔ اور یہاں تو کھانا پکانے اور کافی وغیرہ بناۓ میں کوئی پر ابلم نہیں ہو گی۔ یہاں اتنی زیادہ لکڑی ہے۔۔۔ میں نے دیکھا ہے کہ لکڑی اتنی خلک ہے کہ یہ بست اچھی طرح جلتے گی۔" گاؤفرے نیچے اتر کر خلک لکڑی جمع کرنے لگا۔ کیا دیکھتے ہیں گے نیچے سے فیری میڈو سے "بہم مسلمان تم مسلمان" رحمن صاحب پھر پڑے آرہے ہیں۔۔۔ ان کے ساتھ تقدم غان بھی ہے اور ایک پچھے نہیں اخاء ہوئے ہے۔۔۔ تھوڑی دیر بعد "بہم تک پہنچے تو ہاپ رہے تھے۔۔۔ اس پہاڑی پر خیرہ زن ہونے کا یہ قائدہ بھی ہوا

دورہن اور پھر برزل پاس کی جانب دیکھنے لگا۔
"یار ہم تمہارا مہمان ہے، تمہارے وطن میں آیا ہے۔۔۔ کیما کو متالی ہے مہمان کو دورہن نہیں دکھاتا!"

اس نے اپنی نیلی آنکھوں میں فصل بھر کر مجھے دیکھا کہ مہمان کا حوالہ دے کر مجھے بیک میل کرتا ہے یہ لو دورہن۔۔۔ اور اس نے دورہن مجھے تھانے کی بجائے میرے آگے پھیک دی۔ فصل تو مجھے بھی بہت آیا کہ یہ حیرت کو متالی کیا جانے کہ اس کے سامنے اس وقت نیلی دیرہن کا ایک پر شار بیٹھا ہے۔ اگرچہ پاندر نوپی پہنچنے سے اور مسلسل مسافت اور بے تحاشا بڑھی ہوئی بے ترتیب واڑی کی وجہ سے فی الحال ایک پر مخوگ رہا ہے۔ یہ میں نے اس لاعلم کو متالی کو کچھ نہ کہنا مناسب جانا یہ نہیں کہ میں اس کی کاٹھکوں سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔۔۔ یہ میرا اپنا قسطہ تھا کہ میں اپنے فسے کو قابو میں رکھوں گا۔۔۔ دورہن سے میں نے ناٹک پرست پر توجہ مرکوز کی۔۔۔ اس کی سیدی میں اتنی زیادہ بیک تھی کہ آنکھیں چڑھیا گئیں۔۔۔ ہمارے میں نیچے رائے کوٹ گلیشیر تھا جس کا سلیشی ریگ کا جنم ایک دریا کی طرح ناٹک پرست کے قدموں سے جاتا تھا۔۔۔ یہ برف کا ایک تھما ہوا دریا تھا میں اس کے نیچے اس برف میں پوشیدہ ایک اور دریا تھا جس کی آواز ہم تک پہنچتی تھی۔ اس کے پانی فنوری کے قریب جا کر برف میں سے ظاہر ہو کر روشنی میں آتے ہیں۔

ایک گروگراہٹ ہوئی اور ایک گونبدار آواز فیری میڈو پر بست دری ٹھہری رہی۔۔۔ اور اس لئے میں ناٹک پرست کے اس حصے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے یہ گونج سفر کرتی ہوئی ہم تک آئی تھی اور یہ ایک چھوٹا سا ایولائچ بیقی برقانی طوقان تھا جو سید وحدت کی صورت نیچے آ رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ کئی چٹائیں جن کی سیاہی نمیاں تھیں اب برف سے ڈھک چکی تھیں۔

میں نے دورہن آنکھوں سے بٹائی اور نیلی آنکھوں والے کو متالی کو دے دی۔۔۔ "مگری۔۔۔"

اس نے کچھ نہ کہا۔۔۔ اور پھر سب یکدم اٹھے اور سلام دعا کے بغیر نیچے اترنے لگے۔۔۔

میں نے مطیع کی طرف دیکھا تو وہ مشاہد کی تھیلی پر انگلی چلا کر اسے نوید دے اتا کر تم تین بچوں کی ماں بنو گی اور تم غیر ممالک کے سفر کر دیں۔۔۔ تھامس ایک

حاب کتاب ہو جائے۔ سندھ پر رائے کوٹ پل سچ سمندر سے گیارہ سو چور انوے
میزراں اونچا ہے۔ تاؤ کی بلندی دو ہزار تن سو میزراں ہے اور نیزی میڈو تن ہزار دو سو میزراں
پر واقع ہے اور جہاں ہمارا خیر واقع تھا یہ مقام تغیری سازی سے تن ہزار میزراں کی بلندی
پر تھا یعنی دس گیارہ ہزار فٹ کی اونچائی۔ اور یہ اونچائی بہت زیاد ہوتی ہے اور
انسانی جسم اور دماغ پر اڑانداز ہوتی ہے۔ اونچائی کی اس بیماری کا واحد علاج وہی
ہے۔ اور یہ آزمودہ نہ ہے۔

میں نے دی کے عوض کچھ رقم اس پچھے کو دینی چاہی تو رحن نے ایک بہت
اچھی بات کی۔ کہنے لگا "پیرہ مت دو۔ ابھی یہ لئی مہمان سمجھ کر لایا ہے۔ اگر پیرہ دو
گے تو بعد میں سب ثورت کو گاہک سمجھ کر لائے گا۔ لاج کرے گا" چنانچہ میں نے
پچھے کو چھڈ بکھ اور جو گلم کا ایک یوکٹ دے کر رخصت کر دیا۔ پچھے نے جو گلم کے
یوکٹ کو غور سے دیکھا اور کہنے لگا "یہ دیکھی ہے۔ ہم تو جو من جو گلم کھاتا ہے۔" میں
نے بے حد محذرت کی کہ فی الحال میرے پاس تو یہی ہے۔
قدم خان بھری کیں بھر کر لاچکا تھا۔ گاڑفرے کا چولنا خوب دھڑا دھڑ جل رہا تھا
اور اس پر رکھی کیتلی میں پانی اعلیٰ رہا تھا۔

رحن اور قدم خان چار روز بعد آئے کا وعدہ کر کے پھر نیچے اتر گئے
اور پھر تیز ہوا۔ سامنے ناٹک پرست۔ دھواں گلی گرم کافی اور نیچے کا پھر بیڑا آتا ہوا
پر دھو۔ ایک بوڑھا چوالا رہی بیٹا ہوا اور آگیا۔ ہمیں دیکھ کر سکراتا رہا۔ ہم نے
اسے پیشئے کو کہا۔ وہ اورو بہت کم سمجھتا تھا۔ تھامس کا ارادہ تھا کہ وہ اگلی سچ ناٹک
پرست کے میں یکپ تک جائے اور وہ اس کے راستے کے پارے میں باہم سے پوچھنے
لگا۔ باہم نے بتایا کہ نیچے یہ جو گھنا جگل ہے اس میں سے راستہ جاتا ہے۔ جگلی
جانور کوئی ایسا نہیں جو نقصان پہنچا سکے۔ بھیڑیے ہیں تو سی لیکن انسان سے ڈرتے
ہیں اور پھر ادھر بیال یکپ سے آگے گلیشیز کے ساتھ چل کر ہمیں یکپ آتا ہے۔
صرف احتیاط یہ چاہئے کہ گلیشیز کے بعد ہونا ہے وہ صحیح سورے آسانی سے پار کیا
جا سکتا ہے لیکن دو بیچ کے بعد ررف پکھلنے کی وجہ سے ناقابل ہیور ہو جاتا ہے اس
لئے جو کوئی بھی ادھر جاتا ہے دو بیچ سے پسلے نالہ پار کر کے ادھر آ جاتا ہے ورنہ
رات اور بہر کرنا پڑتی ہے اور رات کو ادھر اتنی سردی ہو جاتی ہے کہ چھوٹے موٹے
نالے بھی جم جاتے ہیں۔ باہم نے یہ بتایا کہ وہ ہمیں دو سورپے میں ایک چھوٹی سی

کہ جو کوئی بھی ہمیں ملے آتا تھا راستے میں کم از کم ایک مرجب سانس درست کرنے
کے لئے رکتا تھا اور پھر جب ہم تک پہنچتا تھا تو قدرے توقف کر کے سلسلہ کلام کا
آغاز کرتا تھا۔

"ہم پھر آیا۔" رحن نے اپنی واٹھی پر گرفت مثبت کرتے ہوئے کہا۔ "تم
پانی بھول گیا تھا۔"
"کونسا پانی؟"

"وہ پانی۔۔۔ نیچے نیزی میڈو میں۔۔۔ دی کا پانی۔۔۔ ادھر سے ادھر کیسے لائے
گا؟ ہم نسوری میں پہنچا تو یاد آیا کہ صاحب کے پاس پانی نہیں ہے۔۔۔ کیسے لائے گا؟۔۔۔
دہاں سے ادھر واپس آیا۔۔۔"

میرا جی چاہا کہ میں رحن کو بھما ڈال کر کوئی مولوی صاحب ہم مسلمان تم
مسلمان تھیں۔۔۔ کوئکہ وہ درست کرتا تھا۔ ناٹک پرست کو دیکھنے میں ہم
سب ایسے گھن ہوئے تھے کہ ہمیں قلعی طور پر یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہمیں کافی یا
چاہئے بنائے، پہنچنے اور دیگر ضروریات کے لئے پانی کی ضرورت پڑے گی اور پانی۔۔۔ وہ
نیچے تھا۔

"قدم خان۔۔۔ پانی لاو" رحن نے اپنی نڈھی سرہ ای کا قائدہ اختیتے ہوئے قدم
خان کو پلاسٹک کا بڑا کین دیتے ہوئے گھم دیا۔ قدم خان نے سر جھکا کر کیں تھامنا اور
نیچے اترنے لگا۔ تب رحن نے ہمیں دوسری سرپراز دی۔ اس پہنچ کو ٹھنٹ سخت
پیش کیا گیا ہواب تک ایک طرف بیٹھا اپنی ناک میں انگلی چلا رہا تھا۔

"یہ تمارے لئے لئی لایا ہے۔"

رحن نے ٹھنٹ کو فخری انداز میں ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اور اس ٹھنٹ میں
سفید گاڑھادی تھا اور اس کی سفیدی میں کوئی سیاہ نہ تھری تھی اور اگر تھی تو کہیں
اس کی گمراہی میں تھی اور مجھے پیاس لگ رہی تھی۔۔۔ میں نے سلان میں سے چینی
ٹکال کر دی پر چھڑکی اور سب کو دعوت دی کہ ہم مسلمان تم مسلمان۔۔۔ جب کسی
نے بھی اس دعوت پر بیک نہ کماتا میں نے ٹھنٹ اخاکر منہ سے لکالیا اور آہست آہست
اس شاندار اور ٹھنٹے دی کو پہنچنے اور کھانے لگا۔۔۔ اور آج پھر میری تھکاوٹ زائل
ہوئی۔۔۔ میرا گڑھرا آتا ہوا بیٹ دوست ہوا اور وہ نامعلوم ٹھنٹے آور حرم کا سرو رو بھی
زاکل ہو گیا ہو نیزی میڈو میں ٹھنٹے ہی شروع ہو گیا تھا۔۔۔ یہاں ذرا کچھ بلندی کا

گاؤفرے بولے تھے کی اوث میں آگ جلا رہا تھا اور اس کی کتھی میں پکن
نوڑ سوپ اٹل رہا تھا، اس کے بعد آئیں بھی تیار ہونا تھا۔
تحامس اور مشاکلہ بھی ذرا کم لے اور اپنے بارے میں سمجھو کرنے لگے۔ "ہم تبت
میں تھے۔ کوہ کیلاش دیکھنے لگئے۔ لاس اور کھلشنڈو بھی دیکھا گیکن۔ ہمیں معلوم نہ تھا
پاکستان میں یہ بھی ہے۔" اور "یہ" سے ان کی مراد وہ سب کچھ تھا جس کے حصار میں
ہم بیٹھتے تھے جو ہمارے آس پاس بلند تھا، ہو اندھیرے میں بھی نظر آتا تھا۔
کھانے کے بعد ہمارے جرمن گگ نے کافی کے گرم کہ ہماری بھتیجیوں کے
درمیان میں رکھ دیجے۔
گاؤفرے اپنے سینگ بیک میں لیٹ گیا اور سر کے پنجے پانڈ رکھ کر بولا۔ وہ
ہم سے کچھ دور تھا اس لئے اندھیرے میں اس کی آواز آئی "اپر دیکھو"
اوپر آسمان تاروں سے بمرا ہوا تھا۔
"او مائی گاؤ" مشاکلہ تحامس کے پانڈ پر جھکی ہوئی بولی "یہ تارے تو اتنے
نزدیک ہیں یہاں سے۔ تحامس میں ہم کھاتی ہوں یہ پچھے گر پڑیں گے۔" وہ بے حد
سبزیدہ تھی۔
"اگر یہ پچھے گر پڑیں گے تو ہم انہیں اخالیں گے۔" گاؤفرے کی بخشی ہوئی
آواز آئی اور "پھر انہیں اپنی جیبوں میں سنجال لیں گے اور جب بکھی اواس ہوں گے
تو چکے سے اپنی جیب میں جھاک لیا کریں گے۔" تم نے وہ گیت نہیں سنا کہ ایک
ستارے کو سنجال لو۔ اپنی جیب میں سنجال لو برے دختوں کے لئے۔
"ستا ہے۔"

میں بھی من اخالیے تاروں کو دیکھتا جاتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اگر
اپ ناٹا پرست کی جانب دیکھتے رہیں تو تارے اس کے پیچے سے طلوع ہوتے رہتے
ہیں۔

"ورختوں کی طرف دیکھو۔" گاؤفرے پھر بولا۔
اور چیز کے درختوں پر جو آسمان تھا اس میں بہت سارے ستارے یکدم نوٹ کر
بڑھنی پچھلاتے گم ہو رہے تھے۔ ایک اور تارے نے سفید دوہو جیسا راستہ بنا لایا۔
"اوہ۔" گاؤفرے یکدم بولا۔ "تم نے ستارہ نوٹھے دیکھ کر کوئی خواہش کی؟"
ہاں۔" میں نے اندھیرے میں سرہا لایا اور اندھیرے میں آنکھوں کی نئی نظر

بیٹھ رہوئے کے لئے دے دے گا۔
میں نے اگلی بیج تحامس ایڈن کپنی کے ساتھ ناٹا پرست کے میں یکپ جانے کا
فیصلہ کر لیا۔ مطیع سے پوچھا تو کہنے لگا "پسلے تھے ہاتھیں اکڑی ہوئی ہیں اب بیج
سوارے پھر چھاٹی بھجے سے نہیں ہو گی لیکن مجھے جگانہاں میں کوشش کروں گا۔"
اوہ مریزل پاس تھا۔ اور گھنے جنگلوں کے علاقوتے تھے اور ناٹا پرست کی بلندی
تحی چنانچہ شام بڑی تیزی سے نیزی میڈو میں اترنے لگی۔ وہاں اندر ہمرا پھیلائیں گیا لیکن
ہمارے سامنے ناٹا پرست کی سفید دوار پر دھوپ سخ ہو رہی تھی۔ جیسے وادی پنلو
کے گھر میں ایک لڑکی نے باہر جھانکا اور ہمیں دیکھ کر اس کے گال ہمارے دیکھتے دیکھتے
سخ ہو گئے تھے پھر وہ سرفی دم دم ہونے لگی۔

"میرے پاس رات کے کھانے کے لئے تھوڑی سی کشش اور خوبی کے بادام
ہیں۔" گاؤفرے کے ہاتھ میں ایک پچھوٹی سی پوٹلی تھی۔

"تم صرف یہ کھاؤ گے؟" میں نے جھرت سے پوچھا۔

"تھیں ساتھ پانی بھی بیوں گا۔"

میں نے خیس سے اپنی خوراک کا مکمل ذخیرہ نکال کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیا
"تم ہمارے مہمان ہو۔ جو ہی چاہے کھاؤ۔"

گاؤفرے کی آنکھیں مکھیں مکھیں "اوہ مائی گاٹ۔" سوچ فوٹ سوپ۔ پھلی۔
کوشش۔ نہیں۔ چاول اور۔ سعدن اپ۔ میری ایک ڈھکش ہے۔ میں بہت
نہدست گک ہوں۔ خوراک تھماری ہو گی اور اسے پاکاؤں گا میں۔ اور تھوڑا سا
میں بھی کھاؤں گا؟"

"یہ ملے پا گیا۔" میں نے خیس کر کما اور اس کے پرستے ہوئے ہاتھ کو قائم
لیا۔

ہم سب خلک کے باہر ہو بخاری سویٹر پہنے ہوئے ناٹا پرست کی جانب من کے
ہوئے بیٹھے رہے۔ وہ اب تاریکی کے باہر ہو صاف نظر آ رہی تھی۔ رائے کوٹ
گلیشزر کے پچھے چلتے والے دریا کا سور کم ہو گیا تھا کیونکہ اب سردی کی وجہ سے
چھوٹے موٹے نالے بھی جم پکھے تھے اور برف نہیں پکھل رہی تھی۔ اور ناٹا پرست
اسی دکھائی دیتی تھی جیسے ملی دیرین آف کر دیں تو اس کی سکریں اندھیرے میں بھی نظر
آئی رہتی ہے۔

میں آتی "میں نے خواہش کی کہ میں اپنے بچوں سے ملو۔۔۔ آج انھیں دیکھے گئے
دوسروں کے ہیں" ۔۔۔
خیری میدو کے چڑاہوں کے کتے زور زور سے بھوکھتے گے۔

"بیس یکمپ نانگا پرہت"

رات بہت گھری نیند آئی۔

ہمارے سینپنگ بیک بلندیوں کے آزمودہ تھے کیونکہ یہ کے نوکے میں کچپ سے ہو کر آئے تھے اور سمجھ بہتر کے تھے۔ اور ہمارا اگھو خیرہ کمل طور پر ہوا بند تھا اور ہم اس کے اندر نہایت آرام سے تھے اور کبھی کبھار اس کا کپڑا ہوا کے زور سے دلتا یہ احساس دلانے کے لئے کہ باہر موسم سرد ہے۔۔۔ جب میں سینپنگ بیک میں گھس کر لیتا ہوں تو مجھے کچھ ابھسنی محسوس ہوئی۔۔۔ جیسے سانس لینے میں وقت ہوتی ہو اور ہوا بدن میں کھینچنے کے لئے معمول سے زیادہ زور لگاتا ہوتا ہو لیکن یہ بلندی کی وجہ سے تھا اور اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ دوسری ابھسن خاموشی کی تھی۔ ایک سناتا۔۔۔ اور اس سناتے میں صرف رائے کوٹ گلیشیر کے نیچے پوشیدہ دریا چلنے کی آواز۔۔۔ خیسے کا کپڑا پھرپھرا تا ہوا۔۔۔ مطیع کے مسلسل خرانے۔۔۔ تو اس نا آشنا خاموشی سے ابھسن ہوتی۔۔۔ لیکن اس رات نیند بہت گھری آئی اور ایسی آئی کہ دل و دماغ کے اندر ان کی = میں گھری ہو کر بیٹھ گئی۔

ہاں رات کے چھپٹے پھر میں جاؤ گیا۔۔۔ کچھ ہوا تھا۔ کوئی تبدیلی تھی۔ کیا ہوا تھا؟۔۔۔ شاید دریا کا شور میرے کافوں تک نہیں آ رہا تھا کیونکہ سناتا کمل ہو چکا تھا۔ کیا دریا بند ہو گیا ہے؟ میرا نرم خوابیدہ زہن تکل بیچ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دریا رک جائے۔۔۔ لیکن کچھ تو ہوا تھا کیونکہ دریا کے چلنے آواز نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے جب اس خاموشی کو قبول کر لیا تو ایک بلکا سادھاکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی دریا کی آواز پھر سے میرے کافوں میں آئے گی۔۔۔ اور اس رات یہ عمل دو تین بار ہوا۔ دریا کی آواز بند ہو جاتی اور تھوڑی دیر کے بعد پھر سے جاری ہو جاتی۔۔۔ اگلے روز ایک مقامی چڑاہے نے چالیا کہ دراصل زیر برف بستے والے دریا کے راستے

زرا خوفزدہ ہو کر، احتیاط سے اور مرعوبیت سے دیکھتے ہیں کہ اس پر ایک نظر آپ کو
حیرتیا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ آپ سے پرے اپنی الگ دنیا میں ہے اور آپ اس دنیا
میں داخل فیض ہو سکتے۔ مجھے آج اس دنیا کے گناہے تک جانا تھا۔ یعنی میں یکپ
تکب۔ دھوپ دیکھتے دیکھتے برف پر چھکتی ہوئے آگے ہو رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا
بادل کہیں سے نمودار ہو کر نانگا پرست کی چونی کے گرد پانچ کی کوشش میں تھا۔
میرے سامنے نانگا پرست کی چونی تھی اور یہ آٹھ ہزار ایک سو چھیس میڑ بلند
تھی۔ اس کے دائیں جانب ذرا پیچے گنالو کی چونی تھی جس کی بلندی سات ہزار میڑ
کے قریب ہے۔ نانگا پرست کے دائیں جانب تین خوبصورت چوٹیاں لیکے بعد دیگرے
نظر آئیں یعنی سلوو پیک۔ شاید اسے چاندی کی چونی اس لئے کہا جاتا ہو کہ دھوپ
اومر سے آتی ہے اور اس کی برفوں کو چاندی کی طرح چکاتی ہے۔ سلوو کوت کے بعد
رائے کوت پیک ہے اور پھر پنگورہ پیک ہے۔
دریا ایک مرتبہ پھر رک گیا تھا۔

نانگا پرست کی ہلالی حسین محل دھوپ میں آچکی حصیں لیکن رائے کوت
گلیشیر، برزل پاس، فیری میڈو اور جگل سب کے سب ابھی گھرے سامنے میں تھے۔
”کیا یہ تم ہو مٹ آنر۔“ یہ تھامس کی آواز تھی۔ شاید میں کھانا تھا۔
”بال۔“

تھامس کے خیے کے قریب گاؤفرے سووا ہوا تھا۔ اس نے کوت بدھی اور دہ
سووا ہوا نہیں تھا۔ ”یہ بالکل مٹ آنر ہے تھامس اور یہ پچھلے آدھ کھنے سے یہاں
بدھ بھکھوؤں کی طرح بیٹھا نانگا پرست کو دیکھ رہا ہے۔ اور میں اسے دیکھ رہا تھا۔
”اوھ آ جاؤ گاؤفرے۔“ میں نے سکراتے ہوئے کہا۔

”میں میں اپنے سلیپنگ بیک کی گرفتی اور اپنے چہرے کو چکرتی سردی سے
لف انزو ہو رہا ہوں۔“

”رات کیسی گزری؟“

”بہت شاندار۔“ وہ انھ کر بینے گیا۔ پھر اس نے داڑھی میں زور سے کھجولی
کی اور سلیپنگ بیک کو پیٹ کر میرے پاس آ گیا۔ ”مجھے یاد آیا کہ آج ہم نے میں
یکپ تک جانا ہے۔ اور رات بہت شاندار تھی۔“ پورپ میں لوگ کھلی فضا میں
سوئے کے مزے کو بالکل نہیں چانتے۔ کوڑوں لوگ ہیں جو آج تک باہر تھامس پر یا
اپنے فارم کے کسی کھیت میں کھلی فضا میں نہیں سوئے۔ وہ کھنے ہیں کہ یہ کوئی
خیلہاں کی بات ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ پھر میں آشیلیا گیا تو وہاں پہلی بار اپنی

میں کبھی کھار بہت بڑا توڑا گر جاتا ہے اور اسے بند کر دتا ہے۔ پھر آہستہ پانی کا
دباو بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے راستے میں آئے ہوئے برقانی تودے کو دھکیل
کر حسب معمول بننے لگتا ہے۔ باہر بھلی کی روشنی ہوئی تو میں نے ہارج جلا کر وقت دیکھا۔ سائزے چار بیج
رہے تھے۔ میں نے خیے کے پردے کی زپ اتماری اور باہر جھانکا۔ نانگا پرست ایک
صاف آسمان میں اور نانگا پرست سے مراد صرف ایک چونی یا پھاڑ نہیں ہے بلکہ نانگا
پرست کا سلسہ کوہ ہے جس میں کلی چوٹیاں اور درے شامل ہیں۔ برف کے قلمے اور
سفید دیواریں۔ رائے کوت چونی کی جانب سے برف کا ایک چھوٹا سا حصہ دھوپ میں
آرہا تھا۔ میں خیے سے باہر آیا اور رہیز میڑس بچا کر بینے گیا۔ سروی تھی لیکن بے
آرام نہیں کرتی تھی، صرف اپنے ہونے کا پتہ ہاتھی تھی۔ نانگا پرست ایک پھر پوٹ
کارڈ کی طرح سفید اور شفاف اور ایک ایک تسلیل کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔
اس سچ وہاں اور کوئی نہ تھا جو اسے دیکھتا تھا۔ فیری میڈو میں مکنے جگل اور رائے
کوت گلیشیر کے آس پاس کوئی نہ تھا جو میری طرح اس پر نظر سے جانے بیٹھا تھا۔

یہ علاقہ وہی تھا ہے قدیم زمانہ میں درودستان کتے تھے۔ یہ عظیم ہالیہ کا وہ مغلی
حصد ہے جو وادی گلیشیر سے کھلا ہوا دریائے سندھ کے قریب قراقرم کے سامنے آ
جائتا ہے۔ اور ہالیہ کا یہ حصد نانگا پرست کی عظیم چونی کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔
آج ان علاقوں کو دیوار کتے ہیں۔ نانگا پاہاڑ۔ اور یہی نانگا پرست کا مقامی نام ہے۔
اسے دیاموری بھی کہتے ہیں۔ اسے قاتل چونی اس لئے کہا گیا کہ اب تک پچاس کے
قریب کوہ پیلا اسے زیر کرنے کی خواہش میں خود زیر نہیں جا چکے ہیں۔ بلکہ زیر برف
کھنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اور اس قتل کا آغاز پہلی برجانوی میم کے لیڈر مری سے ہوا
جو ۱۸۹۷ء میں نانگا پرست کی جانب آئی۔ مری کے ایک ساتھی نارمن کوئی نے حادثے
کے بعد اپنی ڈائری میں لکھا۔

”سورج کی روشنی اور خوبصورتی ختم ہو گئی۔ وحشی، خالم اور دھکارتی ہوئی نانگا
پرست۔ اس اپنی سرزنش میں صرف خوف اور وحشت ہے۔ اور سب سے زیادہ
خوفناک احساس یہ ہے کہ۔۔۔ یہ چیز آپ کے سامنے تھی کھڑی ہے اور اسے پرواہ
نکھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔۔۔ اس کی پتھری بدبیزی، اس کی خالماں وحشت
اور انسان کی کوششوں سے مکمل لاپرواٹی ایسی جیزیں ہیں کہ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو
جاتا ہے کہ یہ جگہ کسی اور دنیا میں واقع ہے۔۔۔“

اور یہ درست ہے۔۔۔ آپ نانگا پرست کو لاپرواٹی یا پیار سے نہیں دیکھتے بلکہ

کی طرح ائمہ ہوئی تھی اور چراغاں کے درمیان پینے والے پانی صبح کی روشنی میں ایسے تھے جیسے پارے کی ندی ہو۔ دائیں جانب کے پھانسوں سے برف کی مجدد عداں نیچے سک آ رہی تھیں۔۔۔

ہم جگل میں داخل ہو گئے۔ بلکہ جگل ہمارے اندر آیا اور رس بس گیا کیونکہ اگلے ایک سخنے کے لئے ہم اس کا ایک حصہ تھے۔ چیز کے بلند درختوں کے نیچے چیز کے خلک بال ڈھیروں کی صورت میں پڑے تھے۔ توں کے گرد ہماری پتوں کی نیلیں بزر سانپوں کی طرح لٹپٹی ہوئی تھیں اور یہ درخت بے حد قدیم تھے۔ مشاہد پڑنے پڑنے جھکی۔۔۔ "تحامس" اس کی قریب ہوا "تحامس جگل کے فرش پر نیچے ہوئے یہ پودے دیکھو۔ کیا زرد مرکز اور سفید پتوں والا یہ پھول سڑا بری کا نہیں ہے؟"

تحامس نے جھک کر ان لاقعہ دیکھا جو فرش کے ساتھ نیچے ہوئے تھے۔۔۔ "تم درست کہتی ہو یہ سڑا بری کے پودے ہیں۔۔۔ لیکن اتنے زیادہ۔۔۔ پورا جگل بھرا پڑا ہے۔۔۔"

میں نے سڑا بری کے پودے کو بڑھتے اور پھول کے بعد پھل بننے دیکھا تھا اور میں جاتا تھا کہ اگلے پانچ چھ ہنتوں کے اندر اندر اس پورے جگل میں سرخ سڑا بری بھی ہو گی۔۔۔

جگل میں ایک چھوٹی سی ندی بھتی تھی اور اس کے پانوں کے اندر بھی بزرہ تھا کہ اس کی گمراہی کہیں بھی ایک دو فٹ سے زیادہ نہ تھی۔۔۔ اور اس کے پانوں میں چیز اور برج کے سفید درخت جانے کن مدبویں سے گرتے تھے اور کھوکھلے ہو کر دھیرے دھیرے ختم ہو جاتے تھے۔۔۔ یہ اس کے سفید اور بزرگانوں میں آڑے تر جاتے اور بے بس ہو کر سفید اور سیاہ ڈھانچوں کی طرح پڑے تھے۔ ان ڈھانچوں کو با آسانی اٹھایا جا سکتا تھا کہ یہ مسلسل بارش اور برف ہماری سے کھوکھلے ہو چکے تھے۔۔۔ ان گرے ہوئے درختوں میں سے تھے درخت اور پودے پھوٹ رہے تھے۔۔۔ یہ جگل مختلف تھا۔۔۔ اس نے کہ جب سے یہ دہوڑ میں آیا تھا تب سے یہاں کوئی لکھا را داخل نہیں ہوا تھا۔۔۔ یہاں قدرت کا ایک نظام اپنے حساب سے جاری و ساری تھا۔۔۔ درخت اگتے تھے، اپنی طبعی عمر کو پختے تھے اور پھر یا تو کسی طوفان یا تیز ہوا کے باعث گر جاتے تھے اور یا پھر دیہیں کھڑے کھڑے سوکھ جاتے تھے اور زرا سی ہوا سے بھی چڑھاتے تھے اور ہم جیسے مسافروں کو ڈرانتے تھے کہ ہم گر سکتے ہیں۔۔۔ اور ہمارے

بھیڑوں کے قارم پر باہر سووا۔ اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ تو ایک بالکل نئی زندگی تھی۔ اور میٹ آئر کھلی فنا میں سونے سے آپ اپنے چہرے پر موسم بدلتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ جب ہوا آتی ہے۔ جب اوس پڑتی ہے۔ جب دھوپ چکتی ہے۔ تو یہ سب کچھ تم خود محسوس کرتے ہو۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اوس پر ری تھی تو میں جاگ گیا اور پھر اس کی نئی کی پھوار کو محسوس کرتا سکرا تا رہا۔۔۔ میں تمہارے لئے کافی ہتاوں؟"

"نہیں نہیں۔ شکریہ"

"لیکن میں تو تمہارا آئیشل گک ہوں۔۔۔ گک گاؤفرے" وہ اٹھ کر درختوں کی جانب چلا گیا۔۔۔

"کشن مار گن۔۔۔"

"آہ تم جرم نہ ہوئے ہو۔۔۔"

"بس اتنی سی ہی۔۔۔ کیا ہم روانہ ہو رہے ہیں یا نہیں۔۔۔"

اس کا سرخیے کے اندر ہوا۔ پھر باہر آیا "بس پانچ منٹ۔۔۔"

پانچ منٹ میں گک گاؤفرے نے کافی تیار کر لی۔۔۔ اور پانچ منٹ میں تحامس اور مشاہد تیار ہو کر نیچے سے باہر آگئے۔ مطیع نیند میں تھا اور اس نے نیند میں ہی اعلان کیا تھا کہ "میکلوں ٹھنڈل گک ولی" اس یادگار صبح کی ایک تصویر میرے سامنے ہے جو گاؤفرے نے اتاری تھی۔۔۔ ہم تینوں اتنے گمرے سائے میں ہیں کہ بمشکل نظر آتے ہیں پہاڑی سے اتر رہے ہیں۔ مشاہد نے ایک چھوٹا سارک سیک اخبار کھا ہے جس پر اس کے سری بالوں کے چھوٹی آرام کر رہی ہے اور وہ پاکنگ ڈنک کے سارے اتر رہی ہے۔ تحامس کے پاس پانی کی بولی ہے اور اس کی عینک کے شیشے گمرے سائے میں بھی چکتے ہیں اور اونکے آگے میں ہوں" قدرے جھکا ہوا پاکنگ ڈنک تھا۔۔۔ ہلکوار قیض اور ایک ہلکے سوٹر اور سفید پی کیپ میں۔۔۔ لیکن اس تصویر میں یہ کوار اہم نہیں اس کا اصل جال سائے سے نیچے رائے کوٹ گلیشیز کے سرگئی دریا اور پھر مکمل طور پر دھوپ سے روشن نانگا پرہت میں ہے۔۔۔ یہاں لگتا ہے ان برفوں میں دوپر ہو چکی ہے۔

ہم چاروں اپنی چھڑوں پر بوجھ ڈالتے نیچے نیزی میدو میں آئے۔۔۔ یہاں ابھی تک تھائی تھی۔۔۔ اور خالی ہونے کی بنا پر اب یہ خاصا بڑا لگ رہا تھا۔۔۔ اور اس صبح میں نے جانا کہ نیزی میدو کیا ہے۔۔۔ نانگا پرہت سیاہ جگل کے اوپر ایک سفید جمال

ہم سانس لینے کے لئے رکے اور ندی سے پانی پینے کی کوشش کی۔ لیکن پانی کو لوں تک لانے سے پیشتری بھتی سن ہو جاتی اور ہم پا سے رہ جاتے۔ اور ہاں کی پار مور پنگ کے حصے درخت یوں لگتے ہیں موتے موتے بزر ریچہ دنوں نامگھوں پر بیٹھے ہمیں دیکھ رہے ہیں اور ہم لمحک جاتے۔ اور یہاں پرندے بہت کم دکھائی دیتے۔ شنید تھا کہ مارخور کے خلاوہ ان خطلوں میں رام چکور اور مرغ زریں پایا جاتا ہے۔ مارخور تو ظاہر ہے، اور ہر نزل پاس کے آس پاس ہوتا ہو گا اور اور اگر مرغ زریں تھا تو نبھی الحال کسی سمجھ میں پوشیدہ، خوابیدہ تھا۔ اس سے احساس نہ تھا کہ مجھ ہو بھی ہے اور چند مسافر اور ہر سے گزرتے ہیں۔

یہاں یکپ کے چپائی باخ کے بعد درخت ذرا کم ہو گئے اور ایک سر بر بزر ڈھلوان اور یہاں یکپ کے ویران گاؤں کے اوپر ایک پار پھر نالگا پرست کی منڈور سیلاپ کی طرح یکدم رکی ہوئی نظر آئی۔ جیسے یہ اب ہمارے اوپر آگرے گی۔ یہاں یکپ بھی تاتو اور مٹھائی کے پاشندوں کا سر یکپ ہے۔ وہ یہاں اپنے موٹی چڑائے آتے ہیں اور پھر سرویوں میں واپس ٹھیٹے جاتے ہیں۔ ہم گاؤں کے جھوپڑوں کے پاس سے گزرے تو یہاں بالکل ویرانی تھی۔ پھر ایک پچھر دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور اپنی بند مٹھی ہماری آنکھوں کے پاس لا کر کھول دی۔ اس میں پتھر کے چد گلڑے تھے۔ وہ اپنی زبان میں کچھ کہتا تھا جو ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ ہم سب نے اس کے ساتھ زبردستی ہاتھ ملایا تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا۔ یہاں یکپ سے آگے تھوڑی چڑھائی اور یہاں دوچڑا ہے جو ہمیں دور سے دیکھتے تھے میرے بلاں پر قریب آگئے۔

ان کے ساتھ ساتھ ان کی کل بکھوار بھی ہمارے قریب آگئیں۔ مشاکلہ نے "ہاؤ سوٹ" کہہ کر ان کو ہماری پاری پار کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ ایک بکھی جو یقیناً بکرا تھا مشاکلہ کی زانوں پر منہ رکھ کر تقپیا مبت ہو گیا۔ اس پر سب نے تھامس کو ذرا پچیڑا کر بڑے یہاں یہ بکرے آپ کے قریب ہو گئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جب بھی تھامس مشاکلہ کے قریب جاتا تو وہ بکرا اسے نکر مارنے کے لئے پوزیشن لے لیتا۔

یہ یہاں یکپ کا آخر تھا۔ اور سب سے اور خوبصورتی کا بھی۔ کیونکہ آگے نالگا پرست تھی۔ سیاہ اور خطرناک چائیں۔ پھر بھرے پماڑ اور گلیشیز۔ میں نے نوجوان چواہے سے میں یکپ جانے والے راستے کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ ہمیں اس مقام پر لے گیا جہاں ایک بہت بڑی چٹان تھی، جہاں سے

سانتے ایسا ہوا۔ چنانچہ ہم ذرا خوف میں بھی چلتے تھے۔ یہاں ہم زمین پر میں چلتے تھے، کیونکہ یہاں زمین تھی نہیں۔ ہزاروں برسوں سے جو پتے، شنیاں اور رتے کرتے تھے وہ ایک سامدار نہیں سیاہ بردے کی صورت میں ہے درد جنتے چلتے جاتے تھے۔ اس بردے میں پانی آسانی سے جذب ہوتا تھا اور اس میں سے گھاس اور پھول نکلتے تھے۔ یہ فرم کی طرح نرم تھا اور اس پر چلتے سے پاؤں کو آرام ملتا تھا۔ میں نے بھی ایسا مظہر نہیں دیکھا تھا۔ سورج کی روشنی اور ہر یوں بھی کم آتی تھی اور ابھی تو یہ جگل سائے میں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اورہ سے کوئی گزرتے رہتے ہیں اور یہ چراگاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا گلہ تھا کہ ہم پسلے انسان ہیں جو اس کی ہزاروں برس کی خلائی میں غل ہوئے ہیں۔ یہ قدرت کا ایک معبد تھا اور ہم اس میں جو توں سمیت چلتے آئے تھے۔ جیسے یہ نالگا پرست سے اترے والی روایتی پریوں کا باخ تھا۔ برف کی پیاں مینڈک اور سفید اڑھے اس کے مکین تھے۔ جہاں جہاں پانی چلتا تھا دہاں کناروں کے ساتھ چڑی کے جو چھوٹے درخت تھے ان پر پانسائی درختوں کا گمان ہوتا تھا۔ یعنی چھوٹے چھوٹے لیکن جزئیات میں مکمل۔ جیسے کسی جادوگر نے اسیں چھوٹا ہنا دیا تھا۔ ہمارا راستہ جگل میں سے نکل کر اس بلندی پر آگیا جہاں رائے کوٹ گلیشیز گمراہی میں تھا اور ابھی سائے میں تھا۔ البتہ اس پر عمودی کھڑی چٹانوں میں سے گھاس اور سرخ پھولوں کی لڑائی لٹکتی تھیں اور ان لڑیوں اور پیچے برف کے درمیان سیکنڈوں میٹر کا فاصلہ تھا۔ دھوپ اس چٹان پر اترے کو تھی۔

یہاں سے ایک راستہ بلکہ چھوٹی سی گلندڑی اترتی تھی۔ ہم بے حد اختیاط سے اس پر اترے گئے۔ اور یہیں سے یہاں یکپ کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے درمیان میں بھی ایک ندی چلتی تھی لیکن یہ ایک باقاعدہ ندی تھی اور اس میں تیزی بھی تھی اور گمراہی بھی۔ لیکن یہ نظر کم آتی تھی کیونکہ ہم اپنے ہی قد کے چھوٹے چھوٹے درختوں میں چلتے تھے۔ موتے موتے مور پنگ کے درختوں کے یہوں چھلٹے تھے اور اگرچہ ایک دوسرے کے آگے بیچھے چلتے تھے لیکن ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے تھے اور ہر شخص اپنے آپ کے ساتھ تھا تھا۔ یہ علاقہ ایک جیلانی باخ کی طرح تھا۔ اس میں درخت پودے اور جھاڑیاں ایسی تھیں جیسے باقاعدہ منصوبہ بندی سے لگائی گئی ہوں۔ اور یہ سب جیزیں مختصر تھیں۔ یہاں یکپ کا یہ حصہ خوبصورتی کی ہیئت ٹرک تھا۔ سلے نشتری۔ پھر قدیم جگل اور اب یہ جیلانی باخ۔

"کون میں؟" میں نے بد کر کما۔ "ہاں کیوں نہیں۔۔۔" اور یہ میں نے سپے کچھ بخیر کہا تھا۔
تو پھر فیری میڈو میں آج شام ملاقات ہو گی۔۔۔ میں نے جتنی نانگا پرہت دیکھنا تھی دیکھ لی۔۔۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔۔۔" گاؤفرے نے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا اور سینی بجا تا ہوا ان چوواہوں کے پاس چلا گیا جو دور کھڑے ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

"آؤ۔۔۔" تھامس نے کہا۔
ہم اس پہاڑی سے ذرا نیچے گئے اور پھر کچھ گندہ گندہ پر آگے پیچھے چلتے گئے۔۔۔ اور یہ راست اتنا ہی خطرناک تھا جتنا کہ یہ اور سے دکھائی دتا تھا۔ ہمارے اور رائے کوٹ گیشیز کے درمیان کچھ نہ تھا۔۔۔ پاؤں تے جتنے کلکر آئے اور لڑکے وہ دو سو میڑ کی ڈھلوان پر بلاروک توک رفتار پکڑتے پیچی گیشیز کی گمراہی میں گم ہوئے۔۔۔ راستے میں روکنے کے لئے نہ کوئی جہازی تھی نہ کوئی پتھر۔۔۔ صرف بھر بھرے سنگریے تھے۔۔۔ میں نے صرف ایک بار رک کر نانگا پرہت کو اپنے اوپر المدت دیکھا وہاں وہندہ اتر رہی تھی لیکن یہاں ابھی وحوب تھی اور یہ ایک نمائیت شاندار اور عظیم الشان منظر ہوتا۔ اگر میں اسے اپنے گھر میں کافی پہنچتے ہوئے ٹیلی ویژن پر دیکھتا۔۔۔ لیکن یہ میرے سامنے تھا اور میں ایک بھر بھری پہاڑی پر متعلق تھا اور نیچے رائے کوٹ گیشیز مسلسل چلتا تھا۔ بولا تھا جیسے بیانات ہو۔۔۔ اور اس کے پیچی جو پوشیدہ ہریا تھا اس کا شور بھی ہم تک پہنچتا تھا اور اس وقت ہم نانگا پرہت کے دامن کی وسعت میں اکیلے تھے اور نہ کوئی ہمیں دیکھتا تھا اور نہ ہم کسی کو دیکھتے تھے۔۔۔ تو دو اسیں ہاتھ پر رائے کوٹ گیشیز کا نوکیلا شری نیچے تھا اور ہائیں ہاتھ پر بھری بھری سنگریزوں والی پہاڑی آسمان کو جاتی تھی اور اس کی ڈھلوان پر کہیں کہیں صرف گھاس سرسراتی تھی۔۔۔
اوپر ہمارے سروں کے عین اوپر نانگا پرہت پر ایک مدھم ہی گڑگراہت ہوئی۔۔۔ اور یہ کوئی برقلانی توہہ نہ تھا بلکہ گھرے بارل تھے جو گھنے ہو رہے تھے۔۔۔

ہم تینوں صرف کچھ راستے کو دیکھتے تھے اور ہماری احتیاط ہمارے قدموں میں تھی۔۔۔ یہاں احساس ہوا کہ ایسے حالات کے لئے جاگر شوز نمائیت بے کار ہوتے ہیں اور خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ بھر بھری جگنوں اور سنگریزوں پر نہیں ٹھرتے۔۔۔ یہاں کے لئے ہمیں کچھ بوث ازحد ضروری ہیں۔۔۔ بیجی بات تھی کہ جیسے صرف میرے پاؤں میں تھا پھرے پر نہ تھا۔۔۔ بارل زیادہ گرجنے لگے اور ان کی آواز

دہشت کا آغاز ہوتا تھا۔۔۔ نیچے ہمارے قدموں میں رائے کوٹ گیشیز کے سرمنگی اہرام تھے۔۔۔ اہرام اس نے کہ مسلسل پھیلاؤ اور سکونت کے باعث اس کی بروفون کی مغلی تھکنوں میں بٹ پھیلی تھی اور یہ سیکھنزوں بھاری بھلی تھکنوں آہستہ آہستہ حرکت کرتی تھیں اور ان میں سے آواز آتی تھی۔۔۔ یہاں زندگی میں میں نے پہلی بار گیشیز کی آواز سنی۔۔۔ ایک گڑگراہت۔۔۔ جیسے کچھ نوٹ رہا ہو اور یہ آواز دل کو خوف سے بھرتی تھی۔۔۔ تو ہمارے قدموں میں تقریباً آدھ کلو میٹر نیچے سرد سرمنگی اہراموں کا ایک نجمد دریا تھا جو گڑگراہت تھا اور شاید اپنی جگہ بدلا تھا اور جہاں یہ ختم ہوتا تھا وہاں سے نانگا پرہت کے خیلد گیشیز شروع ہو جاتے تھے۔۔۔ اور نانگا پرہت پر دھوپ کم ہونے لگی تھی اور ایک گھری وہندہ نیچے آری تھی۔۔۔ صرف میں نہیں سب لوگ اس منظر کو دیکھ کر خاکے دہشت زدہ ہو گئے۔۔۔ ہمیں تو آگے جانے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دتا تھا لیکن چوواہے نے ایک کچھ لکیر کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے نیچے رائے کوٹ گیشیز سے تقریباً دو سو میٹر کی بلندی پر اس بھر بھری پہاڑی میں نظر آری تھی جو گیشیز کے ساتھ ایک سو میٹر ڈگری کا زاویہ بنادی تھی۔

"ہا۔۔۔" گاؤفرے نے سرہا بیا۔" یہ راستہ میرے لئے نہیں ہے۔"
"کیا تم ڈر گئے ہو؟" میں نے ایک مردہ مسکراہت سے ہمادر بننے کی کوشش کی۔

"ہا۔۔۔" گاؤفرے نے صرف اتنا کہا۔
نوجوان چوواہے کو ہم نے اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے کیونکہ ہم اس کے سامنے اپنے جذبات کا انتہار نہیں کر سکتے تھے۔۔۔

"یہ راستہ میرے لئے بھی نہیں ہے۔۔۔" خاسی دری بعد مثالک بولی۔
"کیا تم بھی ڈر گئی ہو؟" میری آواز بیٹھنے لگی۔
"ہا۔۔۔" میں اس کچھ راستے میں گر کر گیشیز میں غائب ہونا پسند نہیں کروں گی۔۔۔

"وابس چلیں" میں نے فوراً کہا۔۔۔
تھامس نے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کے اور پھر اپنی ٹھوڑی پکڑ کر بولا "یہ راست اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ دکھائی دتا ہے۔۔۔ سب لوگ اور ہر سے ہی آتے ہیں اور اتنی دور آ کر ہیں یک پہنچ تک نہ جانا" عمر بھر کا پچھتاوا ہو گا۔۔۔
"ہاں یہ بھی ہے۔۔۔" مثالک دانت بھجنچ کرنے لگی "تم چلو گے؟"

پکے تھے اور اوپر سے بادل نالگا پرست سے پیچے آ رہے تھے۔

"کیا خیال ہے!" میں نے چھڑی سے گلیشیر کی نرم برف کو محوس کرتے ہوئے تھامس سے پوچھا اور اس نے نالگا پرست سے ایک تنہ ہوا میرے چہرے پر آتی تھی اور اسے بخوبی تھی۔ بوئندیا باندی کم ہو چکی تھی۔

"گلیشیر عبور کرنے کا میرا کوئی تجربہ نہیں۔" وہ گلرمندی سے بولتا۔

"جہاں جہاں برف پر پتھر پڑے ہیں وہ راست ہو گا۔ یہاں کے لوگوں نے رکے ہوں گے۔"

"یہاں رہتا کون ہے۔ نہیں میں تو دسک نہیں لے سکتا۔" تھامس نے فیصلہ دے دیا۔

"ہم میں کب نہیں دیکھ سکتے۔" مشائلہ روپا نی ہو گئی۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ میں کب کو ہاتھ لگا کر دیکھا جائے۔ یہ سامنے ہی تو ہے۔ وابس چلیں؟" تھامس نے مجھ سے پوچھا اور اس سے چھٹر میں یہ فیصلہ کر پکا تھا کہ کچھ ہو جائے میں اس مخدوش گلیشیر پر قدم نہیں رکھوں گا اور اگر تھامس اپنے مشائلہ جاتے ہیں تو جائیں میں ان کا نیسیں بینٹھ کر انتظار کروں گا۔ چنانچہ میں نے بظاہر لاپرواں سے کہا "نجیک ہے جیسے تم ساری مرضی۔" ویسے میرے خیال میں اس گلیشیر کو آسانی سے عبور کیا جا سکتا ہے۔"

"نجیک ہے۔" تھامس ایک پتھر پر بینٹھ گیا "تم ہو آؤ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں۔" اور وہ نہیں رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں کتنا خوفزدہ ہو چکا ہوں۔ تب میں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا اور مشائلہ بھی نہ رہ سکی اور ہماری اس نہیں میں شامل ہو گئی جو ہماری نالگا پرست سے قریب ترین نہیں تھی۔ اپر موسم زیادہ خراب ہو رہا تھا اور نہیں وابس جانا تھا۔ بادل اور دھنڈ اس گلیشیر تک آپکے تھے ہیں ہم چوم کے چھوڑ رہے تھے۔

"اور ہاں۔" تھامس ہستا ہوا رک گیا۔ "کم از کم میں اس کچے راستے سے وابس نہیں جاؤں گا۔ وہ کچھ زیادہ ہی خطرناک ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کون سا راستہ ہے؟" میں نے اس کی جانب دیکھا اور وہ اپر پہاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہم اگر کسی طرح اس پہاڑی پر چڑھ جائیں تو دسری جانب یقیناً یہاں کیپ ہو گائے۔ ہم اور ہر اتر جائیں گے۔"

گلیشیر کے چھٹے کی ساتھ مل کر زیادہ ڈراونی لگتی تھی۔ اس لمحے میرے اندر اس عظیم الشان پماز سے لطف انہوں ہونے کا احساس ختم ہو گیا اور میں اس سے خوفزدہ ہونے لگا۔ میری خواہش تھی کہ میں واپس پلا جاؤں۔۔۔ لیکن اس چھٹے سے راستے سے مرزا بھی دشوار تھا۔۔۔

میں کب اب دور نہیں تھا۔ چھٹی کے میں پیچے جہاں گلیشیر ختم ہو رہا تھا اس کے دامن میں۔۔۔ زیادہ سے زیادہ ایک گلوہ بیڑ دیں۔۔۔

رائے کوٹ گلیشیر یک مربل کھا کر مڑا۔۔۔ ہمارا راستے نیچے ہوا اور تھوڑی دیر میں ہم اس کے کنارے پر چلنے لگے اور یہاں کوئی خطرہ نہ تھا۔۔۔ میں پر وہ نالہ ہمارے سامنے آیا ہے ہم نے واپسی پر دو بجے سے پتھر عبور کرنا تھا۔ ابھی اس میں پانی خاصا کم تھا۔ ہم پتھروں کو پھلاتے پار چلے گئے۔

"ویسے یہ نالہ تھوڑی دیر میں ناقابل عبور ہو سکتا ہے کیونکہ ہماڑ میں تنی آڑی ہے۔۔۔" تھامس کہنے لگا۔۔۔ لیکن اب ہم ایک اطمینان کی کیفیت میں چلنے تھے اور ہمارے دل میں صرف ایک ڈر تھا کہ واپسی پر نہیں اسی کچے راستے پر چلنا ہو گا۔

اور پھر جیسے پلک جھکتے ہی موسم بدلتا گیا۔۔۔ بھلی بھلی ہوا چلنے لگی۔۔۔ ہمارے اپر چوٹی و دھنڈ اور سیاہ بادلوں میں گھری ہوئی تھی اور یہ گھری دھنڈ ذرا نیچے ہونے لگی اور پھر بوئندی باندی شروع ہو گئی۔ اور یہ کہتے کی کیا صورت ہے کہ یہ بوئندیں تقریبا برف ہی نہیں۔۔۔ اور مجھے اپنی ایک اور حیات کا بھی احساس ہوا کہ میں صرف ایک باریک سویٹر نما جری ساتھ لایا تھا اور میرے پاس بھاری جیکٹ ہوئی چاہئے تھی۔۔۔

تھامس اور مشائلہ پورا بندوبست کر کے لٹکتے تھے چنانچہ انہوں نے رک کر بیک میں سے بیکش نکال کر پہنچیں اور ان پر پارش سے بچانے کے لئے برساتیاں اوڑھ لیں۔۔۔ اور میں شلوار قپیض۔۔۔ میں چلا جا رہا ہوں خدا کے سارے۔۔۔

اور پھر گلیشیر ہمارے راستے میں آگیا۔۔۔ ہم تینوں رک گئے۔۔۔ یہ تقریباً سو میز چوڑا تھا اور نہیں اسے عبور کر کے دوسری طرف جانا تھا جہاں میں کبھی رہا تھا۔۔۔ چند پتھر ان مقامات کی نشاندہی کر رہے تھے جہاں سے گلیشیر قابل عبور تھا۔۔۔ ہم رکے رہے کیونکہ گلیشیر کے ساتھ خرسٹیاں نہیں کی جاسکتیں۔۔۔ اس میں درازیں ہوتی ہیں جن میں پھسل کر آپ ایک عظیم اور اندر ہیرے آئیں بکس میں جا گرتے ہیں اور پانچ منٹ کے اندر اندر گلیشیر کا حصہ بن جاتے ہیں اور جہاں سے گلیشیر نرم ہو جائے وہ ایک طرح کی برقلانی دلدل ہوتی ہے اور ہم تو پلے سے خاکے داشت زدہ ہو

اپر چڑھنے لگا۔ لیکن مجھے میرے پلے قدم نے بتا دیا کہ بھائی جان آپ نے تھات کی ہے.... اس پہاڑی پر صرف گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور بھر بھرے سکریزے تھے چنانچہ قدم تو کہیں نہ جاتا تھا۔ یوں بھی ڈھلوان کی وجہ سے قدم ٹیڑھا رہتا تھا اور پورے جسم کا زاویہ مغلن سی حالت میں بنا تھا۔ یہ بہت مشکل کوہ پیائی تھی اور میں اس کے لئے زندگی طور پر کم اور جسمانی طور پر زیادہ ناموزوں تھا۔ تھامس اور مشاکل مجھ سے کم عرجنے اور ان کے پہنچنے کے لئے کمی مرح کے ہوئے تھے۔ بہر حال میں نے ایک دانشندی کی کہ کہیں رکا نہیں اور گرتا رہتا اس مقام پر بخیج گیا جو نیچے سے تقریباً میں فٹ کی بلندی پر تھا۔ مشاکل فوراً آگئے چل دی۔ اور تھامس بھی۔ انسوں نے خاصی بلندی پر جا کر کہا کہ بس آگے تو میدان ہت کو اور آ جاؤ۔

"میں واپس جاؤں گا۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا اور میں جاتا تھا کہ میں واپس نہیں جا سکتا۔

"نہیں۔ اب بہت بہتر ہے۔" مشاکل اپنی ٹنک سے دوسری جانب اشارہ کر رہی تھی اور ایسے اشارہ کر رہی تھی جیسے دوسری جانب پنجاب کے میدان ہیں۔ "اب بہت بہتر ہے۔ آ جاؤ۔"

اور بہتر یہ تھا کہ اب سکریزوں کی بجائے گول گول پتھر تھے جن پر پاؤں رکھتا تو وہ رواں سکیس کی طرح چلنے لگتے اور سیدھے کھالی میں جا کر خوفناک آوازیں نکالنے لگتے۔ ایک بار دونوں پاؤں پر کھڑا تھا اور نیچے سے پتھر کمک رہے تھے اور میں تقریباً چار فٹ اسی حالت میں نیچے گیا لیکن لڑکنے سے بچ گیا۔ ہم تینوں اب ایک دوسرے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ بیچے رسول سے بندھے ہوں۔ ایک کا پاؤں پھسلتا تو دوسرا سنبھلنے کی کوشش کرتا۔ ہمیں کچھ پہاڑ تھا کہ آس پاس کیا ہے اور ہم کہاں ہیں۔ ہم صرف یہ جانتے تھے کہ ہم ایک مشکل میں ہیں اور دھوپ جا چکی ہے اور سرد نوکیلی ہوا ناگا پرست سے سیدھی آ رہی ہے اور ہم اس کے راستے میں ہیں اور وہ ہمیں ہنا دننا چاہتی ہے۔ اور ہم ہٹ نہیں سکتے کہ ہٹ کر جائیں کہاں۔

پہاڑی میں ایک نالے کی خلک گزر گاہ سامنے آگئی۔ رہت اور چھوٹے چوٹے پتھر اور اس کا زاویہ ایک سو چوتھیں کے لگ بھگ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ پہاڑی کی نسبت گزر گاہ تو زرا زیادہ شتابی سے دھڑام سے نیچے جا رہی تھی۔ اس کی چوڑائی چھ سات فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ پلے تھامس گیا اور پہنچنے کے لئے کمی تھی اور سملہ ہدایات کے مطابق اور وہ بھی جہاں کھڑی تھی مشکل سے کھڑی تھی اور سملہ ہدایات دیئے جا رہی تھی اور میں ان پر عمل کرتا تھیزی سے

"لیکن اس پر کوئی راست نہیں ہے اور راستے کے بغیر پہاڑوں میں شارت کرنا دانشندی نہیں ہے۔"

"یہ دانشندی نہیں ہے اور جس راستے پر سے تم آئے ہیں اسی پر سے واپس جانا انتہائی بے وقوفی ہے۔ میں نے تھیں چاہا نہیں تھا لیکن میں نیچے چلتے ہوئے گیکیز سے اغا خوفزدہ تھا کہ میں بول نہیں سکتا تھا اور میری ٹانگوں میں سکت نہیں تھی۔ میں اس راستے سے واپس نہیں جاؤں گا۔"

"یہ پہاڑی بھی تو خاصی سیپ و کھانی دیتی ہے اور سیدھی چلی جا رہی ہے بغیر کسی جہاڑی یا پتھر کی رکاوٹ کے۔"

میں بھی اس راستے سے نہیں لوٹا چاہتا تھا لیکن اس پہاڑی کے تیور بھی مجھے اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔

"تھامس مجھے بھوک گئی ہے۔ ہم پلے لج کیوں نہ کر لیں؟" مشاکل نے کہا۔

"یہ تمہارا آخری لج ہو گا۔" تھامس نے سرہلا یا "یہاں نہیں۔" میں سماں سے نکل جانا چاہئے۔"

اور واقعی یہ ایک عجیب اس دنیا سے باہر کی جگہ تھی۔ میں کوئی نہ تھا سوائے پہاڑوں کی آخری عظیت اور خوف کے۔ پاہل کی گرج اگرچہ سچ سے آتی تھی لیکن سملہ تھی اور تاریکی پرہیز رہی تھی اور ابھی صرف ڈڑھ بجا تھا۔ مشاکل اپنے سوپریز سے کمر بستہ ہوئی اور ہائینگ ٹنک سے پہاڑی کو تھک تھک کر یکدم اور پڑھنے لگی۔ وہ جہاں قدم رکھتی تھی وہاں سے سکریزوں پر لڑکتے حرکت کرتے ہوئے نیچے آئے لگتے۔ میں وہ بہت تیزی سے اور گئی۔ تقریباً میں فٹ اور پاہل کا پاس کی صورت حال کا جائزہ لیا اور کہنے لگی "آگے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آ جاؤ۔"

پلے تھامس گیا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مشکل سے گیا۔ اور ہاں اس مقام پر بھی راستے کوٹ گیکیز نیچے سے بچ رہا تھا اور اپر سے جتنے چھوٹے چھوٹے پتھر اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے وہ سیدھے گیکیز میں ہی جا رہے تھے چنانچہ اگر آپ لڑکتے ہیں تو ان پتھروں کے نقش قدم پر لڑکتے گیکیز کو جاتے ہیں۔ بہر حال اب کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے ہٹ کی اور مشاکل کی ہدایات کے مطابق اور وہ بھی جہاں کھڑی تھی مشکل سے کھڑی تھی اور سملہ ہدایات دیئے جا رہی تھی اور میں ان پر عمل کرتا تھیزی سے

مشائل۔ وہ قدرے جبکہ لیکن دوسری جانب پلی گئی۔

"اگر تم تجزی سے رکے بغیر جلدی سے آ جاؤ تو کوئی مسئلہ نہیں۔" "تمام بولا۔

"بجھے سے نہیں ہو گا۔" اور مجھے یقین تھا کہ میں پھر جاؤں گا۔ وہاں پاؤں رکھنے کو تو جگد نہ تھی۔ "میں واپس جاؤں گا" حالانکہ کمال جا سکتا تھا۔

"اب ہم خاصی بلندی پر ہیں۔" "تمام کے لیے میں تائب تھا" مذہرات تھی "تم نیچے نہیں جا سکتے۔ آئیں ایم سوری یہ میرا قصور ہے۔ وہ کپا راست اس کی نسبت بت بہتر تھا۔"

میں نے کافی عرصہ کے بعد نیچے دیکھنے کی کوشش کی اور وہ تھیک کہتا تھا، نیچے اتنا ناممکن تھا۔ برساتی نالے کی اس خلک ترجمی اور نیچے گمراہیوں میں گم ہوتی گزرگاہ کو میں نے مجھے میور کیا ہے وہ میں نہیں جانتا۔ یہ اندر ہرے میں ایک چھلاگ تھی۔ میں کچھ دری ایک محل حالت میں شاید ہوا میں سے گزرتا ہوا دوسری جانب تھا۔ اور میرا سانس بے روپ تھا۔ یہاں نیزی میڈو کی نسبت بلندی بھی زیادہ تھی بلکہ ہم اپنے سفر کے بلند ترین مقام پر بکھنے پڑتے تھے۔ تقریباً پارہ ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پر۔ اور کوشش کر رہے تھے کہ آہستہ آہستہ نیچے آئیں۔ لڑکتے ہوئے نہ آئیں۔ ایک اور مشکل یہ تھی کہ آرام کرنے کے لئے یا سانس درست کرنے کے لئے کوئی جگد نہ تھی۔ ڈھلوان اتنی تھی کہ آپ پہاڑ پر منہ رکھ کر ہاتھ پھیلا کر تھوڑی دری اس حالت میں اگر رہ سکتے تھے تو بس یہی آرام تھا۔ اور میں اس حالت میں پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ تب وہندہ منہ تاریک ہو گئی اور پھر بوندا باندی شروع ہوئی۔ اور تھوڑی دزی بھی میں یہ بوندیوں کی خلک اختیار کر سکیں۔ سردوی کی شدت میں یکدم اضافہ ہو گیا اور میں کاپنے لگا۔

"یہاں سے نکلا چاہئے مست آئر۔" مشائل نے آواز دی اور وہ ذرا آگے تھی "اگر شام ہو گئی تو ہم تجھے ہو جائیں گے۔"

میں پھر چلنے لگا۔ لیکن اب ذرا بہتر طریقے سے کیونکہ اب میں نے اپنی چھڑی پیچک دی تھی اور ہاتھوں کا پورا استعمال کر رہا تھا اور اکثر خطرے میں گمرے جانور کی طرح اپنے چاروں ہاتھ پاؤں پر چلنے لگتا۔ اسی حالت میں میں نے ایک اور نالہ عبور کیا۔

دور کچھ بڑی چنانیں نظر آ رہی تھیں اور ہمارا خیال تھا کہ ان کے دوسری

جانب بیال کیپ ہو گا لیکن ابھی یہ چنانیں بہت دور تھیں۔

پہاڑ جیسے ہمیں صرف اپنے آپ پر سے گرانے کے لئے اور سیدھا ہو گیا اور ہم تقریباً اس سے پٹ پٹ کر چلنے لگے۔ نیچے رائے کوٹ گلیشیر تھا لیکن یہاں سے نظر نہیں آتا تھا البتہ جتنے پھر لڑکتے ان کی گونج ہاتا تی کہ وہ بہت نیچے گئے ہیں اور بہت گمرے گئے ہیں۔

تب میرے سامنے ایک اور خلک گزر گاہ تھی۔ سامنے تو نہیں تھی بلکہ نظروں کے سامنے ترجمی ہو کر نیچے گر رہی تھی۔ تمام دوسری جانب نیچے چکا تھا۔

"یہ ذرا خطرناک ہے لیکن مشکل نہیں" وہ کہ رہا تھا۔ اور ٹالہ پاری ہلکی برف پاری میں بدل رہی تھی اور یہ برف میرے بدن پر گرتی تھی اور اسے نہ بہت کرتی تھی۔

یہ خلک گزر گاہ زیادہ سے زیادہ چھ سات فٹ پوزیشن تھی لیکن اتنی سیٹ تھی کہ اسے پار کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا پل در کار تھا۔ اس کے درمیان میں تمام کے بوٹوں کے نشان تھے۔ "تم جلدی سے ان پر قدم رکھ کے آ جاؤ۔ اتنی جلدی کہ تم گرت سکو۔" اور مجھے اپنی سوت کا یقین ہے ایسے اس لئے جب ہر سو دھند کی تاریکی پھیل رہی تھی اور ہلکی برف پاری ہو رہی تھی اور نیچے رائے کوٹ گلیشیر ہمیں باتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں کبھی بھی اس پل صراط کو عبور نہیں کر سکتا۔

"— تمام میں دوسری طرف نہیں آ سکوں گا۔" میں جانتا ہوں۔

تمام کا بڑھا ہوا ہاتھ نیچے ہو گیا۔ وہ مجھے سارا بھی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ فاصلہ زیادہ تھا۔ میرا بدن سردوی کی شدت سے کانپتا چلا جا رہا تھا۔ "میں یہاں بیٹھتا ہوں تم کہیں سے مدد لے کر آؤ" میں ڈھلوان کے ساتھ نیک لگا کہ اس طرح بیٹھا کر ہر لمحے آگے کو جھلکا جائے تھا۔

تمام بہت دری سک چپ رہا۔ اس دوران مشائل جو من میں نہ جانے اسے کیا کہتی رہی۔ میری پکلوں پر برف کے گالے گر کر پانی ہو رہے تھے اور یہ سردوپالی میرے چہرے پر سے نیچے اتر کر گون کے اندر چلتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مدد کسی سے نہیں آ سکتی۔ نزدیک ترین جگہ بیال کیپ تھی جہاں ہم صرف دوچواہوں سے ملے تھے اور وہ بھی شاید اب تک نیزی میڈو لوٹ گئے ہوں گے اور نیزی میڈو اتنے فاصلے پر تھا کہ وہاں پہنچ کر اگر واپس آیا جاتا تو رات ہو جاتی۔ بلکہ خاصی رات ہو جاتی۔ اور کھلی فھاریں برف پاری میں ناگاپرہت کے دامن میں رات

ہو گیا کہ انہیں کیا محسوس ہوا ہو گا..... میں لٹک رہا تھا اور میری ناک کے میں سانسے کوئی تیز مک والا پودا تھا اور وہ میری ناک کو چھوٹا آگے بیچھے ہوتا تھا اور اس کی مک اب بھی مجھے یاد ہے۔ اس وقت وہ آخری مک تھی..... اور میں کتنی دیر تھامس کا ہاتھ پکڑ لکھا تھا یا اس میں کتنی ہمت تھی کہ وہ ایک شخص کو صرف ایک ہاتھ سے یوں پکڑے رکھے۔ وہ کچھ کہ رہا تھا..... اور مسلسل کہہ رہا تھا..... اور چونکہ وہ انگریزی میں کہہ رہا تھا اس لئے میرا ذہن اسے فوراً نہیں سمجھ رہا تھا اور مجھے یہ سمجھنے میں خاصی دیر گئی کہ وہ کہہ رہا ہے "گریب..... گریب ودیور یفت پیٹھ اینڈ گک ودیور رائٹ لیگ"

یہی بات اگر وہ بخالی میں کہہ رہا ہو تو اسک "کھما ہاتھ اور بھی لٹ" تو میں بغیر سمجھے اسے سمجھ جاتا اور میرے ریفلکسن فوراً کام کرنے لگتے۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اپنے بائیں ہاتھ سے ہرشے کو پکڑنا شروع کر دیا۔ گھاس، سکریزے، منی کوئی بھی شے اور دوسریں ناٹک سے پہاڑی کو گک کرنا شروع کر دیا..... ہاتھ میں کچھ نہ آیا۔ پاؤں کے تیچے بوٹ مارنے کی وجہ سے تھوڑی سے جگہ بی بی اور میں نے فوراً کہا "مجھے سمجھ لو۔۔۔" جہاں میں نے پاؤں رکھنے کو جگہ بیانی تھی وہ جگہ چند سینٹ کے لئے رہی اور پھر دسے گئی لیکن اتنی دیر میں تھامس مجھے اپر سمجھ چکا تھا اور میں پہاڑی پر تیز مک کے پودوں کے اوپر اونٹھا پڑا تھا اور مجھ سر براف سفید ہو رہی تھی..... میرا منہ کھلا تھا اور ہونٹ مٹی پر تھے..... اور میرا بدن گزر جانے والے لمحے کے خوف سے اب کانپ رہا تھا..... میرا سارا بدن سرد ہو رہا تھا لیکن قیض کی جیب کے اندر ایک چھوٹی سی جگہ تھی جہاں سے گری پھیلتی تھی..... جیب میں ہٹنے کے اندر میرے پیچوں کی ایک تصویر تھی..... اور اس تصویر کو نکال کر دیکھنے کی اب مجھے ضرورت نہ تھی وہ میرے سانسے تھی۔ ان کا ایک ایک نقش میرے سانسے تھا اور میرے سر پر، بالوں پر جو براف گرتی تھی اور پھلتی تھی اور اس کا سرد پانی میرے چہرے پر راستے ہاتا تھا، اس سرد پانی میں چند گرم بونمیں بھی شامل ہوتی تھیں کہ میں ان سے دوبارہ ملوں گھک..... میں واپس آؤں گا۔

"ہم آرام نہیں کر سکتے۔۔۔ آجا۔۔۔" تھامس نے پھر ہاتھ آگے کر دیا۔ اس کے بعد وہ اور ننک نالے آئے جو خلنکی میں کم نہ تھے لیکن میں اب کچھ نذر اور کچھ لاپروا سا ہو چکا تھا..... اب میں ناٹک پرست کے ہاتھ آئے والا نہیں..... کئی بار تھامس نے مجھے احتیاط سے چلنے کی تلقین کی.....

گزرتی نہیں بندہ گزر جاتا ہے..... میں اٹھ کرزا ہوا "میں کوشش کرتا ہوں ۔۔۔"

"وہ مبارے۔۔۔" تھامس چیخا۔ "بس جہاں میرے بونوں کے نشان ہیں دیاں بھتی سے قدم جما کر آ جاؤ، مشکل نہیں ہے۔" میں احتیاط سے آگے بڑھا۔۔۔ تھامس نے اپنا بازو پھیلا رکھا تھا اور اس کی بھتی کھلی تھی..... میری کوشش یہ تھی کہ خلنک حصہ عبور کرنے سے پیشتر تھامس کا ہاتھ پکڑ لوں۔۔۔ میں حکسٹا ہوا آگے ہوا یعنی دیکھے بغیر اور بلا خر تھامس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔۔۔ "مجھے مضبوطی سے پکڑنا۔۔۔"

"تم فکر نہ کرو۔۔۔"

ای یہ میں نے قدم آگے بڑھا۔۔۔ تھامس کے بونوں کے نشان پر رکھا اور دوسرا قدم اٹھانے سے پیشتر کچھ ہوا۔۔۔ یہی ہوا کہ میرے قدموں کے تھے سے زمین کل گئی اور سکریزے اور پتھر شور چاٹتے تیچے گراہی میں جا رہے تھے اور میں ۔۔۔ رائے کوٹ گیکیشیر کے اوپر کہیں لٹک رہا تھا۔

"ہاتھ مت چھوڑنا۔۔۔" تھامس میرے اوپر کہیں تھا اور کہہ رہا تھا..... جب میں گرا ہوں تو میری کالائی میں اتنی شدت سے درو ہوا کہ میں نے تھامس کا ہاتھ ترقیا چھوڑ دیا تھا۔

"کیا تم نے مجھے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے؟" یہ فقرہ میں نے ایک خلامی کیا تھا۔ میرا دل خالی ہو چکا تھا۔۔۔ مجھے اب تھوڑی دیر میں رائے کوٹ گیکیشیر پر گرنا تھا۔۔۔ کتنی دور نکل گرنا تھا یہ میں نہیں جانتا تھا اور میں صرف لٹک رہا تھا۔۔۔ تھامس کا دلیاں ہاتھ میرے دائیں ہاتھ میں تھا اور میں اپنے بائیں ہاتھ اور دوسرے پاؤں کو ہر جانب سچھ رہا تھا اور چلا رہا تھا..... تھامس کچھ کہہ رہا تھا لیکن پہ نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ اور عجیب بات ہے کہ اس حالت میں جب میرے اور موت کے درمیان شاید کچھ سیکنڈ کا فاصلہ تھا۔۔۔ وہ فاصلہ جو مجھے یعنی گرتے ہوئے گلائی میں زیادہ نہ سوں نہیں تھا۔۔۔ شاید یعنی موت انسان کو الٹیمان بھی دیتی ہے۔۔۔ میں ایک ایسی ٹھیکی کی طرح تھا جو کسی سکالی سکرپر کی کھنکی کو پکڑے ایک ہاتھ سے نکل رہا ہے اور تباہ اس لئے میں نے اوپر دیکھا اور وہاں ناٹک پرست تھی یا دلوں اور دندن میں۔۔۔ گلر ماڈنشن۔۔۔ مار ڈالنے والی چوٹی۔۔۔ قاتل پہاڑ۔۔۔ اور میں اس کی ایک کھالی کے اوپر نکل رہا تھا۔۔۔

اور میں ان تمام کوہ پیاؤں کا آخری لمحوں کا حصہ دار ہیں گیا جن کو اس نے ہلاک کر دیا تھا۔۔۔ انہوں نے بھی براف کے طوقانوں میں دبئے یا کسی ایسی ہی کھالی میں گرتے اسی طرح آخری پار ناٹک پرست کو اوپر دیکھا ہوا گا، سیاہ اور دہشت ناک۔۔۔ مجھے معلوم

پھر وہ بڑے پتھر آگئے اور ہم ان پر چلنے لگئے..... ان کے پار دوسری جانب نیچے کسی بیال یکپ قھا..... لیکن ہم ان جانے میں بہق کے سفید درجنوں کے ایک چھوٹے سے ذخیرے میں آنکھ تھے..... بہق صرف اسی بلندی پر ہوتا ہے نیچے فیزی میڈو بھی اس کے لئے بہت گرم ہے۔ یہ ایک ڈھلوان تھی۔ سربرز صرف دہان جماں وہ الپائن چھولوں کے ڈھیروں اور جونپر کے خوبصورت پودوں سے ڈھکی ہوئی تھیں تھی۔ کہیں کہیں سفید پتھر تھے جیسے سجا کر رکھے گئے ہیں۔ سفید بہق۔۔۔ الپائن چھولوں کے درجنوں رنگ اور جانے کیے کہیں کہیں پودے اور رنگین پتوں والی جھاڑیاں۔۔۔ یہاں بھی نانگا پرست عین اور تھی لیکن ہم اس کی بر باری اور دھند کی زد سے باہر آ چکے تھے۔۔۔ یہاں ڈھلتی دھوپ تھی اور دامیں جانب رائے کوٹ گلیشیر تھا۔ سامنے برزل پاس تھا اور ان سے پرے فیزی میڈو۔۔۔ فتوری اور تاؤ سے پرے ملک دریائے مندہ سے پرے اتنے طویل فاصلے کے باوجود یہاں سے راکاپٹی صاف نظر آ رہی تھی۔۔۔ ہم سینکلنوں کلوبیز پہلے ہوئے اس عظیم مغرب کے گواہ تھے۔۔۔

ہم یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔۔۔ اور ہم مختلف پتھروں پر ہیٹھے گئے۔۔۔ الگ۔۔۔ جزیروں کی طرح۔۔۔ نانگا پرست سے منہ موڑ کسے سامنے سینکلنوں کلوبیز تک پہلے ہوئے اس عظیم مغرب کو دیکھتے رہے۔۔۔ اور نامعلوم جھاڑیوں کی جنگ تیز ہوئی۔۔۔ اور ہم یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ اور ہم بھول چکے تھے کہ تھوڑی دیر پسلے ہم گھر سے نکل کر جنگل میں کھو جانے والے بچوں کی طرح بے آسرا اور بے بس بجھتے تھے اور نانگا پرست ہمیں ابدي آرام دینے کے لئے دھند میں نیچی تھی اور برف ہمارے جسموں پر سقید ہوتی تھی۔۔۔ میں ڈر سے خال تھا اور میرا بدن پر سکون تھا۔۔۔ میرا خوف ان چھولوں کے اندر رہ گیا تھا جو گلیشیر پر لکھتے ہوئے میری ناگ کے آگے آتے تھے اور اپنی جنگلی مرک چھوڑتے تھے۔

”فیزی میڈو کا جنگل“، مار خور اور برفانی انسان اور آخری آلاو“

ہم وہاں بیٹھے رہے اور تب میں نے تماس سے کہا ”۔۔۔ جان بچانے کا شکریہ“

”نہیں نہیں تم خلرے میں نہیں تھے۔۔۔“ وہ میری طرف نہیں دیکھتا تھا اور اور دیکھتا تھا چدھر سینکلنوں کلوبیز طویل مغرب سامنے تھا اور اس کے آخر میں راکاپٹی اور دوسری بلند چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔۔۔ ”میں نے تمہیں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور میں خود بھی مضبوط تھا۔۔۔ ویسے بھی تم گرتے تو دوس میں میز کے بعد غصہ رجاتے۔۔۔“

”اور شاید نہ غصہ رجاتے۔۔۔“

”شاید۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم مرتے نہیں صرف ہڈیاں نوٹیں۔۔۔“

”اور اگر ایسا ہو جاتا تو تم مجھے انھا کر فیزی میڈو تک لے جاتے۔۔۔“

”ہاں کیوں نہیں۔۔۔ دوست کس لئے ہوتے ہیں۔۔۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔۔۔ اور جو ہوا نہیں اس کا کیا غم۔۔۔“

دھوپ دھم ہو کر قدرے سرد ہونے لگی اور ہم انھوں کھڑے ہوئے۔۔۔

واپسی پر بھی ہم جزیروں کی طرح رہے۔۔۔ الگ الگ۔۔۔ خاموش۔۔۔ اور اپنے آپ میں گم۔۔۔ صرف بیال یکپ کے جاپانی باغ میں ہم زرا قریب رہے مگر گم نہ ہو جائیں کیونکہ یہاں سور پنگھ کے بزر رپنگھ بیٹھے تھے اور کوئی راست نہ تھا اور ہم بھلک سکتے تھے۔۔۔ قدم جنگل میں بھی خلکی بڑھ بھکی تھی اور پانی کے چلنے کی آواز تیز ہو

اے میں نے صد پارہ گولڈ کی پوٹی دکھائی ہے بہت متاثر ہوئی ہے۔۔۔"

مارچانیلی جیجن، سفید بلاڈ اور سرخ زری وائلے دوپٹے میں تھی اور یہ دوپٹے اس نے جانے کمال سے لیا تھا۔ اس کے ساتھی بین بھائی ارسلہ اور روینڈ بورپی کی بجائے بہت زیادہ ایشائی لگتے تھے کیونکہ وہ دونوں بے حد شرمنے شرمانے سے رہتے اور بہت کم بولتے تھے۔

کافی آئی۔۔۔ اور اس میں وہ گرم طاقت تھی جس نے مجھے کسی حد تک بحال کر دیا۔۔۔

"میں کیپ تو ان دونوں چھوٹوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔۔۔ آپ نے وہ بورڈ دکھا جو ہائک پرست کو سر کرنے والے جرمن ہرمن بولٹ کی یاد میں آؤ بران کیا گیا تھا۔۔۔"

"ہم وہاں تک میں بھی بخیں سکتے۔۔۔" مشاکل نے کما کیونکہ میں اور حامس چکے سے کافی پیچے رہے اور مکراتے رہے۔

"کیوں؟۔۔۔"

پسلے کوئی صیس بولا تھا اور اب ہم تینوں بولنے لگے۔۔۔ اور جب ہم بول چکے اور ہم نے اپنی واسستان بیان کر لی تو کیا وہ تجربہ ماضی کا حصہ بن گیا، ہم اس سے فوری طور پر الگ ہو گئے اور اس کی دہشت ہم سے الگ ہو گئی اور وہ احساس کی سطح پر ہماری زندگی کی کتاب پر لکھا گیا اور وہ ورق پلنگا گیا۔۔۔

"آپ کو ہمارے علاقے میں کون سے جگہ سب سے اچھی گئی؟" رحمت نبی نے مجھ سے پوچھا۔۔۔

"ہاں تاؤ سے آتے ہوئے جب چڑھائی ٹھم ہوتی ہے اور خستوری کا علاقہ شروع ہوتا ہے وہاں بائیں ہاتھ پر راست کوٹ کیشیز کے میں اور ایک بلند سطح پر لکڑی کے شہتیروں سے ہاں ہوا ایک چھوٹا سا کیben ہے مجھے اس کے آس پاس کا علاقہ پسند آیا۔۔۔"

"اور اس کیben کے دروازے پر ایک چھوٹا سا تالا لگا ہوا ہے؟"

"ہاں مجھے یاد تو پڑتا ہے۔۔۔"

"وہ کیben میرا ہے۔۔۔ آپ جب چاہیں آئیں اور اس میں جتنے دن چاہیں قیام کریں۔۔۔"

"وہ کیben اب بھی ان بہت ساری چھوٹوں میں سے ایک ہے جو میں نے جمع کر

چکی تھی۔۔۔ خلک درخت ہوا سے بیٹھے تھے اور چہچڑاتے تھے۔۔۔ صرف ایک بار ہم سے دور ایک درخت گرا اور دیہی تک اس کے کڑکڑائے کی آواز آتی رہی۔۔۔ جب فرش پر شرمندی کے پھول دکھائی دیئے تو ہم فیزی میڈو کے قریب ہو چکے تھے اور یہاں فیزی میڈو کے کنارے پر جگل میں منگل تھا۔۔۔ آسٹرین گروپ آپ کا تھا۔۔۔

درجنوں رنگا رنگ خیجے چیز کے تکاور درختوں تھے ایسٹاہدہ تھے۔۔۔ ایک تاتا دو ٹنوں کے درمیان اس طرح باندھی گئی تھا کہ اس کی نیچے ایک سنگ روم بن گیا تھا اور یہاں مختلف لوگ خوش گھوٹوں میں مصروف تھے۔۔۔ ایک عارضی باورپی خانے میں خوراک پک رہی تھی اور اس کی خوشبو ہم تک آ رہی تھی۔۔۔ پہلی نظر میں ہم نے دکھا کہ پیشتر سیاح عمر رسیدہ تھے۔۔۔ انہوں نے نہایت بیش قیمت ٹرینک سوٹ پہنچے ہوئے تھے اور ان کے پوتھ نے اور چکلیے تھے۔۔۔ ایک فوجوں گروہ میں سے جو درختوں کے نیچے بر اجنبان تھا ایک دبلا بھورے بالوں اور آنکھوں والا شخص اٹھا اور ہمیں غور سے دیکھا ہمارے پاس آگی۔۔۔

"تمڑا صاحب ہم بہت فگر مند تھے۔۔۔ میں کیپ کو جانے والے شام سے بہت پسلے واپس آ جاتے ہیں اور آپ نے تو بت دیے کر دی۔۔۔ میرا ہم رحمت نبی ہے اور میں اس آسٹرین گروپ کو لے کر آیا ہوں" ایک سیاحتی ادارے میں ملازم ہوں۔۔۔"

"نگلکت میں اکرام صاحب نے آپ کا ذکر کیا تھا۔۔۔" میں نے رحمت سے ہاتھ ملا کر اس کا تعارف اپنے ساتھیوں سے کروایا۔ "آپ کون سے راتے سے یہاں آئے ہیں؟"

"ہم سرک کی جانب سے تاؤ پہنچے اور بڑی مشکل سے پہنچے۔۔۔" رحمت نبی نے حد چھست اور پھر جلا محس تھا۔۔۔ وہ تمہر تمہر کربات کرتا تھا اور کم بات کرتا تھا" لیکن آئیے ہاں آپ کو گرم گرم کافی پالائی جائے۔۔۔"

گرم گرم کافی۔۔۔ مجھے اپنے کالنوں پر اختیار نہ آیا۔۔۔ اس جگل میں ہائک پرست سے واپسی پر گرم گرم کافی۔۔۔ ہم مکراتے اور سرہلاتے اس کے ساتھ پڑے گئے اور ایک تاتا کے نیچے بیٹھے گئے جہاں چند دو سرے سیاح بھی بر اجنبان تھے۔۔۔ مطیع یہاں ہم سے پسلے موجود تھا اور ایک آسٹرین لڑکی کا ہاتھ تھاے بیٹھا تھا۔۔۔

"یہ جاتاب مارتا ہے۔۔۔" اس نے فوراً تعارف کروایا۔ "کمی ہے آسٹریا۔۔۔"

نہ چاہتا ہوں۔ میں جیس ہتانا چاہتا ہوں کہ یہ پینٹنگ نہیں ہے۔ ایک صورت ہے اور۔۔۔ ایک جگہ ہے۔ اس دنیا میں ہے۔۔۔ پاکستان میں ہے۔۔۔ اور اس کا نام فیزی میڈو ہے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں یہاں آؤں گی۔۔۔ اور اب میں یہاں ہوں اس پینٹنگ میں۔۔۔

اس دران ایک مرجب پھر ہر من بوال کے پارے میں لٹکو شروع ہو گئی۔۔۔ ایک نہیں اور خوبصورت بوڑھا ہو ایک پرانے کوٹ میں ملبوس تھا بست دیر سے رہی بنتے میں مصروف تھا۔۔۔ وہ ذرا قریب آگیا۔۔۔ رحمت نبی نے ہتایا کہ یہ میرے چاہا ہیں۔۔۔ چاہا کرنے لگے "مجھے یاد ہے جب جو منوں نے ناگا پریت کو فتح کیا تھا۔۔۔ ہر من بوال نے یہاں فیزی میڈو میں چونی پر چھٹے کی خوشی میں بست بڑا دعوت کیا تھا۔۔۔ گائے بدل کو بھی کھانا ملا تھا۔۔۔ پھر دو سال پہلے اس کی یہوی اوہر آئی تھی۔۔۔ میں کپ میں جا کر اس کی یاد میں جو بورڈ ہے اسے دیکھ کر بست روئی۔۔۔ اور وہ بست اونچا اونچا روئی ناگا پریت کے پاس۔۔۔ وہ ان ساری جگنوں پر گئی جہاں اس کا خاوند گیا تھا۔۔۔

"بیانی۔۔۔ وہ جو ہے میسز وہ بھی تو اور ہر آیا تھا۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ بھی آیا تھا۔۔۔ میسز کا بھائی بھی کوہ پیا تھا اور وہ ناگا پریت پر مرا تھا۔۔۔ اور جب میسز اکیلا چونی پر پہنچا تو وہاں سے گرا۔۔۔ تیز ہوا کی وجہ سے۔۔۔ اور اور بوڑ کی طرف گرا۔۔۔ نیچے جک گرتا گیا۔۔۔ پھر ایک چروہے نے اسے گرا جتے ہوئے دیکھا اور اسے اخخار کر نیچے گاؤں بوڑ فارم میں لے گیا اور علاج کیا۔۔۔"

"تمارے ساتھ ڈاکٹر فرز غارنی بھی ہے۔۔۔" رحمت نبی کہنے لگا "فیزی میڈو کے بارے میں کتاب لکھ رہا ہے۔۔۔ خاص طور پر یہاں کے پھولوں اور پودوں کے پارے میں۔۔۔ اس وقت پریوں کے ساتھ ہے ورنہ ملاقات کرواتے۔۔۔"

"پریوں کے ساتھ؟"

"ہاں۔۔۔" رحمت نبی مکراتے لگا "وہ اپنے خیمے میں ہے پریوں کے ساتھ۔۔۔"

رحمت نبی کے گروپ کے چند لوگ شام کے کھانے کے لئے کسی سوپ کی خواہش لے کر آئے اور وہ ان سے باشیں کرنے لگا۔۔۔ ہم نے اس کی کافی کاشکریہ ادا کیا اور جنگل سے نکل کر اپنی پہاڑی پر چھٹے لگے۔۔۔ یہاں مجھے غافتہ میں محسوس ہوئی اور مجھے متعدد بار رک کر سانس درست کرنا پڑا۔۔۔ اور خیمے کے باہر گاؤں فرے ایک مطمئن انسان کی طرح بیٹھا مسکرا رہا تھا۔۔۔ میں تم لوگوں کے لئے کافی بیٹا کر لاتا

رکھی ہیں کہ ایک دن وہاں جاؤں گا اور زندگی کے چند دن گزاروں کا اور ظاہر ہے کہ میں جا نہیں سکوں گا لیکن ایسی جگنوں کو جمع کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔۔۔ اس ہوا، رائے کوٹ گلیشیر میں بنتے والے پوشیدہ دریا کے سور، خستوی کے بزرے اور رنگ اور ناٹا پریت کی چوٹی سے مدھم گزگڑا اہٹ کے ساتھ اترتے بر قابل طوفانوں کی سفید دھول کو جمع کر لینے میں کیا حرج ہے۔۔۔

رحمت نبی کے گروپ کا بھی باور پیچی جیسیں بار بار مجھ سے رات کے کھانے کے بارے میں پوچھتا کہ صاحب کیا کھانا گے اور میں ذرا شرمende سامنے کرنا کہ میں کس طرح ان پر بوجھ بخوں۔۔۔ ہمارے پاس بہت خوارک ہے۔۔۔ میں بار بار کہتا اور ہمارے پاس واپسی بہت خوارک تھی۔۔۔ لیکن رحمت نبی کہتا "میں تاؤ کا رینے والا ہوں۔۔۔ آپ میرے مہمان ہیں۔۔۔ آپ جتنے روز بھی فیزی میڈو میں غھریں گے میرے مہمان ہوں گے۔۔۔ آپ جس کھانے کی خواہش کریں گے، جیسیں آپ کو بنا دے گا۔۔۔"

رحمت نبی کے گروپ کے بوڑھے سیاح سب کے سب اپنے آپ میں گن تھے۔۔۔ وہ بست زیادہ حرکت نہیں کرتے تھے۔۔۔ وہ مجھے بست تھا اور اوس اور بغیر خواہش کے لگے۔۔۔ خلاء میں گھورتے ہوئے اور اپر دیکھتے ہوئے۔۔۔ کسی پتھر بیٹھے ہوئے، کافی پیچے ہوئے، میں نے ان کو مکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔۔۔

"آپ نے کیسے جانا کہ وہاں ملک پاکستان کے شمال میں شاہراہ ریشم ہے اور اس پر ایک پل رائے کوٹ نام کا ہے۔۔۔ آپ سب رنگوٹ کئے ہیں اور اس پل سے دو دن کی سخت مسافت کے بعد فیزی میڈو آتا ہے۔۔۔ آپ نے کیسے جانا؟" میں نے مارتا سے دریافت کیا۔

"میں آسٹرا میں ایک پرائیوریت فرم میں کام کرتی ہوں۔۔۔ میں جب بھی اپنے بس کے کمرے جاتی، وہاں اس کی کری کے پیچے ایک بست بڑی پینٹنگ کو دیکھتی۔۔۔ اس پینٹنگ میں ایک وسیع بزرہ زار ہے، جنگل ہے اور ایک خوبصورت سفید پہاڑ ہے۔۔۔ میں اپنے بس سے کھتی کر کیا یہ ملکن ہے کہ کہیں دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہو اور وہ کہتا "میں مارتا یہ تو ایک خوبصورت تخلی ہے، ایک پینٹنگ ہے۔۔۔" اور میں اسے دیکھتی رہتی۔۔۔ پھر ایک روز میری ساکنہ تھی اور میں ظاہر ہے دفتر سے جسمی تو کر نہیں سکتی تھی اس لئے ذرا بن سنور کے چلی گئی۔۔۔ میرے بس کو معلوم تھا کہ اس روز میری ساکنہ ہے اور وہ کہنے لگا۔۔۔ "مارتا میں جیس ایک عجیب و غریب تھا

بندوق تھی..... میں اپنی بیٹری سے اٹھا اور ان کے قریب جا بیٹھا۔۔۔ وہ حسب توقع لاطلن پیشے رہے اور میں نے سرد مری کی برف توڑنے کے لئے ایک مرتبہ پھر دوربین مانگی۔۔۔ اس بار نسلی آنکھوں نے دوربین میری طرف پیچکی نہیں بلکہ ہاتھ پر بڑھا کر آگے کر دی۔۔۔ لیکن اس پار بھی اس نے میری طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا بلکہ بیٹا ہر بے دل سے دوسری جانب رکھتا رہا۔۔۔ میں نے دوربین کو آنکھوں سے لٹا کر رائے کوٹ گلیشیز کو دیکھا جس کے اوہر کچا راستہ تھا۔۔۔ وہ ایک اور دنیا تھی۔۔۔ نوکیلے اہراموں کی سرد اور سماں سے بے آواز دنیا، اور اس کے اوپر نالہ پرست تقریباً سائے میں جا پہنچی تھی۔۔۔ دوربین واپس کر کے میں نے میں یکپ کے سفر کی واسitan شروع کر دی، میں اپنے آپ سے چیزے جاطلب تھا۔۔۔ وہ سنتے تھے لیکن اپنی دلپتی ظاہر نہیں کرتے تھے۔۔۔ جب میں نے اپنے بخار اور زکام کا پتایا اور وہ اس کی علامات میرے چہرے اور آنکھوں میں دیکھ بھی سکتے تھے تو انہوں نے پسلی بار مجھ پر نگاہ کی۔۔۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے نیلی آنکھوں والے سے پوچھا اور وہ ایک نمائت دلکش نین نیشن والا نوجوان تھا۔

"تیمور خان....." اس نے غصے سے کہا۔

"اور تھا را؟" میں نے دوسرے کو سٹالن سے درستافت کیا۔

"یہ میرا بھائی ہے....." تیمور خان ایسے بولا ہیسے کہ رہا ہو کہ نظر میں آ رہا یہ
میرا بھائی ہے.....
گاؤں فرے نیچے سے پانی لے آیا اور چائے کے لئے کستلی آگ پر رکھ دی میں
نے اسے اشارہ کیا اور وہ سمجھ گیا جب چائے آئی تو تمنی کرتے "یہ تمہارے
لئے ہے تیمور اور تمہارے ساتھی کے لئے"

”تم ہمارے خیے کے پاہر آ کر بیٹھے ہو، ہمارے مہمان ہو۔ جائے ہے۔ ترہ
وہ گھبرا گیا ”نہیں نہیں.....“

ہوں".....
 "تینک یہ گذفرے....." مشاکلہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہم
 کافی پی کر آتے ہیں....."
 جب اسے ہماری مم جوئی کے بارے میں علم ہوا تو اس کی مکراہٹ سمت گئی
 "مشائیر میں پہاڑوں کو جانتا ہوں..... ان کے یہ بظاہر آسان راستے موت کے پہنچے
 ہوتے ہیں۔ میں کبھی رُسک نہیں لیتا..... میں نے وہ راستہ دیکھا تو جان لیا کہ اس میں
 خطرہ ہے..... تمیس پتہ ہے کہ جو لوگ بھی پہاڑوں پر چلتے ہیں وہ اسی طرح مرتے
 ہیں..... ایک جھونپی ادا کی تسلی کے لئے، لوگ اپنیں ڈرپوک نہ کہیں اور وہ دل کی
 آواز پر کان نہیں دھرتے اور کسی موت کے پہنچے والے راستے پر قدم رکھ دیتے
 "اگر....."

یہ بھے ایک بے چینی کا احساس ہو رہا تھا..... یہ زکام اور بخار کی آمد تھی۔ تاک میں چالیا ہت اور ایک پر لطف احساس والی حدست۔ میرا ما تھا بے حد گرم تھا اور آنکھیں جلتی تھیں..... یہ اس سرد موسم کا شاشخانہ تھا جو نانگا پرپت کے دامن میں تھا اور اس برف باری کا نتیجہ تھا جس میں تیز مک کی جڑی بوئیوں پر اونڈھا پڑا تھا اور مجھ پر برف کے گالے گرتے تھے..... میں نے اپنی میڈیکل کٹ نکالی جو ڈاکٹر محمد رمضان کے مشورے سے تیار کی گئی تھی..... وہاں ایک کافنڈ پر زکام اور بخار کے آگے جن دواں ہوں کا تذکر تھا وہ میں نے فوری طور پر لگھیں اور خیسے میں سے ربوہ میڈیکل کر اس میں ہوا بھر کر دوہیں سکھلی فضا میں لیٹ گیا۔ مشائلہ اور تھامس اپنے خیسے میں جا چکے تھے..... گاؤفرے پانی پانے کے لئے بیچے فیری میڈو چلا گیا.....

میں کچھ دیر اونچتی رہا..... اور ہر شام از پھلی تھی لیکن نالا کا پریت حسب معمول ابھی دھوپ میں تھی..... میری آنکھیں بند تھیں اور میں دراصل اپنے اس ہلکے بخار اور زکام سے لخت انداز ہو رہا تھا..... کسی کے کھانے کی آواز پر میں نے آنکھیں کھول دیں.... نیلی آنکھوں والا کوہستائی اور اس کا ایک ساتھی بظاہر مجھ سے بے پرواہ برزل پاس کوٹکے جا رہے تھے.... اُنہیں دیکھ کر میں اپنی سکراہٹ قابو میں نہ رکھ سکا..... وہ جانا چاہتے تھے باہر کی دنیا کے بارے میں 'ہمارے بارے میں' لیکن ان کی انا بست اونچی تھی، نالا کا پریت سے بھی اونچی، اور وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور اپنے بھوپلن کی وجہ سے ظاہر کر دیتے تھے..... نیلی آنکھوں والے کے کبل کے نیچے ایک

ٹھال کر روشن کی اور اپنے پاس رکھ لی۔ نیچے سے کوئی اوہر آیا اور وہ لاٹھیں کی روشنی سے پرے تھا تو ہم پہنچاتے رہے اور جب اس کی زد میں آیا تو یہ بھی گکھیں تھیں، وہ ایک لفڑ کی سرخ اٹھائے ہوئے تھا۔ رحمت نبی نے آپ کے لئے شام کا کھانا بھیجا ہے۔ اس نے کہیں میرے آگے رکھا اور سلام کر کے پھر نیچے اترے گکھا۔

"آؤ تھور کھانا کھاؤ۔"

اور یہ تھور کی برداشت سے باہر تھا کہ میں اسے کھانا بھی پیش کروں چنانچہ وہ سر بلاتا اٹھ کر رہا ہوا۔

"تم کیا کرتے ہو تھور؟"

وہ چار پانچ قدم نیچے جا چکا تھا جب میں نے یہ سوال کیا اور وہ اوہر اندر میرے میں سے بولا "ہم شکاری ہیں"

"یار کیا شکاری ہے کہ صہان کو شکار نہیں کھلاتا۔"
"کیا کھائے گا؟"

"مار خو۔"

"چھل۔" اس کی تیز آواز آئی اور وہ اپنے ساتھی سیت تاریکی میں اتر گیا۔

رات کے کھانے میں گرم سوپ، آکو قیسہ اور چاول تھے۔ مجھے اگر چہ بخار تھا زکام میں کوہ پیاوس والی ایک گرم ترین جیکٹ میں تھا اور بالکل محفوظ تھا۔ صرف میرے چہرے پر سرد ہوا تھی اور مجھے وہ بھلی لگتی تھی۔

لاٹھیں کی روشنی کا گمرا جب منظر ہونے لگا تو میں نے اس کی لو اونچی نیس کی اس کا شیشہ اور کر کے بجھا دیا۔

"شکریہ۔" گڈ فرے کی آواز آئی جو اپنے سیدبگ بیک میں لیٹ چکا تھا۔ میں تھاری لاٹھیں کی روشنی کی وجہ سے ستارے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب دیکھ سکا ہوں۔"

نیچے جگل میں جماں رحمت نبی کا گرپ خیس زن تھا دبای چڑ کے درختوں کی تاریکی ہو لے ہو لے دیکھنے لگی لو دینے لگی، روشن ہونے لگی۔ نیچے جگل میں انہوں

کرتے ہو؟ گیوں آئے ہو؟"

جب وہ سی زرا محکم ہو گئی تو وہ زرا آزاد ہو گیا۔ یہ جو انگریز مدد اور عورت ہیں۔ اس نے قہاس کے خیے کی طرف دیکھا۔ یہ۔۔۔ اور ایک ٹھش اشارہ کیا۔ نہیں نہیں۔۔۔ میں نے گمرا کر کہا "میاں بیوی ہیں۔"

لیکن تھور بیوی مددوں اور عورتوں کے اخلاق کے بارے میں مخصوص نظریات پر شدت سے قائم تھا۔ یہ سب اوہر عیاشی کرنے آتا ہے۔ اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بھی عیاشی چھکتی تھی۔ میں نے اسے گھانے کی کوشش کی کہ اس حتم کی حرکتیں یہ لوگ۔ اپنے گمروں میں گمروں بازاروں اور میزوں کر سیوں پر بھی کر سکتے ہیں اسیں صرف اس کام کی غرض سے یورپ پجوڑ کر گلگت اور پھر دو دن پہاڑوں میں مشقت کر کے فیزی میڈو ہنچنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن۔۔۔ تھور بار بار اسی اشارے کی گردان کر رہا تھا۔ نہیں کیسے پڑھے کہ یہ میاں بیوی ہے۔۔۔ تم نے نکاح نامہ دیکھا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے بیزار ہیں کہ میاں بیوی یہ ہو سکتے ہیں۔۔۔"

اوہر نیچے جو گورا اور گوری تھا فرانس سے آیا تھا۔۔۔ سارا دن خیے سے باہر نہیں آتا تھا۔۔۔ کیا کرتا تھا خیے میں؟"

"پڑھنے یار۔۔۔" میں نے ٹھک آکر کہا۔۔۔ اور پھر موضوع بدلتے کی خاطر اس کے ساتھی کی بندوق کے بارے میں گھنگو شروع کر دی۔ "اس بندوق سے کیا کرتا ہے؟"

"قاز کرتا ہے۔۔۔ آپ قاز کرے گا" اس نے بندوق میری طرف بڑھائی۔

"نہیں۔۔۔ کس پر کرے گا؟"

"اوہر۔۔۔" اس نے پھر خیے کی طرف اشارہ کیا "اس پر کو۔۔۔ کافر لوگ ہے۔

عیاشی کرتا ہے"

شام ہو چکی تھی۔۔۔ نیچے فیزی میڈو میں آج خوب رونق تھی۔۔۔ دس بارہ بچے فٹ بال کھیل رہے تھے اور ان کی چینوں اور شور کی آواز بھی بھی اوپر ہم تک بھی آ جاتی تھی۔۔۔ کچھ آشڑن بوڑھے بھی اوہر اور ہر مثل رہے تھے لیکن الگ الگ۔۔۔ یہ سب کچھ تھوڑی تھی دیر میں تاریکی کی نذر ہو گیا۔۔۔ میں نے رحنی کی لاٹھیں خیے سے

وقت زیادہ نہیاں تھی۔ ہم نے اس کی پھوٹی سی ندی پر جگ کر منہ ہاتھ دھویا اور پانی کی بخششگی نے ہمارے چہروں کو چوکنا کر دیا۔ پھر ہم اسی ندی کو پھلا گئ کراس مقام تک گئے جہاں سے جگل، نالگا پرست اور فیزی میڈو کا پورا میدان نظر آتا ہے۔ ہم تصویریں اتارتے رہے اور بے مقصد اور ہادر گھوستے رہے۔ مجھ کی خلکی میں فیزی میڈو کی تحملی نے میری ہماری کو افتخاریاً ذائل کر دیا۔ یہاں سے ہمارا یلا خیر ہاتھ پرست کی سفیدی کے سامنے ایک رہبے کی صورت نظر آ رہا تھا۔ فیزی میڈو میں گھٹ کرنے کے بعد ہم جگل میں ٹپے گئے اور وہاں ناشتے کے لئے برتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دھوان انہوں رہا تھا۔

”میں آپ کا ناشت پہاڑی پر بیٹھنے والا تھا۔ اچھا ہوا آپ آگئے ہیں۔“
کارن فلیکس لاڈ مہماںوں کے لئے۔ ”رحمت نبی ہمیں دیکھ کر انھوں کوڑا ہوا۔“
ہم اس کے ساتھ قاتاں کے نیچے بینہ گھٹے۔ چند پورے رُنگ جلانے پیشے تھے۔
اس کی گرفتاری بھی آتی تھی۔
”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ نمیک ہے؟ دیلے ہمارے ساتھ ایک ڈاکڑ بھی ہے۔“

آسٹرلن سیاح اپنے خیوں سے لکل کر ناشتے کے لئے آئے گئے۔ ان میں مارچا اور رویلینڈ بھی تھے۔ مارچا ایک بنت دوست اور مختار قسم کی لوکی تھی۔ اس کے سیاسی خیالات بے حد ترقی پسندان تھے اور وہ ہر وقت اپنے گروپ کے پورے گوں سے الجھتی رہتی تھی۔ اس کے آتے ہی آسٹرلن صدر کرت واللہ ہائیم پر عائد کردہ الزام پر بحث شروع ہو گئی کہ کیا دوسرا جگ غلطیم میں وہ واقعی نازیوں کا آکر کار تھا اور یہودیوں کے قتل عام میں شریک تھا۔ مارچا کا خیال تھا کہ ایسا تھا اور بزرگوں کا خیال تھا کہ اگر ایسا تھا تو پھر کیا ہوا۔۔۔ ارسلا اور رویلینڈ صرف مکراتے تھے۔ اس دوران ایک شخص ناشتے کے لئے آیا جو آسٹرلن کسانوں کے مخصوص لباس میں تھا۔ پاپ کے کش لگاتا ہوا وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔
”یہ ڈاکڑ فرنز کارنر ہیں۔ جو فیزی میڈو پر کتاب لکھ رہے ہیں۔۔۔“ مارچا نے تعارف کرایا۔

”جن سے کل مطاقت اس لئے نہ ہو سکی کہ یہ اپنے نیچے میں پریوں کی ساتھ تھے۔۔۔“

نے الاؤ روشن کر رکھا تھا۔
اس رات نجھے بخار بست تھا اور زکام بست تھا۔۔۔ اور میں کوٹیں بدھ رہا۔۔۔
میرے بدن میں بھی درد تھا۔ خاص طور پر دونوں کندھوں کے جوڑوں میں۔۔۔ اور یہ رائے کوٹ گلیشیر پر لکھنے کا نتیجہ تھا۔۔۔ بخار کی حدت میں ایک سوتھی بھی تھا اس لئے میں بے مزہ نہ ہوا۔۔۔ رات کے چھٹے پر میں نے بستر محوس کیا۔ ایسے لگا جیسے میرے بدن پر رکھا ہوا یو جو جگی نے اخھا لیا ہو۔۔۔ میں گھری نیند میں چلا گیا اور پھر جانے کیا وقت تھا کہ میں نے گھری نیند میں ایک برا خواب دیکھا کہ میرے خیے کا پرده چاک ہو رہا ہے۔ نجھ سے اور پھر اس چاک شدہ حصے سے تیمور خان کا سر باہر آتا ہے اور کہتا ہے۔۔۔ ”اوے۔۔۔ اوے سوتا ہے؟“۔۔۔ لیکن یہ سچ تھا تیمور خان کا سر تھا جو خیے کے پرداے میں سے اندر آ کر کہ رہا تھا۔
”اوے۔۔۔ اوے سوتا ہے؟“

میں کچھ بھٹھدا ہو گیا۔۔۔ رات کے اس پریے کو متانی کیا چاہتا ہے۔۔۔ میرے پاس جو ایک عدو خان تھا وہ اس وقت خراۓ مار خان تھا اور بے خبر سوتا تھا۔۔۔ ”یا ہے؟“ میں نے اپنی آواز ناراض ہاتھ کی کوشش کی۔

اس نے جواب میں اپنی بندوق خیے کے اندر کر دی۔ ”یہ ہے۔۔۔“
”یہ ہے؟ میں لرزے لگا۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ یہ یہ۔۔۔ کیا ہے؟“

”بندوق ہے۔۔۔“ وہ بولا۔۔۔ اس سے تمہارے لئے مار خور مار کر لائے گا۔۔۔ اور بندول پاس سے۔۔۔ رات اوہ رہے گا۔۔۔ کل آئے گا۔۔۔ صرف تمہارے لئے جاتا ہے۔۔۔ انتحار کرنا۔۔۔“ خیے کا پرده برابر ہو گیا اور وہ چلا گیا۔۔۔
میں نے وقت دیکھا تو پانچ بجھے کو تھے۔۔۔ تھوڑی دیر کوٹیں بدلتے کے بعد میں خیے سے باہر آ کر میزس پر بیٹھ گیا۔۔۔

سردی شدید تھی۔۔۔ نالگا پرست کا ایک چھوٹا سا حصہ پہلی دھوپ میں تھا۔۔۔ گاؤفرے آنکھیں ملتا ہوا آگیا۔۔۔ تمہارا خیال ہے کہ تم اگر نالگا پرست سے آنکھیں اٹھاؤ گے تو یہ او جھل ہو جائے گی۔۔۔ اس وقت فیزی میڈو بالکل منہان پڑا ہے۔۔۔ آؤ کچھ تصویریں اتار لیں۔۔۔“

میں نے جاگر پئنے اور ہم نیچے اترنے لگے۔۔۔
فیزی میڈو کی گھاس میں سے چھوٹے چھوٹے پھولوں کی سفیدی اور زردی اس

اس شبہ سے ملک رہا ہوں۔“
”ہا۔“ ڈاکٹر بے حد خوش ہوا ”پھر تم میری زبان مجھ سکتے ہو۔“ یہاں تو ایسے ایسے پودے ہیں کہ میں کیا بیان کروں۔ یہ فیزی میڈو والے کو متانی مجھے خبطی سمجھتے ہیں کیونکہ میں اکٹر کسی تملی کے پیچے بجاگا ہوا اسے جال میں لانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہوں یا کمرے کے ساتھ کسی خلڑاک چنان کے ساتھ لٹک کر کسی پھول کی تصویر اتار رہا ہوتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ یہاں پائنس گیر اڑوانہ بھی پایا جاتا ہے؟“ ڈاکٹر کی پاچیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ مجھے سائش چاہنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

”میں میں نہیں جانتا تھا۔“ میں نے بھینپ کر کر۔

”اور جناب یہاں تمار کس گالیا بھی ہے۔“

”چھا۔“ میں نے کان کھجرا کر کہا ”تمکا ہے۔“

”میرے قریب آکر میری بات سنو۔“ وہ اب پودوں کی دنیا میں تھا اور بے حد خوش تھا کہ اسے مجھ بھیسا ”پودہ ایک پھر“ مل گیا ہے ”یہاں جو نہر سیکی گلوبروس ایتا زیادہ پایا جاتا ہے کہ تم تین نہیں کر سکتے۔“
”کیا واقعی؟“

”اور آر نہیں میری نہما کوچیا، روزا و بیانہ کو لوٹیا،“ بررس اور لوفی سیرا تو بے حد عام ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ زراعت کے پاکستانی ماہرین ان علاقوں کی بیانات پر بے شمار کتابیں تحریر کر پکھے ہوں گے۔“

زراعت کے پاکستانی ماہرین عام طور پر اپنے اسلام آباد کے دفتروں سے باہر نکل کر اپنے لان میں کھلے ہوئے پھول اور پودے بھی نہیں دیکھتے۔ یہ میں میں نے اسے یہ نہیں بتایا بلکہ کندھے اپکا کر ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جواب دے دیا جو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے ڈاکٹر فرنز کی کتاب کے اور اتن پر ایک نظر ڈالی۔ اس نے رائے کوٹ سے لے کر ناٹا پرست کے دامن تک کے علاقے کے نقشے بنا تائی حوالے سے بنا کر شامل کر رکھتے اور ادھر اگنے والا پتہ پڑ بونا بونا اس میں درج تھا۔

اس نے مجھے ناٹا پرست کی ایک ایسی تصویر دکھائی ہو جیاں کن جھی۔ ایک دسیج چیل میں ناٹا پرست سورج ڈاؤبنتے کے بعد گالی رنگ میں۔“ میں لوگوں کو

ڈاکٹر گارنٹ نے مجھ پر ایک اچھتی ہوئی نظر ڈالی اور پھر قتنہ مار کر ہنس دیا۔
”آپ کا کیا پروفسن ہے؟“

”اوارہ گردی۔“ میں نے بھی ہنس کر کہا۔

”آ۔۔۔ اے دیگا باغ۔۔۔ وہ تو ہم سب ہیں ورنہ ہم یہاں نہ ہوتے۔۔۔ لیکن جناب کیا شاندار ملک ہے آپ کا۔“ آپ خوش قسم ہیں جو اس ملک میں رہتے ہیں۔“

”ہم یقیناً ہیں ڈاکٹر گارنٹ۔ اور کیا آپ واقعی فیزی میڈو پر کتاب لکھ رہے ہیں؟“

”ایک لمحے۔“ اس نے اٹکی کھنڈی کی پھر انداخا اور اپنے خیسے کی طرف چلا گیا۔
واپس آیا تو اس کے پاس ایک قائل تھی جس میں کچھ فوٹو ٹیٹ شدہ کافتہات تھے۔
اور یہ اس کی کتاب کے کچھ در حق تھے جو چھپ پکھے تھے۔ ان میں فیزی میڈو اور ناٹا پرست کے دامن میں اگنے والے پھولوں اور درختوں کی تصیل تھی۔

”میں ایک سکول ٹھپر ہوں اور یہاں بست ہوں۔۔۔ فیزی میڈو اور اس کے آس پاس کا علاقہ میرا جانا پہکانا ہے۔“ میں اپنی کتاب کے سطے میں تین ماہ یہاں اکیلا گھوڑا رہا۔ یہاں پائے جانے والے پھول ”پودے اور جیساں ایک جگہ ہیں اس نے کہ ان میں ایشیائی، ترکی اور یورپی اقسام موجود ہیں۔ دنیا میں میں نے تو کم از کم کہیں بھی،“
کسی ایک مقام پر ان تینوں اقسام کو اگتے اور اڑتے نہیں پایا۔“

ایک پورٹھا آسٹرین ہو پکھے ہی بہت بیزار بیٹھا تھا ڈاکٹر کی گفتگو سننے کے لئے آگے آیا اور پھر مسکرا کر کئے لگا ”در اصل یہی وہ شخص ہے جو اس علاقے کی تعریف میں نہیں و آسمان ایک کردا ہے اور مجھے جیسے ریاضت پورڈ ہوڑھوں کو اولاد ہٹیل ہومز سے نکال کر یہاں لے آتا ہے۔“

بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر گارنٹ ایک کامیاب ٹریول ایجٹ بھی ہے اور لوگوں کو نور پر یہاں لے کر آتا ہے۔ اس کے علاوہ فیزی میڈو سے جیساں پکڑ کر یورپ کے چاہب گھروں کو پلاٹی کرتا ہے۔

”کیا تھیں پودوں اور درختوں سے دلچسپی ہے؟“ ڈاکٹر گارنٹ نے مجھ سے پوچھا۔

”میرے والد رحمت خان تارڑ ایک معروف ماہر زراعت ہیں اور انہوں نے زراعت کے موضوع پر درجنوں کتابیں تحقیق و تصنیف کی ہیں۔ میں بھی بت عرصہ

سے جب پہنچتے تو زندہ لگتے تھے۔ میں مسلسل اوہر دیکھ رہا تھا اور مجھے مسلسل اوہر سے بلاوا آتا تھا۔

"تم اور تمہارے دوست کبھی ہماری پہاڑی پر آؤ۔ نالہ پر بت کا جسیں تین روپ تو اونہ سے ہی دکھائی دتا ہے۔"

"ہم آئیں گے۔" مارتا نے گرجوشی سے ہاتھ طایا اور پھر مر جھک کر کئے گئی "تم بت عجیب مرد ہو۔"

"کیوں؟"

"پہ نہیں۔" اس نے پھر مر جھکا۔ "لیکن تم ہو۔"

جگل کے اندر وہی خاموشی تھی اور اس خاموشی کے اندر وہی سرسرابہت تھی اور میں اس کے اندر ایک ایس کی طرح حرمت میں گھوتا تھا اور وہ ایک وغیر لینڈ تھی۔

اس روز اور اس سے اگلے روز میں اسی وغیر لینڈ میں رہا۔ میں بہت کم فیری میڈو کی طرف آتا۔ کبھی میں جگل کی تھائی میں خوفزدہ ہو جاتا اور گھبراہٹ میں پرانے ہنوں کو پھلانگتا اور پانی میں چلتا داپس فیری میڈو میں آ جاتا۔ لیکن یہ بت کم ہوتا۔ میں اکثر اس میں گرم رہتا۔ اور اس جگل کے کم اسرار میں چلتے ہوئے مجھے مارکیز کے ناول "سو بر س کی تھائی" کا خیال آتا رہتا۔ اس کے جگل کا خیال آتا رہتا۔ ایک روز میں جیبل کی طرف بھی گیا جو ایک بڑا تالاب تھا جہاں منٹی پانی پینے کے لئے آتے تھے۔ اس کے باوجود اس میں خاموشی اور تھائی کا حسن تھا۔ اس کے کنارے بھی گرے ہوئے درخت تھے، بو سیدہ تھے اور کڑکراتی شنیاں۔ اور جیسا کہ ہوتا ہے مجھے فیری میڈو کی عادت ہو گئی اس پہاڑی پر ہستہ خیئے، قریب پرے درخت کے تھے، رائے کوٹ گلیشیر میں پوشیدہ دریا کی آواز اور نالہ پر بت کی صبح اور دوسرے اور شام کی عادت ہو گئی۔

اور جب عادت ہو جاتی ہے تو اس سے اگلے روز کوچ کرنا ہوتا ہے۔

تھے عادت ہو جائے وہ خانہ بدوسٹ نہیں رہتا۔ اس کے خیئے کے آس پاس گھاس بلند نہیں ہوتی چاہئے۔ تو اگلے روز رحمن اور قدم خان نے آتا تھا اور ہمیں فیری میڈو سے کوچ کرنا تھا۔

فیری میڈو کی یہ تصویر دکھاتا ہوں اور وہ کھنچنے پڑے آتے ہیں۔" "لیکن یہ محرمنے تو اونہ نہیں دیکھا۔ فیری میڈو میں جیبل کماں سے آگئی؟"

"اس کی ایک کمائی ہے۔ میں ایک روز جگل میں تھا کہ شدید بارش شروع ہو گئی۔ اونہ فیری میڈو کی طرف آیا تو اونہ داخلے کے پاس ایک جگہ پر تھوڑا سا پانی جمع ہو چکا تھا۔ بس میں نے ایک خاص زاویے سے نالہ پر بت کی تصویر ایسے آتا رہی کہ اس تھوڑے سے پانی میں وہ نظر آتے گی۔ بس کی وہ جیبل ہے۔ بس کی وہ تھوڑی سی دری بعد پانی خلک ہو گیا اور جیبل غائب۔ اب جو سیاح اونہ آتے ہیں تو مجھ سے پوچھتے ہیں کہ فیری میڈو کی جیبل کماں ہے تو میں کہتا ہوں یہ 'طلسی چراگاہ ہے'، جیبل غائب ہو گئی ہے۔"

"ویسے اونہ جیبل تو ہے۔"

"ہاں۔ وہیں داخلے کے ساتھ زرائیچے ایک عام سی جیبل ہے۔ کبھی کبھار جب میں پریوں کے ساتھ تھا ہونا چاہتا ہوں تو وہاں چلا جاتا ہوں۔"

"پریوں کے ساتھ۔۔۔ انہی پریوں کے ساتھ جو۔۔۔"

"ہاں وہی۔۔۔ پریاں" وہ پھر پہنچنے لگا۔

"آج شام اگر فرستہ ہو تو میرے خیے میں چلے آتا تمہاری ملاقات کرواؤں گے۔ پھر میں گے میں بیال کیپ جا رہا ہوں" وہ اسی طرح خوش و خرم ہاتھ ملتا ہوا چلا گیا۔

"یہ کس حرم کی پریوں کی بات کر رہا تھا؟" میں نے مارتا سے پوچھا جوڑا کر کی مٹکنگو کے دوران مسلسل مسکراۓ چلی جا رہی تھی۔

"یہ اس حرم کی پریوں کی بات کر رہا تھا جو کہ آدمی بوقت وہ کسی پینے کے بعد ہر ایک کو نظر آنے لگتی ہیں۔۔۔ سارا دن جگل میں گھوتا رہتا ہے اور شام ہوتے ہی اپنے خیے میں بند بو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وقت پریوں کے لئے ہے اور پھر کبھی اس کے گانے کی آواز بھی آتی ہے۔"

ہم جہاں بیٹھتے تو وہ جگل کا شروع تھا۔۔۔ یہاں سے ایک جانب تو فیری میڈو کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور دوسری جانب وہ گھری خاموشی تھی جو اونہ سے آتی تھی، بدر گھاموش نہیں میں برج کے سیکنڈوں ہر س قدم تھے پڑے تھے اور پانی کے زور

"اور اب نا ہے کہ نیری میڈو میں ایک ہوش بی رہا ہے۔ جنگل میں
کا۔ یہ پہاڑی جس پر ہم بیٹھے ہیں فروخت ہو چکی ہے۔" مارتا نے سر جنگل کر کیا
اور بہت بے بی سے کہا "آپ لوگ ایسا کیوں کرتے ہو؟ اور یہ بھی نا ہے کہ آپ
جنگل فروخت کر رہے ہیں۔ جب سرک بیں جائے گی تو یہ جنگل کٹ جائے گا اور
بتول ڈاکٹر گارنر اگر جنگل کٹ گیا تو نیری میڈو ختم ہو جائے گا اور یہاں سیالب کے
پانی آ جائیں گے۔"

"لوگوں کو روزگار ملتے گا۔ ترقی ہو گی۔ کیوں تارڑ صاحب آپ کا کیا خیال
ہے؟"

"ترقی تو ہونی چاہئے۔" میں نے بھی بے بی سے کہا "لیکن زمین پر کچھ
جگہیں تو ایسی ہونی چاہئیں جہاں خانہ پدوش جائیں۔ اور اگر نیری میڈو نہ ہو گا تو
خانہ پدوش کیاں جائیں گے۔"

تارڑی گھری ہونے لگی تو مطیع لاثین جلا کر لے آیا اور اسے ہمارے درمیان
رکھ دیا۔

ارسلا جو بیشہ چپ بیٹھی رہتی تھی ذرا جبک کر بولی "میں نے نا ہے کہ ہائی
پرست کے علاقوں میں برف کے انسان بھی ہوتے ہیں۔ کیا یہ بچ ہے؟"

"اگر یہ بچ ہے تو بھی کوئی کچھ نہ کے کیونکہ تھوڑی دری میں تو آپ پڑے جائیں
گے اور ہمارے لئے نیری میڈو میں اپنی آخری رات گزارنا مشکل ہو جائے گا۔
برف کے انسان غالباً خاصے خونخوار ہوتے ہیں۔" مطیع ہنسنے لگا۔ وہ یوں بھی مارتا کی
 موجودگی میں کچھ زیادہ ہنستا تھا۔

"کیوں چاچا۔" رحمت نبی نے اپنے چاچا کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" چاچا نے سر بلایا۔ "ہوتا ہے۔"

"یہ ارسلا خوفزدہ ہو گئی" واقعی ہوتا ہے؟"

"کدر ہوتا ہے بھی؟" مطیع کی خوبی مخدود ہو گئی۔ مجھ پر بھی کچھ لکھی سی
طاری ہو گئی۔

"اس کو ہم برداشت کتے ہیں۔ بن ماں کی طرح ہوتا ہے۔ ہمارے دادا کا اس
سے لڑائی ہوا تھا۔ اور نیری میڈو میں۔ ہمارے دادا کا بندوق نوٹ گیا تھا۔ بہت
لوگوں نے اور سے دیکھا۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید دو بڑے کتے لڑ رہے ہیں۔ ہاں۔

ہماری آخری شام کی دھوپ تھی جو ڈھل رہی تھی اور ہم اپنے خیموں سے باہر
بیٹھے ہائی پرست کو دیکھتے تھے اور ہمارے دل میں اس خالی پماڑ کے لئے بھی نرم گوشہ
پیدا ہوتا تھا اور ہم پھر جانے سے پھرداں اوسی کا شکار ہوتے تھے۔ شام کمری ہونے
گئی تو گاؤفرے نے ہاں جلائی اور ہمارے آخری کھانے کا بندوبست کرنے لگا۔
لکڑیوں کا دھواں اس تازہ اور تیز سرد ہوا میں مختنون میں جاتا تھا تو بھلا لگا تھا۔
یچے سے کچھ لوگ اور پر آ رہے تھے۔ رحمت نبی "مارتا، ارسلا، روینڈ اور کچھ
کوہستانی اور کچھ آسٹریلن بڑھے۔"

"تم نے کہا تھا ہاں کہ کبھی ہماری پہاڑی پر آتا۔" مارتا بانپی ہوئی میرے پاس
بیٹھ گئی۔ "اوہ مالی گاؤفرے۔ تم درست کتے تھے۔ یہاں سے تو ہائی پرست۔ تم درست
کتے تھے۔"

گاؤفرے نے ایک اچھے پادری چی کی طرح مسمانوں کے لئے جلدی سے کافی نا
ل۔ اور جو کافی نہیں پہنچتے ان کے لئے بیکٹ۔ "تیمور خان تو ابھی نہیں آیا؟" رحمت نبی نے مجھ سے پوچھا "وہ آپ کے لئے
مارخور شکار کرنے گیا ہوا ہے۔"

"لیکا واقعی اور ہمارخور بے؟"

"اومر برزل پاس میں تو اب بھی ہے۔" رحمت نبی کہنے لگا۔ "لیکن پہلے
ہمارے دادا کے نامے میں اومر بھی بہت تھا۔ میرے پرداوا جن کا نام خوش ملک تھا
اوہ شکار کرنے آئے تھے۔ وہ چلاس کی جانب سے گوڑ قارم کے راستے اومر
آئے۔ اور پہلی پار سامنے والی پہاڑی پر سُنچے اور انہوں نے یچے دیکھا تو یچے۔ یہ
نیری میڈو تھا۔ اس میں لبی لبی گھاس تھی اور گھاس میں جلی ہوئی سیاہ لکڑیاں تھیں
جو کسی مسافر نے شاید رات گزارنے کے لئے جلائی تھیں۔ پھر تارڑ صاحب وہ سیاہ
لکڑیاں حرکت میں آگئیں۔ کیونکہ وہ تو بہت سارے مارخوروں کے سینگ تھے جو
گھاس میں بیٹھے تھے اور اور سے ان کے صرف سینگ نظر آتے تھے۔ مارخور اشے
اور اومر جنگل میں پڑے گئے، پورا ریوٹ۔ پرداوا خوش ملک کو الیکی چراغاں کی حلاش تھی
جماب کچھ میدان ہو پائی ہو۔ انہوں نے واپس جا کر بر طابوی حکومت سے اجازت لی
اور اس زمین کا مالیہ دے کر اسے اپنی چراغاں بنالیا۔"

رہنے دو"

"الاؤ سے ذرا بیچھے ہٹئے تو شدید سردی کا احساس ہوتا۔

"مارٹ صاحب نانگا پریت کی دوسری جانب ایک وادی ہے۔ وادی م روپل۔ اور ایک وسیع میدان ہے لا تو بوس۔ چوٹی کے میں نیچے، وہ بھی بے حد خوبصورت ہیں۔۔۔ کبھی ادھر بھی جائیے گا۔" رحمت نبی اشتبہ ہوئے بولا "میچ ملاقات ہو گی۔۔۔" اور وہ اپنے چاہا کے ہمراہ نیچے اترنے لگا۔ باقی لوگ بھی رخت ہونے لگے۔ تھامس اور مشاکل اپنے خیے میں جا چکے تھے۔ مطیع بھی انھا اور خیے میں چلا گیا۔۔۔ میں گھنٹوں پر سر رکھے ہوں دیکھا رہا۔ الاؤ مدم ہونے لگا تو میں اس میں مزید لکڑی ڈال دتا۔

آواز صرف لکڑی کے جلنے کی تھی، پوشیدہ دریا کی تھی اور تیز ہوا کی تھی۔۔۔ یکدم دریا رک گیا اس کا شور بھم گیا۔

"ستارے۔۔۔" گاؤفرے نے پکارا۔ وہ مجھ سے کچھ فاسٹے پر کھلی فنا میں اپنے سینپنگ بیک میں لیٹا ہوا تھا "الاؤ میں مزید لکڑی نہ ڈالنا۔ ہلکی کی روشنی ہوتی ہے تو مجھے ستارے نظر نہیں آتے۔۔۔"

چونکہ شدید سردی تھی اس نے الاؤ بڑی تیزی سے ٹھنڈا ہونے لگا۔۔۔ ہمارے آس پاس اندر ہمراہ ہوا تو نانگا پریت کی سفیدی کچھ کچھ دکھائی دینے لگی۔۔۔ اور آسمان پر ستارے نظر آئے گے۔۔۔

نیچے زمین پر نیزی میڈو کا راست نظر آ رہا تھا۔

دو پہاڑوں کے درمیان جو لکیر تھی وہ تاؤ نالہ تھا جس کے آخر میں رائے کوٹ کلیشز لینا تھا اور اس پر نانگا پریت سایہ قلن تھی۔۔۔

رائے کوٹ کلیشز پر ایک سربز حصہ جھکا دکھائی دیتا تھا جو نیزی میڈو تھا اور میں دو برس پیشتر اپنے قیام کی آخری رات ہم نے ایک الاؤ روشن کیا تھا اور گاؤفرے نے کما تھا اسے بجا دو مجھے ستارے نظر نہیں آتے۔۔۔

ہمارا فوکر طیارہ اسلام آباد سے گلگت جا رہا تھا اور ہم اس وقت دریائے سندھ کے اپر پرواز کرتے ہوئے رائے کوٹ پل کے قریب آپچے تھے اور میں نے واضح طور پر اس سپاٹ کی نشاندہی کی جہاں پل کے پبلو میں رتلی زمین پر دو برس پیشتر میں

برداشت تو ہوتا ہے۔۔۔"

"اس کی کچھ تفصیل ہائیں۔۔۔" میں نے چاہا سے پوچھا۔۔۔

"میں نہیں تفصیل ہیں ہابنے۔۔۔" مارٹا ہاتھ اٹھا کر بولی "اس وقت نہیں۔۔۔ اکچھے مجھے یقین ہے کہ سنومن کا وجود نہیں ہے لیکن ان ہائلین علاقوں کا کچھ ہے نہیں۔۔۔"

"آپ یہاں الاؤ کیوں نہیں روشن کرتے؟" رحمت نبی کہنے لگا "پبلو بھی سب لوگ اپنے حصے کی لکڑی لے کر آئیں۔۔۔"

اور حیرت انگیز حد تک لکڑی بے حد خلک تھی اور چند لمحوں کے اندر ہمارے جھیموں کے سامنے الاؤ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور اس کی روشنی میں ہمارے چہرے تھتھا رہے تھے۔۔۔ مطیع بڑے بڑے تھے کہنپتی ہوا لارہا تھا اور الاؤ کی بلندی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔۔۔ آس پاس جو کچھ دکھائی دیتا تھا وہ ہلکے نئے غصت کر دیا اور اب ہمارے چہرے تھے جو چکتے تھے۔۔۔

"ہوا کے رخ کا دھیان رکھنا کہیں نیچے زمین نہ آ جائیں۔۔۔" کسی نے کہا۔۔۔

مارٹی میں سے یکدم کچھ سامنے آگیا۔۔۔ مارٹا اور ارسلانے ہلکی سی جھیں ماریں اور ایک دوسرے سے پلت گئیں۔۔۔ ہمارے سافس بھی نیچے کے نیچے اور اپر کے اوپر، کیونکہ سنومن کی دہشت ہم میں تھی۔۔۔ لیکن یہ تیور خان تھا۔۔۔ تھکا ہوا اور پڑھر دیں۔۔۔ اس کا بھائی بھی ہمراہ تھا۔۔۔ وہ ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئے "تمیں ماسور کا پچھا۔۔۔" تیور نے زمین پر تھوکا "ہم صح چلے اور رات کو ادھر برزل پاس کی چٹانوں پر نیچے۔۔۔ رات ہلکا کر بیٹھئے اور صح سوپرے پورے سات مارخور دیکھئے۔۔۔ ہمارے سامنے تھے پر ہاتھ نہیں آئے۔۔۔ جتنی دیر میں نشانہ لیا وہ غائب ہو گئے۔۔۔ بت تلاش کیا یارا۔۔۔ ٹکرنا کو ہم پھر جائے گا اور تم کو ضرور مارخور کھلائے گا۔۔۔"

"ہم تو صح بارہے ہیں تیور۔۔۔"

"پر کیوں یارا۔۔۔ یہ اچھا جگہ ہے ادھر نہیں۔۔۔"

جھیموں کے پیچے جو بڑا تھا جس کے ساتھ نیک لگا کر ہم بیٹھتے تھے، منہ ہاتھ دھوتے تھے اور ہوا سے بچاؤ کر کے چولما جلاتے تھے مطیع اس تھے کو الاؤ تک لانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔

"میں مطیع۔۔۔ اسے رہنے دو۔۔۔ ہمارے بعد کوئی اور بھی تو آئیں گے۔۔۔ اسے

لے اور مطیع نے اپنا خیر نصب کر کے رات گزاری تھی۔

میں ایک بار پھر دیو سائی میدان عبور کرنے کی غرض سے گھر سے لکھا تھا۔

اور اس سفر میں میرا چھونا پینا سیر اور میرا مصور دوست منصور رای تھے۔

اور ہم فیزی میڈو کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

اور نانگا پریت کی بلندی جیسے جہاز کو چھوٹے کو آتی تھی، ہم بے حد نزدیک

تھے۔ میں اور سیر طیارے کی چھوٹے سے کاک پٹ میں بجکے ہوئے کھڑے تھے اور

ہم گلگت جا رہے تھے۔

دوسرے اسٹر

- ۱ - گلگلت گیم
- ۲ - روڈ ڈا استور اور چکور ہی چکور
- ۳ - ترشنگ، پاکستان کا خوبصورت ترین گاؤں
- ۴ - روپیل گلیشیر کے ہاتھی اور شوکور پر ایک زرد خیس اور سرو رات
- ۵ - ٹاپ میدان اور شل مکھی دیا میر (سو چھروں والا پہاڑ)
- ۶ - لا تو بو۔ میں کمپ نانگا پریت پر تارٹ پر چشم
- ۷ - شکاری یار محمد اور لا تو بو کا آخڑی ہرن اور داستان نانگا پریت
- ۸ - کوہ پیماوں کا قبرستان جہاں ہوا تیز چلتی تھی
- ۹ - ٹاپ میدان کی رات میں الاؤ اور اس کے سامنے نانگا پریت پر
- ۱۰ - گھر لوٹنے والے مویشی
- ۱۱ - وادی روپیل دیکھنے والے آوارہ گرد کی مسکراہٹ میں فرق ہوتا ہے
- ۱۲ - ترشنگ ایک تصویر
- ۱۳ - پورٹر سلطان کے کوہستانی گھر میں
- ۱۴ - خوبصورتی کا خوف اور راما جھیل
- ۱۵ - دھنڈلاتی ہوئی، ایک خیال میں نانگا پریت

”گلگت یم“

نچے نہن پر نیزی میڈو کا راست نظر آ رہا تھا۔
میں دو برس پہنچ، اپنے قیام کی آخری رات ہم نے ایک الاؤ روشن کیا تھا
اور گاؤفرے نے کہا تھا، اسے بجا دو بھے ستارے نظر نہیں آتے۔
دو برس پہنچ۔۔۔

اور اب تانگا برت کی بلند ترین چٹی جیسے جماز کے پر کو چھوٹے آتی تھی ہم بے
حد تزویک تھے اور کاک پٹ میں بھکے ہوئے کھڑے تھے اور ہم گلگت جا رہے تھے۔
اور وہاں سے استور، ترنسنگ، واوی روپل اور تانگا برت کی روپل سائٹ۔ اور
پھر وہاں سے دیوسالی کے میدان عبور کر کے گئے۔ کم از کم ہماری منصوبہ بندی تو یہی
تھی۔۔۔ اور اس بار میں نے خصوصی طور پر اگست کے آغاز کا چنانچہ کیا تھا کہ ان دونوں
بھر صورت دیوسالی کی برنسی پکھل جاتی تھیں۔۔۔

کیپٹن زیبر کا کہنا تھا کہ ایک مرجب دیوسالی میدان کے اوپر پرواز کرتے ہوئے میں
نے ایک چیان کر دیتے والا منظر دیکھا۔ دیوسالی کی ایک جیبل اوپر سے اتنی شفاف
اور ساف تھی کہ اس کے پانی دکھائی نہ دیتے تھے اور جیبل کی = اور کنارے بالکل
خلال نظر آتے تھے۔

اس دیوسالی پر دھوپ لٹکے تو گرمی تاقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اگر دھوپ
کے آگے چھوٹا سا بادل آجائے تو اس کے سامنے میں درج حرارت منقی ہو جاتا ہے۔۔۔
دو برس پہنچ راس غظیم میدان نے مجھے راست نہیں دیا تھا کہ اس راستے کی
برنس جولائی کے آخر کی شیں پکھلی تھیں۔۔۔ اور اب تو اگست کا آغاز تھا۔۔۔ وہاں
میرے لیے راست ہو گا۔۔۔

اور سچ نیز سارے پاکستان اور پیارے پاکستان" کہہ رہا تھا اور اس وقت پورے سات بچے تھے اور ہم سوڈیو میں بیٹتے ہوئے بچے تھے اور ابھی تک چھمچھم بارش برس رہی تھی۔ اور میں بے حد محبترا ہوا تھا۔ اگر آج فلاٹ نہ گئی تو کیا ہو گا۔۔۔ میرے پاس بے حد مختصر وقت تھا۔ چند روز مری چان صرف چند روز اور ان میں جتنے دن کم ہوں گے اتنے ہی سافن کم ہوں گے۔۔۔ میں اگلا پروگرام انداز کرنا اور جب پروگرام آن ائمہ جاتا تو میزان کی کری چھوڑ کر گئے میں سے ماںک اتار کر بجا گتا ہوا سوڈیو ز سے باہر جاتا اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھاٹکتا۔ باہر بارش اور تندر بارش۔ اور میں مایوسی میں پچھتا ہوا پھر واپس آ جاتا اس لیفین کے ساتھ کہ نہیں آج نہیں۔۔۔ پروگرام کا اختتام ہوا تو میں نے ناکلن کو اپنے سفر کے پارے میں تباہا اور "آپ کے لئے اور پورے پاکستان کے لئے ایک خوش فیض ون کی خواہش کے ساتھ" اجازت لے کر سوڈیو ز سے باہر آ گیا۔۔۔ بارش رک پچھلی تھی میں باول ابھی تک کھنے تھے۔۔۔

"ایمپورٹ لاونچ میں ایک ایئر ہوش میرے پاس آئی" تاریخ صاحب میں آپ کے لیے کیا گرستی ہوں؟"

"آپ میرے لیے دعا کر سکتی ہیں" میں نے سرہا کر کہا "یہ دعا کہ آج گلگت کی فلاٹ چلی جائے"

"ابھی تو بادل ہیں اور گلگت کی فلاٹ۔۔۔ خیر میں دعا کروں گی۔۔۔" وہ بسکراتی ہوئی چلی گئی اور اسی لئے سلمان رشید وارد ہو گیا "السلام و میکم بھائی جان۔۔۔ میں سلمان رشید ہوں"

"اچھا؟" میں نے ایک بوسیدہ مسکراہٹ کے ساتھ سرہا یا۔۔۔ میں اس قسم کے کرواروں سے سخت بیزار تھا جو فنی الفور فری ہو جاتے ہیں اور آپ کو بھائی جان۔۔۔ چاچا گی۔۔۔ بیبا گی۔۔۔ غیرہ بنا لیتے ہیں۔۔۔ یہ صاحب ایک چیک شرٹ اور جین کے علاوہ ایک بست بڑی مسکراہٹ میں ملبوس تھے "میں بھی گلگت جا رہا ہوں"

"ہوں!" اور میں نے سرہا یا "اگر فلاٹ نہ گئی تو۔۔۔"

"بھائی جان فلاٹ جائے ہی جائے" اس نے پورے لیفین کے ساتھ کہا۔۔۔

"ہو نہ جائے ہی جائے" میں نے اتنی ہی بے لیفین کے ساتھ کہا اور اسی وقت لاونچ کے پورے شیشوں میں سے میں نے دیکھا کہ ایک موڑڑا سلمان سے بھری ایک جات کھڑے فور جہاز کی طرف چلی جا رہی ہے۔ اور اس پر ہمارے نیلے اور سچ رک سیک رکے ہوئے ہیں۔۔۔ اگر سلمان لد رہا ہے تو فلاٹ جا رہی ہے۔۔۔

اس سفر میں میرے ساتھی نقابی اور خان کی بجائے میرا چھوٹا بیٹا سیمہر اور مصور منور راہی تھے۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ایک ایسے جہاز میں سوار ہوں جو ساف موسوں میں گلگت کی جانب پرواز کر رہا ہے۔۔۔ ہر مسماتی سفر کی طرح اس سفر کی منصوبہ بندی اور تیاری پر بھی بہت پہنچ بہا تھا، بہت دنوں سے مشقت ہو رہی تھی۔۔۔ صبح کی نشریات سے رخصت کا بندوبست رک سیک سلیپنگ بیگ۔ کھانے پینے کا عمل انظام۔ راستے کے بارے میں معلومات اور ان کے سوا ایک ہزار ایک باتیں۔۔۔ سوال اور ان کے جواب جو کبھی ملتے اور کبھی نہ ملتے گلگت کے لیے شتمی پی آئی اے کے تاریخ اور اپنے دفتر سے بک ہوتی ہیں۔۔۔ وہاں زیادی صاحب نے فوری طور پر نہیں کام اتنا گھنی کیا۔۔۔ شاید اس روز پہلی جائے۔۔۔ پھر کچھ سوچ کر مسکراۓ "ویسے تمام آوارہ گروں کے چرے ایک جیسے ہوتے ہیں۔۔۔ پر شوق اور تمثالت ہوئے۔۔۔ پا آئیے میں بھی ایک پانچت ہیں زیادہ۔۔۔ وہ بھی پہاڑوں میں دھکے کھانے کے بڑے شو قین ہیں۔۔۔ پچھلے دنوں دیو سالی میدان بھی گئے تھے۔۔۔"

دیو سالی کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔۔۔ میری فرانش پر زیادی صاحب نے زیبر صاحب کو فون کیا "معلوم ہوا نماز پڑھ رہے ہیں۔۔۔ شام کو ہوں گے میخ کر میں نے پھر کو شش کی۔۔۔ زیبر صاحب سے بات ہوئی۔۔۔ کہنے لگے، چند روز تھمر جائیں تو میں پھر جانے کو تیار ہوں۔۔۔ اگلے پانچ روز روزانہ زیبر صاحب سے گفتگو ہوئی اور ان کی پہاڑوں میں آوارہ گروں کے حوالے سے ہوئی۔۔۔ (اگست ۱۹۸۸ء میں پی آئی اے کا ایک فور جہاز گلگت سے اسلام آباد آتے ہوئے تھا) پہنچت اور دیو سالی کے علاقوں میں لاپتہ ہو گیا۔۔۔ کیپشن زیبر اس جہاز کے پائلٹ تھے۔۔۔)

اور سیمہر کے ساتھ میرا وعدہ تھا کہ جب وہ آٹھویں جماعت میں جائے گا تو میں اسے اپنے بہراہ ٹریکنگ پر لے جاؤں گا اور اب وہ نویں جماعت کا طالب علم تھا۔۔۔ مجھ سے زیادہ بندہ ہو چکا تھا۔۔۔ منور راہی بھی پہاڑوں کا ڈسائی ہوا تھا۔۔۔ صبح کی نشریات میں بچوں کو مصوری سکھاتا تھا۔۔۔ بھگال تھا لیکن ایک نتعلیق لکھنؤی انداز کی خاتون سے شادی شدہ تھا اور ہر سافن کے ساتھ اس کے نام کی ملا چلتا تھا۔۔۔ اگر آپ اس سے پوچھیں کہ راہی آج موسم کیما ہے تو وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کے گا۔۔۔ با جزو! اور آج موسم بہت برا تھا۔۔۔

ہماری فلاٹ سازی میں بچے صبح تھی۔۔۔ ہمارے رک سیک ٹھی وین کی سو زوکی وین میں پڑے تھے اور میں پورے پاکستان کو "السلام و میکم خواتین و حضرات

ہم زمیں سے کوئی ٹوٹوں کلو میٹر دور آ جکے تھے۔ صرف عکھے کی ایک مدھم شور کرتی آواز تھی اور جہاز کا ایک دنگ تھا جو ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم ان پہاڑوں کے اوپر ہوئے جن کی چونٹوں سے برف کی لکیرس یخے اترتی تھیں اور وہاں ایک بڑی جھیل تھی جو سیف الملوك تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ سیف الملوك ہے لیکن اس بلندی سے وہ ہمارے لئے کوئی اور جھیل تھی۔ کسی خلاء میں، کسی خیال میں ایک نیتاںوں عکس۔ پھر بابو سر لیکس۔ اور ہارس شو یاں کوئنکہ یہ گھوڑے کے نعل کی ٹھلل کی ہے

"اوے ابھی میں نے ہارس شو لیک نہیں دیکھی کہاں ہے؟" سیرچوک کر بولا۔
 "..... آپ دیکھیں گے بینے۔" پائلٹ نے پیار سے کہا اور پھر خصوصی طور پر جہاز کو
 ذرا ڈائج کر کے اس زاویے پر لے گیا جہاں سے سیراس جھیل کو دیکھ سکتا تھا۔

"ویکھ لی؟" باکلٹ نے پوچھا۔
"تینک یو انکل۔"

اور پاٹک نے جہاز کو پھر سے سیدھا کر لیا۔
سینگھ یہوئی ہماری جانب آ رہی تھی۔

برف پوش چنٹوں کا ایک سلسلہ جو کسی بڑھنے حسن خوابیدہ سے مشابہ تھا۔
برف کی ایک عورت... جو یقیناً بے حد شہنشہ تھی۔ اسی لئے تو ابھی تک وسی کی
فسکی ہی لشکر ہوئی تھی..... اس کا سینہ اور ٹھوڑی بے حد نمایاں تھے..... شپے دو
الگ تھلک اور ویران جیلیں تھیں جنہیں بر سے جہاز مرواز کر رہا تھا۔

"ان کا کیا نام ہے" سیرنے پاٹک سے دریافت کیا۔

"یہاں لوگ جاتے ہوں گے؟"

”نہیں۔ ان تک جانے کا کوئی راستہ نہیں۔“

"کوئی تو ہو گا" سیرنے بے چینی سے سر ہالیا۔ اور مجھے اس میں اپنا آپ نظر آتا۔

موسیم حیرت انگلیز طور پر صاف اور دور دور تک چلتا تھا۔۔۔ پاکٹ نے اصرار کیا کہ ہم گلکت لیند کرنے تک کاک پٹ میں ہی فخرے رہیں۔۔۔ اس چھوٹے سے کاک پٹ میں جمال دو آدمی بمشکل بیٹھے ہوئے تھے اور ہم دونوں بمشکل اپنے آپ کو اس کے اندر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔ دنیا کا وسیع ترین کوہستانی سلسلہ نظر آ رہا تھا جو ہمارے آس پاس سرکتا چلا جاتا تھا۔۔۔ پاکٹ نے ایک گیر نما شے دبا کر

”بہتر کا کیا حال ہے؟“ اس کوار سلمان رشید نے پوچھا ”بھائی جان ہم دونوں کا کوں آئیڈی میں اکٹھے تھے۔ آج کل کہاں ہے؟“
 ”بیخ بہتر؟— وہ ان دونوں ترکی کی پہاڑیوں میں ہے۔ لیکن آپ۔“
 ”میں نے آری چھوڑ دی ہے کیونکہ مجھے آوارہ گردی کا شوق ہے بھائی جان۔“ سلمان رشید کی مثل سے بالکل یہ محرث غمیز ہوتا تھا کہ وہ کبھی آری ڈپلن کا بھی پابند رہا ہے۔ ”مجھے یاد ہے کہ میں نے کامیوں کی پہلی کتاب بہتر سے لے کر پڑھی تھی اور اس پر آپ کا ہام لکھا تھا۔“

"لیکن تم اب کیا کرتے ہو؟"

”آوارہ گردی بھائی جان۔ گلگت سے میں سکردو چاؤں گا ایک ٹریک پر اور پھر اخباروں میں سفر نامہ لکھ کر روزی گلکاؤں گا۔ بن میں اور کچھ شیں کرتا“

لاؤچ میں نصب شدہ سیکریٹریز میں کچھ گونجی پیدا ہوئی اور پھر وہ اعلان سنائی دیا جو ہم سنتا چاہتے تھے "خواتین و حضرات گلفت کے لئے ہماری پرواز روانگی کے لئے تیار ہے

..... آپ سے التاہس ہے کہ گیٹ نمبر ۲ سے جہاز پر تشریف لے جائیں اور لاڈنگ سے لکھتے ہوئے اپنے سگرٹ بچا دیں۔ ”تھریہ“

جیٹ ہوائی جہازوں کے بعد وکر طیارہ ایک کھلونا ہے ... ایک ایسا کھلونا جو
ہمیں بچپن میں لے جاتا ہے جب جادوئی قالین آسمانوں پر اڑتے ہیں اور ہم ان پر
سوارِ حرمت سے دنیا کو گزرتا دیکھتے ہیں۔

راہی مسلسل کھرے سے آنکھ لگائے تصوریں اتار رہا تھا۔ میر کے چہرے پر وہ سرست اور حیرت تھی جو پہلی پرواز کے دوران ہرچہرے پر ہوتی ہے۔ جہاز اڑا اور سرگل کی پہاڑیوں کو عبور کر کے تھوڑی دیر کے لیے جانی پہچانی لینڈ سکیپ سے گزرا اور پھر ہمارے پیچے قراقرم اور ہمالیہ کے برف زار تھے۔

نماری درخواست پر ہمیں کاک پٹھ میں بلا لیا گیا۔ یہ اتنا چھوٹا تھا کہ ہم جگ کر بیٹھل اپنے آپ کو اس میں قائم رکھتے تھے۔ صرف ایک ٹھنڈی ذرا اونچا ہو کر پاٹک کے کندھے پر سے جھاک کر اس مٹھر کو دیکھ سکتا تھا جو شاید وہاں نہ تھا بلکہ کہیں اور کسی اور دنیا اور کائنات اور سارے میں تھا یا شاید کوئی قلم تھی یا سوتے جائے میں کوئی لمحہ تھا یا موت کے بعد کوئی وادی تھی جو بیند آنکھوں کے اندر تھی اور جو کوئی س وادی کو دیکھتا تھا واپس نہیں جا سکتا تھا۔۔۔ ہم ایک اڑن کھولے پر سوار اس ادی میں خاموشی سے تیرتے تھے جہاں کوئی نہ تھا۔ برف تھی، برف کے راستے اور ٹھیلیں تھیں اور بہبیت ناک خاموشی تھی۔ کوئی اور سیارہ تھا جس پر ہمیں اترنا تھا اور

جانب جا رہا تھا..... نیچے شاہراہ ریشم پر دو کاریں ریک ری تھیں، گلگت کے چنانوں کے ساتھ چوتھیاں چٹی ہوئی ہیں۔ جہاز نے ایک دچکے کے ساتھ اپنے پیسے نکالے۔ اور چند لمحوں میں ہم گلگت کی زمین کو چھوڑ رہے تھے۔

ماونٹ بلور ہوش، گلگت کے میں بازار میں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں ہے۔ بلکہ وہاں ہے جہاں ایک پوشیدہ پر سکون پرانی رہائش گاہ ہے جس کے آس پاس ایک شم دیران بلاغ ہے اور جہاں سیب اور اخروت کے درخت ہیں۔ اس کا ماحول گلگت سے الگ اور کثا ہوا ہے۔ پھرلی دیواروں پر جگلی گاب کی نیٹیں چھائی ہوئی ہیں اور گھاس کو ایک حصے سے کاناٹیں گیا۔ البتہ یہاں کے بستر مقابل کے کسی مقابلے میں کسی تم کی پوزیشن حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن یہاں ایک ایسا غہراؤ ہے، ایسی سُستی ہے کہ انسان کسی اور جگہ جانے کے قابل نہیں رہتا۔ برآمدے میں نہایت قدیمی صوفوں کے ڈھانچے ہیں جن پر اب بھی تھوڑی بست کوشش سے بینہ جانا ممکن ہے۔ یہاں کے دیگر بھی خاموش اور دستے ہیں۔ راہبر حسن سینگر ہیں اور انہیں سکرانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔

اور یہاں ایتر پورٹ سے آئے کے بعد مظہر کچھ یوں تھا کہ سیر پالغ میں خیر زن چند انگریز یا آئریش یا سکاٹش تم کے یا ہوں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ راتی بستر پر لینا یوگا کی کسی مشق میں مگر تھا۔ سلمان سورہا تھا اور خراۓ لے رہا تھا اور میں برآمدے کے قدیمی صوفے پر براہمن اپنے اندر بے حد خوش تھا کہ مجھے وہ کچھ مل رہا تھا جو میرے دل کی خواہش تھی۔

گلگت ایک ایسا شہر ہے جس کے درود یو ار میں صرف کوہ پیائی اور ایڈو نیپر کی کمانیاں ہیں اور جہاں سے نامعلوم وادیوں اور دور افتابہ پہاڑی سسلوں کے لئے بے شمار راستے نکلتے ہیں۔ یہ کیا عجیب احساس تھا کہ ابھی صرف سازی میں گھنے پہنچنے کا ذفرے نے کما تھا؟ سے بجا دو ٹھنگے ستارے نظر میں آتے۔ دو برس پہنچنے۔ بولڈر رنج ہمارے میں نیچے تھی اور یہیں کمیں میں اور خان گرمی اور چھائی کی شدت سے بوکھلائے ہوئے ایک ایسے عی جہاز کو دیکھتے تھے۔ تا تو نالہ رائے کوٹ گلیشیر سے چلتا آ رہا تھا اور دریائے سندھ میں گم ہو رہا تھا۔ ناٹا پرست کی پوری برفیلی کائنات و انسیں باخچ پر تھی اور اس کے دامن میں فیری میڈو تھا۔ فیری میڈو اور تھا اور اس پار ہم نے ناٹا پرست کی دوسرا جانب اور جہاں تھا اور وہ دریہ یہاں سے نظر میں آتا تھا۔

جہاز نیچے ہونے لگا۔ وادی اے گلگت کے بزرگلوے دریائے گلگت کے آس پاس تھے اور قریب ہو رہے تھے۔ ہم اپنی نشتوں پر واپس چلتے گئے۔ جہاز ایک چٹان کی

جہاز کو قدرے بلند کیا۔ سامنے کامنگر قدرے نہیاں ہوا "میرا خیال درست ثابت ہوا ہے آج کے نو نظر آ رہی ہے۔ ذرا غور سے دیکھنا ہو گا" قابلہ بنت ہے۔

خاموش پہاڑوں سے پرے جہاں بہت برف تھی اور نیچے پاہل تھے اور اوپر سو فیصد نیلا اور نکلا اور خالی آسان ہے۔ بہت ساری چوٹیوں میں سے ایک کے نو یا شاہ گوری تھی۔ کونسی؟ جس کے اوپر ایک موہوم سا زرد پاہل بھی نظر آتا ہے اور بھی خیل میں اس کی تمام تر تصویریں جو تھیں وہ باری باری دکھائی پڑتی تھیں اور بھی اس کی بھلی زرد شبیہ کا دھوکر سا ہوتا تھا۔ البتہ مشور چوٹی براڈ پیک واقعی بے حد چوڑی تھی اور صاف ابھرتی تھی۔ کیسریم سلطے کی چوٹیاں بھی نظر آری تھیں اور راکا پوچھی چوٹکے قریب ترین تھی اس لئے وہ برف ہی برف تھی۔ جہاز کا زاویہ ذرا سا بدلا تو کے نو واقعی نظر آگئی اور یہ ہماری خوش بختی تھی کیونکہ فلاٹ کے دوران بہت کم لوگوں نے اسے دیکھا تھا بلکہ ایک ماہ کی مشقت اور کوہ پیائی کے پاؤ جوہ بے شمار کوہ میکا برے موسم کی وجہ سے اس کی خیل ویکے بخیر واپس آ جاتے ہیں۔ اور ہم نے اس کی خواہش نہیں کی تھی اور یہ نظر آگئی۔ اہرام نما کے نوجوانیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے۔

"گلگت اب زیادہ دور نہیں۔ ہم اس وقت چاس کے اوپر ہیں۔" پاہلے نے

نیچے دریائے سندھ کا بیل کھاتا ہوا وجود پہاڑوں میں بند تھا۔
— جہاز ذرا تر پھر ہوا اور پھر۔ نیچے نہیں پر فیری میڈو کا راست نظر آ رہا تھا۔

یہیں دو برس پہنچنے۔ اپنے قیام کی آخری رات ہم نے ۱ الاؤ روشن کیا تھا اور گاڑ فرے نے کما تھا؟ سے بجا دو ٹھنگے ستارے نظر میں آتے۔ دو برس پہنچنے۔ بولڈر رنج ہمارے میں نیچے تھی اور یہیں کمیں میں اور خان گرمی اور چھائی کی شدت سے بوکھلائے ہوئے ایک ایسے عی جہاز کو دیکھتے تھے۔ تا تو نالہ رائے کوٹ گلیشیر سے چلتا آ رہا تھا اور دریائے سندھ میں گم ہو رہا تھا۔ ناٹا پرست کی پوری برفیلی کائنات و انسیں باخچ پر تھی اور اس کے دامن میں فیری میڈو تھا۔ فیری میڈو اور تھا اور اس پار ہم نے ناٹا پرست کی دوسرا جانب اور جہاں تھا اور وہ دریہ یہاں سے نظر میں آتا تھا۔

جہاز نیچے ہونے لگا۔ وادی اے گلگت کے بزرگلوے دریائے گلگت کے آس پاس تھے اور قریب ہو رہے تھے۔ ہم اپنی نشتوں پر واپس چلتے گئے۔ جہاز ایک چٹان کی

"یہ تیار ہے۔" میں نے کہا "کس جیز کے لئے تیار ہے یہ تم خود پوچھ لو"
"کیوں راتی صاحب؟"

"میں اب مولیٰ نماز اور بیاز کا سینڈوچ کھانے کو تیار ہوں۔ یہ دیکھو" اس نے
بڑتے کے پیچے سے ایک شاپنگ بیگ نکال کر اسے بستر پر الٹ دیا اور متعدد نمازوں بیاز اور
مولیاں دغیرہ اور لڑکے گئے۔ "ڈبل روٹی بھی ہے۔" ڈبل روٹی کے ساتھ
نمازوں کا، ایسا کھانا جسیں پورے گلگت میں نہیں ملتے گا۔"
"حقیقتی نہیں ملتے گا۔"

راتی صاحب نے تقریباً زبردستی سب حضرات کو ایک ایک سلاکس اور مولیٰ یا
چلا ہوا بیاز تھا دیا۔ اور تم قدرے آبیدہ ہو کر اس سینڈوچ کو کھانے
لگئے۔ آئندہ چند دنوں میں راتی نے مجھے اپنی خوارک کی عادت سے بے حد جیوان
کیا۔ وہ بے حد سادہ غذا کھاتا تھا، کبھی بزیاب، اببلے ہوئے چاول اور دال۔ اور
بس۔

گلگت کے اس پلے نج سے ہماری شفی نہ ہوئی اور میسر ہوٹل سے باہر
آگئے اور نزدیکی بیکری سے کچھ متعاقی کیک خرید کر اپنا بیٹ بھرا۔ بیک صاحب کی
دوکان بھی یہاں سے بالکل قریب تھی۔ میں ایم بیک میرے لیے گلگت کا دوسرا نام
تھے۔ ایک ایسا غرض تھے میں دوست کر سکتا تھا۔ صرف وہ بلکہ جس ماحول میں
وہ بیٹھتے تھے وہ بھی میرے لیے کشش رکھتا تھا۔ طرح طرح کے تواریخ۔ نقش۔ کوہ
پیلائی کے روٹ۔ جنی ہیئتی کرافٹ۔ پڑالی قائلن اور ان کے درمیان بیک صاحب
شمی سکراہٹ کے ساتھ یعنی پر ہاتھ باندھے سرہلاتے ہوئے۔ اور اس دوران غیر
مکلی گاہک اور دوست جو کوہ پیلائی اور ٹریکنگ کے بارے میں ان سے مفت مشورے
کرتے تھے۔ میں بیک صاحب کی بک شاپ پر پہنچے تو وہاں ایک مخفی سانو جو ان جھاڑ
پوچھنے کر رہا تھا۔ "بیک صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ نہیں ہیں۔" نوجوان نے ہاک چڑھا کر کہا "میں یہک نام ہوں۔"

"نمیک ہے آپ یہک نام ہوں گے لیکن بیک صاحب کہاں گے ہیں؟"

"اوہ آپ تو تارڑ صاحب ہیں۔" نوجوان نے میرے نزدیک آگر مجھے سرسے
پاؤں تک اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہا "میں گھر فون کرتا ہوں" اس نوجوان نے گھر
فون کیا اور اطلاع کر دی کہ تارڑ صاحب لاہور سے آئے ہیں، ماؤنٹ بلور میں ہیں،
بیک صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔

"مکری۔ ویسے آپ کا کیا نام ہے؟"

"یہک نام۔" نوجوان مکرایا "میں بیک صاحب کا چھوٹا بیٹا ہوں۔"

ہم دوکان سے باہر آئے تو گلگت کے بازار میں تمن بڑے باگے گھر سوار جا رہے
تھے۔ وہ پہمان تھے شلوار قیض۔ پشاوری چلپوں، تئے دار قلچہ اور بندوقوں سمیت۔
لیکن وہ کچھ زیادہ ہی پہمان نظر آ رہے تھے۔ یہ تمن باگے جب ہمارے قریب آئے
تو معلوم ہوا کہ ان میں ایک باگی ہے اور پہمان لیاں میں ہے۔ بقیہ دو حضرات بھی
در اصل امریکی سیاح تھے۔

"ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنیں پکارا۔

"ورہ بخرا بکے راستے پہنچن۔ ساتھ چلانا پاچے ہو؟" ان میں سے ایک نے
پیچے مڑ کر ہاتھ پلا یا۔

بس یہی گلگت کی چار متحی، اس حرم کے مختصر مرف اسی شرمنی دیکھنے کو ملتے
تھے۔ دو سفید گھوڑے اور درمیان میں ایک براؤن رنگ کا لکھتے بدن والا قمر تھا۔
ہوا گھوڑا۔ اور ان پر نیلی گھوڑوں والے "پہمان" بونیا کی بلند ترین شاہراہ پر سفر
کرتے ہوئے ہمین جا رہے تھے۔ یہاں کے لوگ ایسے بھجوں کو بمحبوب نہیں سمجھتے،
انہیں عادت پڑ چکی ہے۔

"ابو چاران پڑیں؟" ریاض صاحب سے مل آئیں۔" میرے مشورہ دیا۔

چاران کے ساتھ ہماری بست ساری یادیں واپسی تھیں۔ ابھی دو برس قبل ہم سب
نیلی سوزوکی پر سوار جب بخرا بکے تھے تو گلگت میں ہم چاران کے چناروں میں ہی
تو قیام پڑی ہوئے تھے۔ راستے میں دو صاحبان سے راست پوچھا تو وہ بھی اور جا رہے
تھے۔ "ہم یہاں کا ایک گروپ چڑال سے لائے تھے، شہرور پاس اور ہمند کے
راستے۔ اب داہیں چڑال جائیں گے۔" چاران میں مسافر خلاش کرنے جا رہے
ہیں۔

ایک جانب باغ تھا اور اس باغ کے گھنے درختوں اور بے پناہ خود رو
چھوٹوں میں ایک گھر تھا۔ کسی ایسے غرض کا جو زندگی کی حقیقت جان چکا ہو۔ یہ
ایک قراقری ریاست کے بوڑھے شہزادے کی رہائش گاہ تھی۔

"چاران" وہیں تھا لیکن ریاض صاحب وہاں نہ تھے۔

"اب کہاں جائیں؟" میرے اپنی ٹھوڑی ہاتھ میں لیتے ہوئے سرہلاتے۔

"ماونٹ بلور ہوٹل۔ میں تھک چکا ہوں"

شام کو آؤں گا آپ کو لینے۔ ابھی گھر کو جاتا ہوں۔ ”بیک صاحب اٹھے درجہ بہ درجہ سب سے ہاتھ طالیا اور رخصت ہو گئے۔

”بھائی جان۔“ سلمان ابھی تک اپنی ٹھنڈ پر ہاتھ پھیر پھیر کر مزے لے رہا تھا مجھے یاد رہتا ہے کہ شمالی علاقوں کے بارے میں کئی انگریزی کتابوں میں شاید جن بیک صاحب کا ذکر آتا ہے تو شاید یہی بیک صاحب ہیں۔“
”یہی بیک صاحب ہیں۔“

باہر دھونپ ڈھل رہی تھی۔ اخروت کے گھیرے دار درخت کی شاخوں میں چیاں شور کرتی تھیں اور ہم برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہمارے پر ابر کے کرے میں کچھ جلپانی حرم کی کچھ چیزیں تھیں، ان کے بارے میں یہ ملے کرنا بے حد دشوار تھا کہ وہ عورتیں ہیں یا مردیں یا صرف کئی پتیاں ہیں۔ وہ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ بہت دنوں سے ماوتہ بلور کے اس کرے میں مقیم تھے اور وہیں برآمدے میں چاول وغیرہ ایال کرائیں دو دوہ میں بھگو کر کھا لیتے تھے۔

”ویسے بھائی جان“ سلمان کرے سے نکل کر برآمدے میں آیا جہاں صوفوں کے ڈھانچوں پر میں بخشکل توازن قائم رکھے بیٹھا تھا اور اخروت کے درختوں میں گوئی چڑیوں کی چکار سن رہا تھا۔ ”ویسے بھائی جان ٹھنڈ پر اگر ناریل لگایا جائے تو دلاغ کے علاوہ دیگر جسمانی عوارض کے لیے بھی بے حد منیہ ہے۔۔۔ آپ میری ٹھنڈ کو مانند تو نہیں کرتے؟“

”کرتا ہوں۔۔۔“

”اس کا علاج میرے پاس ہے“ اس نے گلے میں بندھا ہوا فلسطینی روہاں کھولا اور اسے سر پر گردے کر باندھ لیا۔۔۔ اب وہ کسی بے بس اور حسین و دشیروں کو لوٹ لینے والا سمندری قراقق لگ رہا تھا۔
جلپانی کروں کی جانب سے ایک نوجوان ہیرد نما شخص آیا اور پرانا مسودب ہو کر سلمان کے قریب بیٹھ گیا۔

”بھائی جان یہ اخلاق ہے۔ پرانا خوش اخلاق ہے۔“ یہ کہہ کر سلمان نے ایک زور دار قتفتہ لگایا جس کی شدت سے اخروت کا درخت چڑیوں سے خالی ہو گیا۔ ”یہاں شمالی علاقوں میں گور جانوالہ کی ایک مل کا کپڑا فروخت کرتا ہے۔“

اخلاق واقعی خوش اخلاق تھا اور اس نے شام کے کھانے پر ہماری رفاقت پر اصرار کیا اور ایسے کیا جیسے ہم اس کے گھر آئے ہوئے تھے۔۔۔

ہوٹل کے باغ باپیچے اسی طرح سکون اور سریز ہو رہے تھے اور ہمارے کرے میں بستر پر تیل برسز بیٹھا اپنے سنبھلے سر کو ایک کپے تروز کی طرح الگیوں سے ٹھوک بجا رہا تھا اور کہہ رہا تھا ”سواد آگیا ہے بھائی جان۔“

یہ سلمان رشید تھا جو تازہ تازہ ٹھنڈ شدہ تھا اور بے حد ہونج لگ رہا تھا۔ ”زیکنگ کے لیے ٹھنڈ بھترن شے ہے ہے بھائی جان۔“ سفر کے دوران سب سے زیادہ مٹی بآل جمع کرتے ہیں۔ اور نہ رہیں گے بآل تو پھر صفائی ہی صفائی۔۔۔ ابھی ابھی ایک کوہستانی تالی نے ایک عدد کھنڈے اسٹرے کے ساتھ ایسے ایسے کملات دکھائے ہیں کہ کیا بیان کروں خود ہی دیکھ لے جے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی ٹھنڈ سیست اٹھا اور جھکا جھکا میرے پاس آیا۔ ٹھنڈ پر تالی کے کملات بصورت روئی کے کھیت صاف نظر آ رہے تھے۔۔۔

راہی اپنی بیکم کو پھر پوسٹ کارڈ لکھ رہا تھا اور آہیں بھی بھرتا جاتا تھا ساتھ!

اور ایک کری پر سیدھی کردار ستری مکراہٹ کے ساتھ بیک صاحب تشریف رکھتے تھے۔۔۔ پتوں قیض میں اور قراقلی نوپی کے بغیر وہ خاصے نوجوان لگ رہے تھے۔

”ہاں آں۔ تارڑ صاحب۔۔۔ نیک نام نے آپ کا بتایا۔۔۔ ہمت دیر سے انتخار کر رہا تھا۔۔۔ سلبوق کا کیا حال ہے؟ بیکم صاحب ٹھنڈ ہیں۔۔۔ میرا بیٹھا ہوا چینی شیر پسند آیا۔۔۔ اس مرتبہ کہاں جائیے گا؟“ اکرام نے تو بھی آپ کے لیے خیر نہیں بیٹھا وہ خود ایک ہم کے ساتھ کنکورڈیا گیا ہوا ہے کے نوکے بیس یکپ کی طرف۔۔۔ اور آج شام ہار تھے ان میں قراقرم رائزر فورم کی جانب سے آپ کے اعزاز میں ایک شام ہے۔۔۔ گلگت میں کتنے روز قیام رہے گا؟“

میں مکراہٹا رہا اور مکراہٹ سر ہلاتے بیک صاحب کی گنگلو سنتا رہا اور پھر درجہ بہ درجہ ان کے سوالوں کے جواب دیئے۔

”اچھا۔۔۔ تو اس بار آپ روپیں اور دیو سالی جائیں گے۔۔۔ ان کی مکراہٹ کچھ اور زیادہ ستری ہو گئی۔۔۔ اچھا۔۔۔ تو پھر خوراک اور۔۔۔ کھانا پکانے کا بذوبست ہے؟۔۔۔“
”شیر؟ میرے پاس تو خیرے ختم ہو گئے۔۔۔ دریافت کروں گا آپ کے لیے۔۔۔ اور جانب فوری طور پر کل ہی سفر پر روانہ ہونا والش مندی ہیں۔۔۔ آپ میدانوں سے آئے ہیں ذرا موسم کو ایک دو روز میں قبول کریں پھر بلندی کی طرف جائیں۔۔۔ تو میں اب

"تارڑ صاحب یہ شاد میتا پاکستان کی پہلی کوہ ڈیا خاتون ہے..... بالتو رو گھیشز کر کے آئی ہے اور اب ہتھو رہ چا رہی ہے..... بہت زبردست لڑکی ہے جی۔۔۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ۔۔۔ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ۔۔۔" اور مجھے واقعی اس سے مل کر بے حد خوشی ہوئی تھی ۔۔۔ "اور تم کیا کر رہے ہو؟"

نجیب کو بس اسی سوال کا انتظار تھا "آپ دو لف گینگ کو جانتے ہیں؟ نہیں جانتے ۔۔۔ جرس ہے اور دنیا کے مشور تین راک کا بیگز میں شمار ہوتا ہے ۔۔۔ لیکن وہ دوسرے چٹانوں پر چھٹے والوں کی طرح نہیں ہے کہ رسول نبیوں اور کھاڑیوں کی عدو سے اپر جائے بلکہ وہ فری کلامبک کرتا ہے ۔۔۔ اس طرح "نجیب نے ہتھیلیاں پھیلا کر اپنی اگلیوں کو کسی خیالی چٹان میں پوسٹ کرتے ہوئے کہا "وہ کوئی سارا نہیں لیتا اور صرف اپنے پاؤں اور ہاتھوں کے ساتھ چٹانوں پر چھٹتا ہے ۔۔۔ جیسے زند قدم کا انسان چھٹا تھا۔۔۔"

"خطرناک تو ہو گا۔۔۔"

"بہت کم فری کا بیگز نہیں بچتے ہیں ۔۔۔ لیکن یہ لوگ آپ جانتے ہیں کہ یہاں ۔۔۔" نجیب نے انگلی سے اپنے سر کو چھووا "بالکل ڈھیلے ہوتے ہیں ہیں"

"تو پھر تم اس دو لف کے ساتھ کیوں جا رہے ہو؟"

"تارڑ صاحب یہ تو ایک زبردست چاٹس ہے۔۔۔ میرے لیے ۔۔۔ صرف یہ کہ دنکار میں دو لف گینگ کے ساتھ راک کا بیگز کرتا رہا ہوں دوسرے لوگوں کو حد میں جلا کر دینے کے لیے کافی ہے۔۔۔ اور پڑھے ہم کیا کلامب کریں گے؟۔۔۔ مژگوں ٹاورز"

"مز جگو ٹاورز" ان چٹانوں کا مجموعہ ہے جو گنکور ڈیا کے راستے میں پڑتی ہیں اور جنہیں دیکھ کر ایک مرتبہ تو دل نظم جاتا ہے کہ ان کی بلندی اور ٹکل آسمان کی وسعت میں چھید کرتے ہوئے میثاروں کی طرح ہے۔۔۔ وہ دنیا کے ہر راک کا بیگز کا خواب ہیں ۔۔۔

سلمان اور اخلاق منہ نکالے واپس آ رہے تھے "آپ نے دعا نہیں کی تاں بھائی جان" سلمان شکایت بھرے مجھے میں بولا "بندوبست کا کوئی بندوبست نہیں ہوا۔۔۔ ہنڑہ واڑہ تو دور کی بات ہے یہاں تو سوڑا واڑ بھی نہیں ملتا۔۔۔ بھائی جان یہ چڑیاں کیوں شور کر رہی ہیں۔۔۔" اس نے مجھے سے اخروت کے درخت کو گھوڑا اور پھر "ہوئے ہوئے" کہتے ہوئے نور نور سے تالی بھائی چڑیاں پسلے چپ ہوئیں اور پھر اپنے پروں کی

"ہاں جی پھر اخلاق صاحب اس بندوبست کا کیا بندوبست ہوا؟" سلمان نے اسے دیکھتے مجھے میں اس سے پوچھا کہ میرے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ اتنے دیکھتے مجھے لجئے کیوں پوچھتا ہے۔ اخلاق ذرا شرمende ہوا اور اسے ایک طرف لے جا کر پکھے گفت و شنید کی جو میں شنیدہ کر سکا۔۔۔ پھر سلمان ایک شراری پیچے کی طرح مکراتا ہوا اور ہاتھ مٹا ہوا آیا اور کہنے لگا "بھائی جان دعا کیجئے گا۔۔۔" اور پھر دونوں چلے گئے سلمان کاں کھجاتا ہوا اور اخلاق گروں کھجاتا ہوا۔

سلمان کے قیسے کی شدت سے رخصت شدہ چڑیاں اخروت کے درخت پر واپس آئے گلیں ۔۔۔ ٹاؤنٹ بلور کے پڑے پچانک میں سے ایک نوجوان جنگ کر داشل ہوا اور دوسرا بینگر بھلے داشل ہو گیا کہ وہ ذرا پست قد تھا۔ دراز قد نوجوان نے اپنی ستوان ٹاک پر انگلی سے کھجایا اور پھر چاروں طرف دیکھا۔۔۔ اس کی نظریں واپس آئیں جہاں میں برآمدے میں بیٹھا تھا اور وہ میرے جانب آئے گا۔۔۔ یہ نجیب تھا، اسلام آباد کی ایک ویران سڑک پر سر کرتے ہوئے وہ سامنے سے آیا تھا۔۔۔ گلگت کے قریب بونجی کا رہنے والا تھا، ٹکل سے ہالی وڈی کاڑو کاڑو گلٹا تھا، طالب علم تھا اور کوہ پیاویں کے ہمراہ گاڑو کے طور پر جاتا تھا۔۔۔ بے حد ملشار، خوش مراج اور صرف اپنی باتمی کرنے والا۔۔۔ اسلام آباد میں ہی میں نے ان دونوں میں گلگت آئے کا تذکرہ کیا تھا۔۔۔

"میں روزانہ ایک پورٹ فون کر کے آپ کا پتہ کرتا تھا۔" یہ شاد میتا ہے "اس نے نیلی بینن نما پتلوں میں شرث اور ایک بڑی مکراہت میں ملبوس اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کیا۔۔۔"

"کیا میتا ہے؟" میرے پلے کچھ نہ پڑا۔

"شاد میتا" اس پست قد نوجوان نے فس کر کما اور جب فس کر کما تو معلوم ہوا کہ وہ نوجوان تو ہے لیکن اس کے ساتھ خاتون بھی ہے۔۔۔

"میں آپ سے ملتا چاہتی تھی ۔۔۔"

"آپ گلگت ایسے وحشی علاقے میں کیا کر رہی ہیں؟"

"میں ایک کوہ پیاوی میم کے ساتھ رابط افریکے طور پر جا رہی ہوں"

"پھاڑیوں میں" میں نے بے چینی سے کہا۔

"کوہ پیاوی میم عام طور پر پھاڑیوں میں ہی جیلا کرتی ہیں" وہ بدستور ہنسنی ہوئی بولی۔۔۔

ضیاء اللہ بیگ نے فوراً میری جانب دیکھا اور پھر جیپانی سے کہنے لگا۔ ”آہ ماں شیواس“ جیپانی نے جواباً ایک اور ”آہ“ کی اور چپ ہو گیا۔ اور ضیاء اللہ بیگ ایک تجربہ کار ٹور آئرٹر کی طرح رواں ہو گیا ”جیپ نو استور۔ جیپ نو ترٹک۔ ترٹک نوازش پاس ٹریکنگ“

”آہ۔“ جیپانی نے مدیرانہ انداز میں سرطایا۔

”جیپ نو ترٹک اینڈ بیگ گلگت تھری سکس ہندڑو۔“ بیگ صاحب نے رقم کانٹہ پر لکھ کر دکھائی کہ جیپ کے ترٹک جانے اور آئنے کا اتنا خرچ ہو گا۔ ”نو پر ایلم۔“ جیپانی نے اپنے رک سیک کی ایک خفیہ جیب میں سے رقم نکال کر میز پر رکھ دی۔

”آپ کا کام بھی ہو گیا تارڈ صاحب۔“ بیگ صاحب نے جیپانی کی رقم گھنٹے ہوئے کہا ”آسے کچھ پیسے دے کر اسی کے ساتھ رو ان ہو جائیں۔“ لیکن چنانچہ میں نے جیپانی کے ساتھ گفت و شنید کی کہ بھائی ہم آؤ جا کر ایسے دیتے ہیں ہم تینوں کو بھی ساتھ لے چلو۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا بلکہ وہ خوش تھا کہ کچھ رقم اسے فوری طور پر داہیں مل رہی ہے۔ چنانچہ ایک ”آہ“ کے ساتھ معاملہ ملے پایا گیا۔

”پرسوں صحیح جیپ پائیج بیجے آپ کے ہوٹل میں ہو گی۔ اس جیپانی سے پوچھنے کی یہ کوئی ہوٹل میں قیام پذیر ہے؟“ بیگ صاحب نے جیپانی کو رسید لکھ کر دی۔

”میں کیسے پوچھوں؟“ میں نے کان کھجاتے ہوئے عرض کیا ”بہرحال۔ جیپانی ہوٹل؟“

جیپانی نے پھر میری بات غور سے سنی اور سر جھک کر بولا ”نو پر ایلم“ ”سیسریار تم کوش کرو“ میں نے تھیمار ڈال دی۔

میر نے جیپانی کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ متعدد بار پاٹھ ملایا اور پھر کہنے لگا ”ئی۔ مانی قادر ہوٹل ماؤنٹ بلور۔ یو ڈاٹ ہوٹل؟“

جیپانی نے مزید خوش ہو کر کہا ”آہ آہ“ اور پھر بال پوائنٹ پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر کچھ لکھ کر سیسری کو دکھایا۔ ہتھیلی پر ماؤنٹ بلور لکھا ہوا تھا۔

”ارے یہ بھی دیں رہتا ہے“ سیسری خوش ہو گیا ”ہاؤ آر یو جیپانی۔“ اس نے جیپانی کے ساتھ ایک مرتبہ پھر پاٹھ ملایا اور اس کے جواب میں جیپانی نے کرٹک جھک کر

پھر پھرزاہٹ کے ساتھ درخت خالی کر گئی۔

منہ اور گلگت کے علاقوں میں بیگ حضرات بکھرست پائے جاتے ہیں۔ آپ کسی بھی گورے پیٹے اور خوش مکھ صاحب کو بے دھڑک ”بیگ صاحب کیا حال چال ہے؟“ کہ سکتے ہیں۔ اور وہ بیگ صاحب ہو گا اور اگر نہیں ہو گا تو نہ سی اس کے برادر کھڑا ہوا ٹھپن تو ضرور ہو گا۔ میرے سامنے بھی ایک اور بیگ صاحب تھے، ضیاء اللہ بیگ۔ پہلی ملاقات راولپنڈی میں چیخیز سلطان کے دفتر میں ہوئی تھی جہاں انہوں نے اپنے پامیر نورز کا کارڈ تھمایا تھا اور اب دوسری ملاقات ان کے دفتر میں ہو رہی تھی۔

”ناٹا گا پرہت کی روپیں سائٹ کو جانے کے لیے آپ کو استور پہنچا ہو گا اور استور روڈ بہت خراب ہے۔ سکردو روڈ تو بارہ دن ہند رہنے کے بعد آج شاید کھل جائے لیکن استور روڈ۔ بہرحال استور سے آپ کو ترٹک جانا ہو گا۔ وہاں تک جانے کے لیے آپ کو پوری جیپ کرانے پر حاصل کرنی ہو گی۔ عام لوگوں کے لیے ترٹک تک کا کرایہ اخخارہ سو روپے، لیکن آپ کے لیے میں اپنی کمیشن چھوڑ دوں گا۔“ چودہ سو روپے۔ لیکن آپ واپس بھی تو آئیں گے؟“

”تھی نہیں۔“ میں نے سر ہلایا ”ناٹا گا پرہت سے ہم واپس ترٹک آئیں گے اور وہاں سے چلم چوکی اور پھر دیوسائی عبور کر کے ہم سکردو میں اتریں گے۔ اور واپس نہیں آئیں گے“

”اور آپ پرسوں صحیح رو انہ ہو نا چاہیں گے؟“ تھیک ہے میں کل جیپ بک کر دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ موسم صاف ہو، تھوڑی سی بارش استور روڈ کو استور نالے میں گرا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔“

سنی منصوبہ بندی ملے کرنے کے بعد ضیاء صاحب کے والد صاحب نے ہمیں اپنے کلام سے نوازا، وہ بہت ایچھے شاعر تھے۔ اور پھر بامیر نور کے دفتر میں شی ہی زو داخل ہوا۔ یہ ایک دبلا پتا منک سرتی جسم اور کھلے منہ والا جیپانی تھا جو صرف اشاروں سے بات کرتا تھا یا کبھی کبھار ایک جھکنے دار ”آہ“ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جب کسی بھی موقع پر وہ بے بس ہو جاتا تھا یا بہت خوش ہوتا تھا تو کہتا تھا ”نو پر ایلم“۔ وہ آیا، اپنے رک سیک کی جیب میں سے ایک نیشہ نکلا اور میز پر پھیلا کر کہنے لگا ”ماں نتو پاس۔“

پورن روے گیا تھا۔ کتنا تھا خیر ہے..... پڑھیں ہے کہ نہیں۔ آپ دیکھ لو۔
ہم نے اسے بہت دری عک و دیکھا۔ الائیڈ عاکیا۔ الائپلانکیا لیکن وہ خیر نہ
ہا۔۔۔ ہم مایوس ہو کر جی ایم بیک کی دوکان پر آگئے۔
”یہ شوو کیما ہے؟“ رای نے پڑے فخر سے اپنا شوو بیک صاحب کے سامنے
پڑھ کیا۔
”آل۔۔۔ اچا ہے۔۔۔ لیکن بھاری ہے، ایک گدھا آپ کو چاہیے اسے اٹھانے
کے لئے“
بیک صاحب درست کئے تھے ہم نے شوو کے وزن کے بارے میں سمجھی گی سے
غور نہیں کیا تھا ”تو پھر کیا کریں۔۔۔“
بیک صاحب نے ایک انتہائی محترم سا شوو کا پچھہ ہمارے سامنے رکھ دیا ”یہ چینی
ہے۔ بہت کار آمد ہے۔۔۔“
”اس پر کھانا پک سکتا ہے؟“
”کیوں نہیں پک سکتا؟“ بیک صاحب نے بازار سے پرست کی ایک بوقلمونگائی
اور شوو کے پیچے میں بھر دی۔۔۔ پھر اسے دا سلائی دکھالی تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے اچھی
خاسی گری دیتے لگا ”یہ چینی ہے بہت کار آمد ہے“ بیک صاحب اپنی شہری مکراہٹ
کو استعمال میں لائے ”اور یہ تختہ بے میری طرف سے آپ کے گھلت آنے پر۔۔۔“
”آہ۔۔۔“ میں نے صرف اتنا کہا۔

اس شام نارنجھ ان کے منگول طرز کے شاندار ہال میں بہت ساری شمعیں
روشن تھیں۔۔۔ کچھ شمعیں ایسی جو لوڈ شیدنگ کی وجہ سے انظامیہ نے جلائی تھیں اور
بیشتر شمعیں محبت کی جو لوگوں کے دلوں میں روشن تھیں اور ان کی لوسرے نارنجھ ان کا
ہال جملاتا تھا۔۔۔ یہاں بیک صاحب قراقروم رائمنڈ فورم کی جانب سے ہمیں خوش
آمدید کہ رہے تھے۔۔۔ اربعہ۔۔۔ شاعر۔۔۔ دانشور اور صحافی ہم سے اپنے دل کی بات
کرتے تھے کہ ہمیں الگ نہ رکھیں، ہمیں بھی پاکستانی تندیب کے دھارے میں شامل
کر لیں۔۔۔ شیشے کی چھت تک پہنچی کمریوں میں سے وہ شام جھاکنی تھی جو یہاں
میرے دماغ میں فتور پھوکتی تھی۔۔۔ گھلت کے بلند پہاڑوں کے اوپر ابھی شفق کی
سرخی غصیری ہوئی تھی، کمریوں کے شیشے باہر کی ننگی سے غمظہ ہو رہے تھے اور باہر
ایک اداہی تھی جو میری محترم تھی اور میں اس تک جانا چاہتا تھا، اس سے ملاقات کرنا

کر ایک شدید جھکے کے ساتھ ”آہ“ کی اور رک سیک اٹھا کر دفتر سے باہر چلا گیا۔
”تو پرسوں صحیح جیپ آپ کے ہوٹل میں ہو گئی“ بیک صاحب نے مأکید کی۔
”آہ۔۔۔“ میں نے مکراہ کما اور ہم دونوں پاہیر ٹور کے دفتر سے باہر آگئے
جہاں رای ہمارا مختار تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں آئے کا ایک تمیلا تھا لیکن اس میں
آنٹاہ تھا بلکہ بیاز، چاول، والیں اور آکوٹے جو اس نے موقع پہاڑی راستوں کے لئے
خریدے تھے۔ میں نے اس لئے تو چاول اور والوں کی اس پوٹلی کو شدید نظر خارت
سے دیکھا کیونکہ خوراک کے طور پر ہمارے رک سیک میں نہیں بند، قورے۔۔۔ کوئتے۔۔۔
بجنا ہوا گوشت۔۔۔ طیب۔۔۔ ساروہیں پھٹیاں۔۔۔ بجیر۔۔۔ سیلان اپ اور کوکا کولا اور پتہ نہیں کیا
کیا تھا لیکن بعد میں ناٹھی بہت کے دامن میں رای کے بیگانی طرز کے پیچے وال چاول
میں جو مٹا آیا وہ بالکل بہتی تھا۔۔۔ اب ہمیں ایک عدد خیسے کی خلاش تھی، ہر دو بیک
صاحب اس سلسلے میں معدودت کر پچے تھے۔۔۔ ان کا کتنا تھا کہ اس یعنی میں گھلت میں
خیموں کا نقطہ پڑ جاتا ہے۔۔۔ ہمارے لیے یہ امریاعث تشویش تھا۔۔۔ استور سے آگے اگر
آپ کے پاس خیسہ نہیں ہے تو آپ ایک مردہ بن لیں۔۔۔ بلکہ محمد مردہ بن۔۔۔ چانچھے
خیسے کی خلاش شروع ہو گئی۔۔۔ جماعت خانہ بازار میں داؤ کی دوکان پر بڑی و رائی
تھی۔۔۔ پولینڈ کی کوہ پیلا ٹیم کا نواں گور سامان کوہ پیکائی ان کے پاس مناسب اور
غیر مناسب داموں پر موجود تھا۔۔۔ مجھے کوہ پیکائی کے بوٹ جی کو گلے لیکن میں ان کا کیا
کرتا۔۔۔ میں ہو گر شو ز پنے ہوئے تھا۔۔۔ ایک جرم من طرز کا خیر و بستیاب تھا لیکن
صرف دو آدمیوں کے لیے تھا اور صرف سائز سے تین ہزار کا تھا چانچھے یہ دونوں باتیں
ناقابل قبول تھیں۔۔۔ دوکان میں مشورہ کوہ پیلا میز کی تصور آوریاں تھیں جو داد کے
بوقلمون اس کا فریڈ تھا۔۔۔ یہاں رای کو ایک روی شوو پنڈ آگیا جو اس نے فوراً خرید
لیا۔۔۔ دوسرے داؤ جو پارک ہوٹل کے سامنے میں دوکانداری کرتے تھے ان کے پاس بھی
کرائے پر اٹھانے کے لیے کوئی خیر نہ تھا۔۔۔ یہ داد صاحب بڑی حضرت چڑیاں۔۔۔ ایک
اور دوست ”ماڈشین مودوزر“ کے مرت صاحب تھے لیکن وہ بھی خیسہ خلاش تھے۔۔۔
پھر ایک ایسی دوکان تھی جس میں سیکنڈ وینڈ اشیاء کے ابادگے تھے۔۔۔ ان میں ایک خیسے
کے آثار تھے، نیخیں اور ڈنڈے اور کپڑے کے تھان۔۔۔
”لیکن ان سب کو ملا کر ایک خیسہ ہتھیا جا سکتا ہے؟“ میں نے دوکاندار سے پوچھا۔

”علوم نہیں صاحب“ دوکاندار نے نہایت شرافت سے جواب دیا۔۔۔ مجھے ایک

"لے جاؤ"

ہم نے خیسے کی گھنڑیاں سر پر اٹھائیں اور پامیر نور کے سامنے واقع چھوٹے سے باخنسے میں آگئے۔ نجیب آر ائیس رستوران میں چائے پی رہا تھا، ہمیں دیکھ کر فوراً باہر آگیا "کیا ہو رہا ہے سر؟"
"کیا یہ خیسہ ہو سکتا ہے؟" میں نے دونوں گھنڑیوں اور میخوں کی جانب اشارہ کیا۔

"ہو سکتا ہے ہو۔ ہو سکتا ہے نہ ہو۔" اس نے فوراً گھنڑیاں کھول کر کپڑے کو نہیں پر پھینلا دیا۔ پھر راڑھوڑتے لگا۔ فوری طور پر ایک چھوٹا سا چوم بیج ہو گی جو اس خیسہ پرل کو حل کرنے کے لئے مشورے دیتے لگا۔ پکھو کا خیال تھا کہ یہ خیسہ ہے اور پیشتر کا خیال تھا کہ بھی یہ خیسہ تھا اور اس کے پکھو ہے ہیں اور پکھو عابد ہیں۔ نجیب کی کوششیں رنگ لائیں اور خیسہ تیار ہو گیا۔ لیکن یہ سنگ تھا اس پر جو ڈھل چادر بارش سے بچاؤ کے لئے ہوتی ہے وہ عابد تھی۔ اس کی جگہ دو کانڈار نے ہمیں کوئی کبل نماچیز دے دی تھی۔ بہر حال فقیروں کو چنانہ کا اختیار نہیں ہوتا۔
ہم نے مجدوراً یہ سنگ خیسہ خرید لیا۔ لیکن یہ بے حد غایباً تھا۔ ہوٹل واپس آ کر ہم نے اسے ایک شب میں بھجو دیا۔ رایہ اور سیر اسے ماہر دھوپیوں کی طرح دھونے لگے۔ جب خیسہ دھل چکا تو نجیب نے اسے اخليا اور کنے لگا۔ اب اسے سرخنے کے لئے سامنے والی پتھریلی دیوار پر ڈال دیا جائے تو بترا رہے گا۔ لیکن دیوار پر کون چھے گا یہ بید اوپنی ہے۔
"ہوں" اس نے سرہا۔

"کیسے راک کلامبر ہو؟ ایک چھوٹی سی دیوار کو بھی کلامب نہیں کر سکتے۔"
نجیب شرمدہ ہو کر کنے لگا۔ "مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کمال ہے یہ دیوار کیا چھر ہے؟" اس نے ایک چھلانگ لگاتی اور دیوار سے چھٹ گیا اور پھر اپک کر اس کے اور پر جا بیٹھا "لاڑ خیسہ لاڑ۔"

زور رنگ کا خیسہ ماؤنٹ بلور کی دیوار پر پڑا سوکھتا تھا اور اخروت کے درخت میں اب چڑیاں بولتی تھیں۔ یہ زور رنگ امید کا رنگ تھا۔ اس امید میں ہم نے جنگلوں اور دیر انوں میں راتیں گزارنی تھیں۔ میں جب اس خیسے کو دیکھتا تھا تو میرے اندر کے خانہ بدوش کا خون گرم ہوتا تھا۔ دہل جہاں میں قید تھا دہل میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے اتنا زور لگایا تھا کہ میری گردن زخمی ہو گئی تھی۔ اس پر

چاہتا تھا اور یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تم یہی شیرے اندر خیس زن رہیں تو اب اپنی کیوں ہوتی ہو۔۔۔ اور میں ہے بس ہو کر تمہاری طرف کھنچتا چلا آتا ہوں تو کیوں مجھے ہے بس کرتی ہو۔۔۔ اور اس اداہی کو میں نے بت جھنوں پر اپنا منتظر ہیا۔۔۔ یہ میری تاک میں نہیں تھی بلکہ میری منتظر تھی۔۔۔ اور پھر میں نے اس منتظر اس مقام کی تھوڑی سی اداہی کو اپنے ساتھ بھی لیا اور اسے اپنے گھر تک لے آیا، اپنے ساتھ بسایا۔۔۔
لکڑی سے بنتے ہوئے اس ہال میں لوگ اپنی محبت کا احتمار کر رہے تھے۔ اور باہر وہ میری منتظر تھی۔۔۔ لیکن جو نبی تاریکی گمراہی ہوئی وہ چلی گئی۔۔۔
مغلت بازار کی دریافتی میں ہم ہوٹل ماؤنٹ بلور کی جانب پڑتے تھے۔

برآمدے کے سامنے اخروت کے درخت میں خاموشی تھی۔ رایہ نے اپنا روپ شود کھول رکھا تھا اور اب اسے دوبارہ ہوڑتے کی ہاکام کوشش میں معروف تھا۔

سلمان ڈاہری لکھ رہا تھا اور اپنی شدُّ کو نہایت اہتمام سے سلا رہا تھا۔ مبوحی طور پر سکتی اور کاملی کا موسم تھا۔ یہں بھی ہم سب "کاشفران" سے کاملی پڑا اور کوفتے تاول کر کے آئے تھے۔

اس موسم میں مغلت ریڈیو کے شیشن ڈاہر کشہ اکرم خان آگئے۔ ان کے ہمراہ جنگ کا نوجوان آئیڈلٹ نفر تھا جو تازہ تازہ ریڈیو پر دوڑیوں سر بھرتی ہوا تھا۔ نفر سے میری سلام دعا پرانتی تھی۔۔۔ اکرم صاحب بڑی پر بدار فحصت تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنی دیگر میں ڈالا اور دشور لے گئے کوئی نکلت کا ریڈیو شیشن وہاں سے خاصلے پر واقع دشور کے قبیلے میں ہے۔۔۔ یہاں اتنے بڑے لئے گئے اور چائے پالائی گئی۔۔۔ واپسی پر ہم بازار میں اتر گئے کیونکہ ہمارے پاس سب پکھو تھا لیکن ابھی تک خیسہ نہیں تھا اور خیسے کے بغیر ہم ترجمک جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔۔۔

ایک مرتبہ پھر ہم اس دوکان کے سامنے گزرے تھے جہاں سینٹ پینڈ اشیاء کے ابزار میں ایک خیسے کے آثار پڑے تھے۔

"کیا یہ واقعی خیسے کی صورت میں مستادہ ہو جائے گا؟" میں نے دو کانڈار سے پوچھا اور دو کانڈار نے انتہائی ناگواری سے کہا "کیا پہ?"
"ہم اسے لگا کر دیکھ لیں۔ اگر لگ گیا تو خرید لیں گے۔"

رسے کے بغیر چنے ہوں تو وہ جو احساس ہے بس اس کے لئے ہم یہ خطرات مول لیتے ہیں"

"ویسے ہم پاکستانیوں کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ یورپی لوگوں کو چونکہ پچھے سے روئے والا کوئی نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے ہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔" دلف گاگہ بے حد محظوظ ہوا "یہ خیال غلط ہے۔ ہماری مائیں اور بیش بھی ہمارے لئے گلرمند رہتی ہیں۔ میں بتتے روز یہاں رہوں گا میرے خاندان کے لوگ روزانہ گلگت فون کر کے میرا پڑ کریں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ پچھلے برس بھی میں ٹرینگو ٹاورز کو سر کرنے کے لئے آیا تھا لیکن صرف دس روز کے بعد میرے ساتھی اپنی یورپیوں اور خاتون دوستوں کے لئے اوس ہو گئے۔ کسی کو اپنی ماں یاد آئے گی کہ وہ اس طرح کا کہانا پکاٹی تھی اور کسی کو اپنے پچھے یاد آئے گے اور نتیجہ یہ لکھا کہ ہم ہم ختم کر کے واپس ٹپے گئے کیونکہ ہم اوس ہو گئے تھے۔ نہیں، ہمارے پیچے بھی روئے والے ہوتے ہیں۔"

گلگت کا بازار سننا ہو چکا تھا اور بادلوں کی وجہ سے تاریکی کچھ زیادہ تھی جب ہم اپنے ہوٹل واپس جا رہے تھے۔ اگلے روز کے سز کا خوف ہمارے اندر پڑنے رہا تھا۔ ہم ماؤنٹ بلور کا چھانک کھول کر اندر داخل ہوئے تو ہمارے کمرے کے سامنے جیپ نمبری ایل انی ۹۹۰۰ کھڑی تھی۔ اگلی منجھ میں ترکھ لے جانے کے لئے اندھیرے میں بھی پتھر لی دیوار پر پھیلا ہوا زرد خیس نظر آ رہا تھا۔ البتہ اخروں کے درخت میں خاموشی تھی۔

اس ری کے نشان خون آؤد ہے۔ بس کے ساتھ میں باندھا گیا تھا۔ اور اب میرے سامنے زرد رنگ کا خیس ماؤنٹ بلور کی دیوار پر پڑا سکتا تھا۔ اخروں کے درخت میں چڑیاں بولتی تھیں اور ان کی اذی خاموشیوں میں بسرا کرنے کے خیال نے مجھے آزاد کر دیا تھا اور غلائی کے تمام زخم مددل کر دیئے تھے۔ میں نے ایک گمراہانہ اپنے اندر کھینچا اور اس کے ساتھ خیس کی زردی اور چڑیوں کا شو اور گلگت کی چنانوں کی خلک اور وحشی ہوا۔ سب میرے اندر گئے اور ہیاں بسرا کیا۔

اس شام فخر نے پارک ہوٹل میں ہمیں کھانے کے لئے مدعا کیا تھا۔ ہیاں بھی صرف پاکیوں اور بلند چنٹوں کی یاتیں تھیں۔ ایک جانب ہر سے پہنچ کار ریلی کے شرکاء کندھے سیکلتے، پانڈو لبراتے اور ہونٹ بجھتے آس پاس کے ماحول سے بے خرابیک چھوٹا سا فرانس ہائے بیٹھتے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ فرانس میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ یہیں پر راک کا انبر و لف گاگہ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے نادانی کی جو اس سے ہاتھ ملایا، وہ کسی انسان کی نہیں لوہے کے روپوں کی آہنی گرفت تھی۔ وہ بیان پنے ہوئے تھا اور اس کا پدن و کھائی دیتا تھا کہ صرف لوہا ہے۔ ظاہر ہے ہاتھوں کے چیزوں اور پاؤں سے چنانوں میں جگہ بنا کر اپر جانے کے لئے اس قسم کا وجود درکار تھا۔

"آخر فری راک کا نہنگ ہی کیوں؟"

"یہ بیش پسلہ سوال ہوتا ہے جو مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔" وہ مگرایا تو اس کے پدن کی بھتی کچھ نرم پڑی۔ "یورپ میں ہر شے خود کار ہو رہی ہے۔ انسان پیچے رہ گیا ہے، وہ مشینوں اور سازوں سامان کا محتاج ہو گیا ہے۔ کچھ اسی طرح کوہ پیائی اور چنان جیائی بھی کینیکل ہو گئی ہے۔ یہاں اس قسم کا انتقال پیچیدہ اور جدید سازوں سامان استعمال کیا جا رہا ہے کہ یہ پاکیوں اور چنانوں کے ساتھ زیادتی ہے۔"

"چنانوں کے ساتھ زیادتی ہے؟"

"ہا۔۔۔ جیسے آپ کسی جنگلی جانور کو کلاہکھوف سے بھون ڈالیں تو یہ زیادتی نہیں ہے؟ چنانوں اور پاکیوں کی طاقت اور ان کی خطرناکی کو بھی موقع ملنا چاہیے کہ وہ انسان پر حاوی ہو سکیں۔۔۔ بس اسی لئے ہم چنانوں پر صرف اپنے پچھے جما کر چھتے ہیں۔۔۔ اور یوں لاکھوں برس قل فطرت اور انسان میں جو رشت تھا اسے دوبارہ جوڑتے ہیں۔۔۔ یوں بھی اگر آپ پائیں چھ ہزار میٹر بلند ایک عمودی چنان کے ساتھ

میں واپس آیا تو میر سینگ بیک پیٹ کر اپنی رک سیک میں ٹھوٹن رہا تھا۔

"شہاش" میں نے اسے چکی دی۔

علاوہ الدین نے ہمارے رک سیک اور بیک جیپ کے پچھلے حصے میں ایک منبوط رست کے ساتھ باندھے اور پھر ان پر واٹر پروف بچا دا۔۔۔ تاریکی کم ہو رہی تھی اور اخروت کا درخت آہستہ آہستہ پر شور ہو رہا تھا۔

"میرے خیال سے بسم اللہ کریں" میں نے علاوہ الدین سے کہا۔

"صاحب خطرہ ہو گا۔۔۔ ابھی باول ہیں" اس نے ہشیل پھرلا کر کسی ایک بونڈ کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔

"خطرہ ہو گا تو واپس آجائیں گے"

جانپانی اور رای اکلی نشتوں پر بیٹھ گئے اور ہم دونوں پھلی سینوں پر برائعتان ہو گئے۔۔۔ گلکت کا بازار خالی تھا۔۔۔ ابھی نہم تاریکی تھی اور سڑک بھیجی ہوئی تھی۔۔۔ ایک بورٹ کے قریب سے گزد کر رہم نے اپل عبور کیا اور دنور کے قبے سے گزر کر جنگلوٹ کی جانب رواں ہو گئے۔۔۔ جیپ کی رفتار کم تھی کیونکہ سڑک پر پھسلن تھی۔۔۔ جنگلوٹ میں جمل پانی چیک ہوا اور پھر ہم شاہراہ رشم سے پیچے اتر کر دریائے گلکت پر واقع ایک محلق پل کو عبور کر کے دہ سری جانب پلے گئے اور دوسری جانب جاتے ہی معلوم ہو گیا کہ شاہراہ رشم اور عام سڑکوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔۔۔ کیونکہ یہاں سے جیپ کے پھر پھرائے اچھتے، پچک کا جو سلسلہ شروع ہوا تو صرف اس روز ختم ہوا جب ہم دس دن کے سفر کے بعد اسی پل کو پار کر کے شاہراہ رشم پر واپس آئے۔۔۔ اور جیپ کی ہر حرکت کے ساتھ آپ بھی بے اختیار ہو کر وہی حرکت کرتے ہیں اور آپ کی پسلیوں کا جل ترکیج بجا چلا جاتا ہے۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد یونہی کا علاقہ شروع ہو گیا۔۔۔ زیادہ تر عمارتیں فوٹی نویت کی تھیں۔۔۔ ایک بست بیسے سیستھ شدہ میدان میں فوج کا ایک دست پریڈ کرتا ہوا پاکستانی پرچم کو سلامی دے رہا تھا۔۔۔ ان کے پس مظفر میں قراقرم کی نہم تاریک بندیاں اور بادل تھے۔۔۔ یونہی میں ہم ایک قدم مسجد کے سامنے ایک چائے خانے کے باہر تھوڑی دیر کے لیے رکے۔۔۔

یونہی سے باہر یاغوں کا ایک سلسلہ تھا۔

آبادی ختم ہوئی تو ہر شے پہنچے ہتھی پلی گئی۔۔۔ اور ہم ایک بست بیسے سیستھ لینڈ نوٹی، جو ہماری جیپ تھی، کسی بے انت ویرانے میں رنگ رہی تھی۔۔۔ اس جیت

"روڈ ٹو استور اور چکور، ہی چکور"

رات نیند کچھ کم آئی البتہ وہ نہ ملک آئی رہی جو یہ بتاتی تھی کہ باہر پتوں اور گھاس پر بیکی بارش ہے جو اپنی صاف کرتی ہے اور بے کواز گرتی چلی جاتی ہے۔۔۔ پھر ملی ہوئی فنا میں تحریک موزن کی آواز آئی۔۔۔ میں نے اپنے گرد کبل لپٹا اور اندر ہرے میں آنکھیں جھپٹتا ہر آمدے میں ٹائیڈ یہاں بارش کی کن من آواز آئی تھی پر ذرا کم کم۔۔۔ بوندا باندھی تھی۔۔۔ اخروت کے درخت تکے ہماری جیپ بھیجی رہی تھی۔۔۔ میں واپس کر کے میں آیا۔۔۔ اگر موسم کے بیسی آثار رہے تو استور روڈ پر سفر مشکل تھا۔۔۔ بہر طور میں نے شیوکی اور شدید سروپانتوں سے غسل کیا۔۔۔

میر نیند میں بیبریا رہا تھا۔۔۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا "بینے انھو" وہ فوراً آنکھیں ملتا ہوا انھو جیشنا۔۔۔ ایک سکراہت اس کے لبوں پر آئی اور پھر آنکھیں بند کر کے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔۔۔ وہ ابھی تک گھری نیند میں تھا۔۔۔ میں دوبارہ باہر آیا تو جیپ ڈرائیور ہارڈوں کی ہوا چیک کر رہا تھا اور بارش کھم پھلی تھی۔۔۔

"سلام جتاب۔۔۔ میرا نام علاوہ الدین ہے۔۔۔ آپ کو استور لے جانا ہے"

"ہم پدرہ منت میں تیار ہو جائیں گے"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں یادوں کی تاریکی تھی "استور روڈ بست خراب ہے جانب۔۔۔ اگر وہاں بھی اتنی بارش ہوئی ہے تو آج نہ جائیں۔۔۔ آپ ابھی آرام کریں۔۔۔ سورج نکلے گا تو جائیں گے"

میں بالغ میں سے ہوتا ہوا جانپانی کے خیمے کے قریب چلا گیا "شی ہی زو"

فوری طور پر ایک جنکے دار جواب "آہ" کی صورت میں آیا۔۔۔ وہ بیدار ہو چکا تھا۔۔۔

"تیار ہو جاؤ۔۔۔ ہم استور جائیں گے۔۔۔"

"نور پر ابلم"

غمدیکے سکا ہوں۔" رای بست مٹاڑ نظر آ رہا تھا..... وہ ایک بڑے پھر کر پڑا تو رکھ کر کھڑا ہو گیا..... بالکل ساکت اور اکڑا ہوا جیسے قدم زنانوں کا کوئی جانپنی سورائے ہو.....

اس ہوش گم کر دینے والی بے حساب لینڈ سکپ نے تم پر ایسی دھاکہ: مخادی کہ ہم اس سے پرے دھندی اور بر ف پوش چوٹیوں کے ایک مجموعے کو نہ پہچان سکے..... اور پھر مجھے خیال آیا کہ ہمیں تو ان کے پاس جانا ہے ان کے دامن میں..... یہ نانگا پربت تھی..... ابھی بست دور اور غیر واضح جیسے زین کا نیس آسمانوں کا حصہ ہے..... اور چاہے یہ آسمان پر تھی ہم نے اس تک پہنچنا تھا.....

سفر دوبارہ شروع ہوا تو لینڈ سکپ کی میدانی کیفیت پلنے لگی اور دھیرے دھیرے یہ چٹانوں میں بدلتی اور ہم ایک ایسے کنارے پر چلنے لگے جس کے نیچے ایک وسیع دریائی گذرگاہ کی رستہ اور نیلے تھے اور قراقرم کے ساتھ دریائے سندھ سکردو کی جانب سے بہتا آ رہا تھا اور ادھر جدھر ہم تھے دہاں سے چٹانوں کے اندر سے استور نالہ اپنے نور میں جھاگ اڑاتا شور کرتا آتا تھا، گزرگاہ میں داخل ہو کر پرسکون ہوتا تھا اور سندھ کے ساتھ اس کا گمرا اور خاموش ملاپ ہوتے لگتا تھا..... اس نالے کے اوپر ایک معلق پل تھا جس پر ہماری جیپ کھڑکھڑا تی ہوئی گزرنے لگی..... پل کے پار زیادہ جگہ نہ تھی، صرف "استور" کا بورڈ آؤریاں تھا اور اس بورڈ کے ساتھ ایک عمودی بلندی تھی اور بلندی کے ساتھ ایک نیم پختہ راست پختا ہوا تھا اور یہ راست اندر چٹانوں کے اندر جا رہا تھا..... ایک عظیم وسعت میں سفر کرنے کے بعد ہم گواہ ایک ٹک گلی میں داخل ہو گئے۔ نیچے استور نالہ دوسری طرف ایک اور بلندی۔ آسمان کم اور خلک چٹانیں زیادہ..... اور خون خلک اس سے بھی زیادہ..... ہم باہر کی دنیا سے اندر کی دنیا میں سفر کرنے لگے..... سوئے استور!

آسمان جہاں کہیں اور جب کبھی دکھائی دیتا تھا اس پر باول کم نظر آ رہے تھے اور بارش کا خطرہ نہیں چکا تھا۔ لیکن یہ کیا سفر تھا۔ ایک نامعلوم کے اندر تک جانے کا سفر..... ایک چھوٹی سی کچی سروک جو نیم پتھریلے چٹانی سلسلے میں سے کھو دی گئی ہے۔ نیچے استور نالہ نے اللہ جانتے نالہ کیوں کہا جانتے کے کہ یہ باقاعدہ ایک دریا ہے اور دریا کے ساتھ ایک اور سلسلہ کوہ جس کے پار آپ بھی نہیں دیکھ سکتے اور یہ نالہ بھی زیادہ شریف نہیں، اس کی تندی دیکھنے کے لائق ہے۔ اور چٹانوں میں بکھنا ہوا اس کا پانی جھاگ کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا۔ اسے شیطانی نالہ بھی کہا جاتا ہے..... چٹانچہ استور تک آپ ایک چٹانی سیندھوچ میں بند ہیں۔ آپ کی جیپ، ایک کچی سروک اور

ہاک لینڈ سکپ کے آخر میں قراقرم بلند تھے اور اتنے زیادہ بلند تھے کہ آپ کو وہ ایک مرتبہ دیکھنے سے نظر نہیں آتے تھے بلکہ آپ پسلے سامنے دیکھتے تھے اور پھر سر اخاڑ کر اوپر دیکھتے تھے۔ انہیں بلندیوں میں کہیں شاہراہ ریشم کا فرشتہ تھا۔ اور ان کے نیچے سندھ تھا جو یہاں سے نظر نہیں آتا تھا البتہ وہ کھائی نظر آتی تھی جس کے اندر وہ رواں تھا۔ میں اس وسعت میں سانس لیتا چاہتا تھا اور ڈرائیور نے میرے کئے پر جیپ روک دی۔ میں باہر آیا تو منزدہ مختصر اور بے دیشیت ہو گیا۔ پاکستانی شمال میں اتنی شاندار اور وسیع لینڈ سکپ میں نے پسلے نہیں دیکھی تھی۔ آسمان پارلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن ان میں بہترے کی خواہش کم دکھائی دیتی تھی اور ظاہر ہے یہاں ہوا بلاروک نوک چلتی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ افغانستان میں ایک ایسے ہی لینڈ سکپ میں کچھ وقت گزارا تھا جب سفر میں بس کا ہاڑ پچھر ہو گیا تھا۔ پتہ قد جھاڑیوں کے پھیلاو میں کچی سروک کا ایک حصہ نیزگی مانگ کی طرح مل کھا رہا تھا۔ ایک جانب پوچھتی تھا جو درہ سے ہم آئے تھے اور دوسری جانب تک چٹانوں کی وہ عظیم دھڑک ک دیوار تھی جس کے اندر کوئی راستہ تھا جس پر ہمیں جانا تھا۔ اور وہ راستہ ان تاریک چٹانوں کے اندر ہی اندر استور اور تریکھ تک جاتا تھا۔ یہ باہر کی دنیا تھی جس میں ہم کھڑے تھے اور وہ ایک پوشیدہ اور الگ تحلک دنیا تھی جہاں ہمیں جانا تھا۔ یہاں سے بولڈر رنج کی وہ بلندی بھی نظر آتی تھی ہے عبور کر کے فیری مینڈو کے لئے سفر کیا جاتا ہے۔ جب میں اور خان دہاں تھے تو ہم نے شاید اس وسیع لینڈ سکپ کو بھی دیکھا ہو گا لیکن اس وقت دو برس پہنچرہم تھکاوت اور پستے سے اتنے بے حال تھے کہ ہمیں صرف چدقہم آگے تک دکھائی دیتا تھا ہم نے اسے کہا دیکھا ہو گا۔

"ویری گرینڈ۔" سیر نے جیپی سے کہا جو تصوریں اتارنے میں مشغول تھا۔

"آہ" اس نے جواب دیا۔

"جیو لا تک اٹ؟" رای نے پوچھا۔

"نون پر ابلم"

رای آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میں نے بلکہ دیش کی بجائے پاکستان میں رہنا کیوں پسند کیا۔ اس لئے کہ میں پہاڑوں سے دور نہیں رہ سکا۔ یہ سیری کمزوری ہیں۔ میں کاغان بھی گیا ہوں لیکن تارڑ صاحب یہ تو پہاڑ نہیں کچھ اور ہیں۔" اس نے آس پاس ایک دیوانے کی طرح دیکھا "بیبا" یہ تو پہاڑ نہیں کیا ہیں۔ اتنے اوپرے اور رعب والے۔ اس لینڈ سکپ کو ساری

جاتے ہیں یا اذان کر کے استور نالے کے اوپر چلے جاتے ہیں۔ اور یہیں پر ہم نے
سیاہ تیتوں کے ہوٹے بھی دیکھئے۔

چنانچہ کما جا سکتا ہے کہ روڈ نو استور از فل آف چکورز... نو پر ایلم
استور تک سڑتے ہوئے کا احساس اس لئے بھی نہیں ہوتا کہ راستے میں کوئی
آبادی نہیں۔ کوئی کھیت نہیں۔ کوئی کچھ نہیں۔ سوائے استور نالے، کچھ سڑک
اور چکوروں کے۔

دوپر ہو چکی تھی۔ اور ایک موڑ کے بعد ہم نے ایک ٹریک جیم دیکھا۔ تین
چار بیچیں اور درجن بھر ٹریکٹر ڈالیاں بھی سڑک پر کھڑی تھیں اور ان کے آگے
سڑک عالی تھی۔ فوج کے نوجوان ٹیپھوں سے مٹی ہٹا رہے تھے اور اوپر ایک مل
ڈوزر سر کھرا رہا تھا۔

علاؤ الدین نے جیپ روکنے کے بعد پھلا سوال یہ پوچھا کہ کھانے پینے کا کوئی
ہندوست ہے کہ نہیں، ہو سکتا ہے اوہ رات برس کرنی پڑے جائے۔ اس نے پہلے ہاروں
کے پیچے بڑے بڑے پتھر کو کراٹیاں کیا کہ جیپ لڑکتے نہ پائے اور پھر تازہ ترین
صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے آگے پلا گیا۔

سڑک کا تقریباً ایک فرائیک کا حصہ نیچے گردکا تھا۔ اس کے نیچے ایک پرانی
سڑک تھی جو بالکل ڈھنے پکھی اور اب اسے چھوڑ کر ایک تی سڑک پہاڑ میں سے
ترانشے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ دوسرا جاتب بھی ٹریکٹر ڈالیوں اور بیپھوں کے
مسافر سڑک کے کنارے پینٹ کر استور نالے کو نکلے جا رہے تھے۔ ان کے لئے یہ
معمول تھا کہ استور روڈ گرفتی ہے اور رات اوہ ہو گئی۔ لیکن شب بسری کے لئے
بھی یہ مقام کچھ زیادہ پر فضا نظر نہیں آتا تھا۔ اور یہاں سے استور نالہ بھی سیدھا
نیچے تھا۔

میں بھی بقیہ مسافروں کی طرح سڑک کے کنارے پر پینٹ کر استور نالے کے
پاندیں کو دیکھنے لگا۔ سیر اور جپانی کا آپس میں ایک تعلیمی مقابلہ ہو گیا جس کے تحت
سیر اسے انگریزی سخا رہا تھا اور وہ اسے جپانی سے آگاہ کر رہا تھا۔ رای اپنی سمجھ
بک نکال کر استور روڈ کو کاغذ پر خلخل کرنے لگا۔

یہ عارضی پڑا۔ آہست آہست زیادہ آباد ہونے لگا۔ اکثر ٹریکٹر ڈرائیور ٹک سکا
کر چائے تیار کرنے لگے۔ چند فتنی بیچیں دھول اڑاتی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ ان
میں سے ایک جیپ میرے قریب آن رکی اور اس میں سے تین نوجوان پکستان بر آمد

ایک نالہ۔ اور آپ بھی یہ محوس کرتے ہیں کہ آپ کیسی نہیں جا رہے، ایک ہی
مقام پر آپ کی جیپ کا انجن چل رہا ہے کیونکہ آس پاس، دامیں باسیں وہی ہے جو
ایک گھنٹہ پتھر تھا۔ ہاں بھی کبھار دوسری جانب کوئی پاندہ آثار نالے میں کرتی دکھائی
دیتی ہے تو زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور یا پھر چندرا کے پکور ہیں۔

جیپ ایک آتا دینے والی دکھن میں دیکھی کھاتی آپ کو دیکھے دیتی مرتی چلی جاتی
ہے، چڑھائی چھٹی ہے۔ اس کے ہاروں کے لئے جو سکر اور پتھر آتے ہیں وہ آپ کے
سامنے استور نالے میں گرتے جاتے ہیں۔ اور لگتا ہے استور نالے میں ہر وہ شے
گرے گی جو سڑک پر نہیں رہے گی لیکن آپ خوفزدہ نہیں کیونکہ آپ بے بس ہیں۔
آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کو نالا گپت جاتے کے لئے مجھوں نہیں کیا گیا تھا۔ اگر
نہیں کیا گیا تھا اور آپ اپنی من مرضی سے آئے ہیں تو پھر بھی نہیں۔ اور پھر آپ دیکھتے
ہیں کہ بھی سڑک پر کوتروں کا ایک غول آرام کر رہا ہے کیونکہ آس پاس سڑک کے
علاءوہ کوئی ایسی ہموار جگہ نہیں جمال وہ بیٹھ کر غُر غُر کر رکھیں۔ جیپ قریب ہوتی
ہے تو وہ بمشکل اس کے ہاروں تلے کچلے جانے سے بچتے ہیں کہ اپنی بیچیں دیکھنے کی
عادت نہیں۔ وہ پھر پھرا کر اڑتے ہیں اور پھر جیپ کے آگے آگے سڑک کے اور
اڑنے لگتے ہیں، اور اڑتے چلے جاتے ہیں، جیسے وہ راست دکھا رہے ہوں۔ اور پھر
کوتروں کا ایک ایسا غول نظر آتا ہے جو جیپ قریب آنے پر ڈرتا نہیں بلکہ آگے
آگے دوڑنے لگتا ہے۔ اور تھوڑی دری میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ پکور ہیں۔

"چچع کے پکور ہیں؟" رایح جان ہو کر پوچھتا ہے۔

"پکریں گے صاحب۔" علاؤ الدین جیپ روک لیتا ہے۔

کم از کم ایک درجن چکور چنان کے سامنے میں بیٹھے ہیں بلکہ کھڑے ہیں کیونکہ
پکور بیٹھ کیے سکتا ہے، وہ جیپ کو رکنا دیکھ کر اڑتے نہیں۔

"ایا یہ پکڑے جاسکتے ہیں؟" سیر پوچھتا ہے۔

"ہاں صاحب۔" اگر آپ کہتے ہیں تو میں کوشش کرتا ہوں۔" علاؤ الدین گھر
سے فرار ہونے والی مرغی کو پکڑنے کے انداز میں جنک کر ان کی جانب چڑھتا
ہے۔ "نہیں صاحب" وہ پتلتا ہے "یہ بہت چھوٹے ہیں۔ نیچے ہیں۔"

اب ہم اپنی مردہ دلی سے باہر آگئے ہیں کیونکہ ہر موڑ پر کوڑ اور پکور دکھائی
دیتے ہیں۔ کوڑ راست دکھانے کے انداز میں جیپ کے آگے رواز کرتے ہیں اور دور
تک ہمارا ساتھ دیتے ہیں اور پکور اپنے آپ کو بچانے کے لئے چنان کے ساتھ لگ

گریگوٹ بند اور خلک پہاڑوں میں گمراہوا ایک غنیر ساقبہ خانے میں استور نالے کاپٹ بہت وسیع تھا۔ چند فونگی پھر کیں تھیں۔ تین چار دو کامیں اور ایک چائے خانہ تھا جس کی کالک بھری دیواروں کے ساتھ نیک لگا کر ہم دھواں بھری چائے نوش کرتے تھے اور مزے کرتے تھے۔ گریگوٹ میرے لئے بے حد اہم تھا۔ میں سے اپر کو راستہ جاتا تھا، چلم چوکی کو۔ اور اس سے اور دیوسالی کے میدان تھے۔ ہماری منصوبہ بندی یہی تھی کہ ہنگامہ پر گریگوٹ آیا جائے اور میں سے چلم چوکی اور دیوسالی اور دہاں سے سکر دو۔ چائے خانے کا مالک عبداللہ ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ میں اس نے بھی کا ایک بیچ ہمارے دل میں بو رہا۔ کہنے لگا "اپر جو بڑا پانی ہے اسے عبور کرنے کے لئے ہر برس لکڑی کا پل بنایا جاتا ہے اور سرویوں کے شروع میں اس میں کو توڑ کر آگ تانی جاتی ہے۔ بڑے پانی کو کہی لوگ پیدل بھی عبور کرتے ہیں اور کہی لوگ اس کو شش میں پانی میں گر کر بنتے چلتے جاتے ہیں۔ اور چلتے جاتے ہیں۔ اس برس ابھی تک وہ پل نہیں بن۔"

"تو ہم اسے پار نہیں کر سکتے؟"

"نہیں۔ ناگون کا رسہ ہو تو ایک دوسرے کو باندھ کر دوسرا طرف جایا جاسکتا ہے"

ای بڑے پانی یا کالے پانی کے بارے میں مجھے لی آئی اے کے کہنی زیر نے بتایا تھا کہ اگر کبھی آپ کو اسے عبور کرنا پڑے تو بوت پہنے رکھئے گا، اگر نیکے پاؤں چلتے تو اس کے ٹکریزے بلندیوں کی طرح تیز دھار کے ہیں۔ پاؤں کشا چلا جاتا ہے اور آپ کو خبر نہیں ہوتی کیونکہ آپ بخستہ پانوں میں ہوتے ہیں۔ اور پھر جب پڑھتا ہے تو آپ وقیٰ طور پر لپاٹ ہو جکے ہوتے ہیں۔ گریگوٹ کے دھواں بھرے چائے خانے میں عبداللہ نے ہمیں دیوسالی کے کئی قصے سنائے۔ جن میں ایک یہ بھی تھا کہ صرف تین برس پہنچتیں مقامی گذریے راستہ بھول گئے اور برف کے ساتھ برف ہو گئے۔ اور یہ کہ دیوسالی پر ایک ساف آسمان چد لمحوں میں ابر آلوہ ہو کر پاؤں بھر دیں گے اور اے آپ پر گرا سکتا ہے۔ ہمیں شام سے پہلے تریکھ پنچھا تھا اور پچھی بات ہے میں اپنے آپ کو کوں رہا تھا کہ اس حتم کے علاقے کو دیکھنے کے لئے میں نے اتنا تردد کیا؟ تریکھ آخر گریگوٹ سے ذرا بہتر کوئی کاؤں ہو گا تو پھر کیا ہو گا۔

گریگوٹ کے راستے میں بھی سڑک متعدد مقامات پر گری ہوئی تھی اور دہاں

ہوئے، انہوں نے دریا میں گری ہوئی سڑک کو دیکھا اور زیر لب کچھ ہالفتہ بے الفاظ کے۔ مل ڈوزر اپنا آہنی جیڑا کھولے مسلسل پہاڑ کو میدان بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فتنی جوان کدالوں پر بجکے پیسے میں نیچرتے تھے۔ ایک کپتان میرے قریب سے گزر۔ پہلے گزر گیا اور پھر واپس آ کر کہا "آپ ہیں؟" کہ کے پیدا پر مسٹر ہوا، زور دار بجکے کے ساتھ بار بار ہاتھ ملایا اور کہنے لگا "گویا آپ بچ چکے سرگر کے سرناٹے تحریر کرتے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت؟"

"اگر آپ ہمیں آج ہی دوسرا جاہب پنچھاٹے کا بندوبست کر سکتے ہیں تو کہ دیجھے کہ یہ سڑک فونگ کے زیر انتظام ہے۔ میں کر سکتے تو نہ سی۔"

نو جوان کپتان نے اپنے آپ کو سمجھیدہ خاہر کرنے کے لئے تجویزاں بھی چڑھائیں اور کہنے لگا "آئی دل ریائی مالی بیسٹ سر۔" بقیہ دونوں کپتان بھی اس کے ہمراہ آگے چلتے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے اور کہنے لگے "آپ صرف ڈیزہ کئے تو انتشار کر سکتے ہیں نہ؟۔۔۔ ابھی اس پہاڑ کو ڈانکا مائیٹ سے اڑایا جائیگا۔"

لوگ بیچھے بخے گئے۔ آگے ہمگی ہوئی جیجنیں واپس ہوئے گلیں اور فونی جوانوں نے سب کو خبڑا کیا۔ اور پھر ایسا شاندار دھماکہ ہوا کہ آؤسے پہاڑ کے ساتھ درخت اور جھاڑیاں بھی فضا میں بلند ہو گئیں۔۔۔ گرد کا ایک بادل عارضی طور پر ہوا میں محل ہوا۔ مل ڈوزر پھر سے راستہ بنانے لگا اور واقعی ایک گھنے کے بعد ہم پھر سے روائی دوال تھے۔

چھپتے پھر ہوا میں خلکی محسوس ہوئی۔ خلک جھاڑیوں کی بجائے چڑی کے چھوٹے چھوٹے درخت نظر آئے گے اور ہم ذرا یخے ہو کر ترقیا دریا کے ساتھ آ گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے آپ کو ٹھٹھے پانی سے بھکو کر ترومازہ کیا اور پھر چل اے سافر چل۔۔۔

"علاؤ الدین بھائی" رای نے ڈرائیور سے کہا "استور کتنی دور رہ گیا ہے؟"

"استور اور رہ گیا ہے" اس نے دریا کے ساتھ بندی کی جانب چھتی ہوئی ایک سڑک کی طرف اشارہ کیا "اڈھر سے دو کلومیٹر اوپر ہے میں ہم اور ہر سے سیدھے تریکھ جائیں گے"۔

"اور چائے کیاں بخیں گے؟" رای نے بڑی مصوبت سے دریافت کیا۔

"گریگوٹ میں۔۔۔"

چنانچہ ہم استور نہ دیکھے کے، اس کے آس پاس کو سوچ گئے تکل گئے۔

تحا۔ ایک نیا ان دیکھا جان۔ جہاں بہت کم لوگ آئے تھے۔ ہمارے آگے ترکھ
تحا۔ اور پڑے نہیں جس کی جانب ہم اتنے طویل سڑکے بعد آئے تھے وہ کیسا تھا۔
ترکھ۔

شام قریب تھی اور ہمارا پورا دن سفر میں گذرا تھا۔ ہم اپنے وقت اور اپنے
عمر کو چیچھے چھوڑ کر آگے جا رہے تھے۔ ایک نئے وقت اور نئے عمر میں۔ آس پاس
بینہ زیادہ ہو رہا تھا اور روپل نالہ ہم سے پرے ہو چکا تھا۔ ہم ایک سر بزر میدان میں
داخل ہوئے۔ پھر بونجی کی طرح پھاڑ چکے ہوئے اور لینڈ سیکپ وسیع ہوئے تھی۔ میں
چھپل نشست پر بیٹھا پار بار پوچھتا تھا کہ ترکھ کتنی دور ہے کیونکہ اب میری پڑیاں
بھی دکھ رہی تھیں۔ میں وہ شیڈ کو دیکھ رہا تھا جس میں ایک بہت وسیع علاقہ شام کی
آمد سے پیش تر ایک بونجی ہوئی روشنی میں تھا۔ لیکے بادل تھے۔ اور اندر ہو ہوا آری
تحی اس میں تھیڈک تھی۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ شیڈ بر فر سے سفید ہو گئی
ہے اور یہ بہت شتابی سے ہوا۔ بہت غیر متوقع طور پر، جیسے یوئی دیوبنالا میں جس میں کی
کشی کے سامنے سندھ کے میدان میں سے ایک عفریت ابھرتا ہے اور آسمان تک چلا
جاتا ہے اور اس کے سامنے کشی اور اس کے مسافر خوفزدہ چروں کے ساتھ منہ
کھولے اسے دیکھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی اس سر بزر میدان میں شام کی آمد سے پیش
ایک بونجی ہوئی روشنی میں ناٹھ پرست کا سلسلہ ہائے کوہ یوں بلند ہوا کہ بلند ہوتا چلا گیا
اور اس نے پورے آسمان کو بھر لیا اور ہم پر سرست چروں کے ساتھ منہ کھولے اسے
دیکھتے تھے اور اس کے آس پاس گھرے بادل تھے جن میں سے ایک گزگراہٹ نکل کر
خیجے میدان تک آتی۔ اور مجھے لیکن نہیں آ رہا تھا کہ یہ مظاہر میرے سامنے ہے میں
اسے دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ یہ ایک اور وقت تھا ایک اور عمد تھا جس میں ہم سرکر
رہے تھے۔ کھیتوں میں بہت سارے جامنی رنگوں کے پھول ہوا سے اپنی جگہ عارضی
طور پر بدلتے تھے۔ سرک سیدھی جا رہی تھی۔ چند مکاؤں کے سامنے ایک شخص
کھڑا با تھا ہلا رہا تھا۔ جیپ رک گئی۔ یہ مولوی یونس تھا۔

”آپ آگے نہیں جاؤ۔ سرک روپل نالے میں گرفتی ہے۔“

میرا دل بیٹھ گیا۔ اب اتنی دور آگر اور ناٹھ پرست کو یوں شاندار دیکھنے کے بعد
اگر واپس جانا پڑا تو۔۔۔

”آپ کہاں جاؤ گے؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ترکھ اور پھر روپل کے راستے ناٹھ پرست کے میں یکپ“

ترکھ یک طرف تھی۔ یہ راست دریا سے اتنی اوپنچائی پر تھا کہ جیپ سے جھاگٹے پر
ہوا۔ جہاں کے کاک پٹ کا سامنڑ و کھائی دیتا تھا۔ ایک جگہ ایک ٹرکٹر ٹرالی پر تودہ گرا
ہوا تھا اور صرف ٹرکٹر کا سینٹر گر مٹی سے باہر تھا۔ چند مزدور اسے کھوکر باہر نکالنے
کی کوشش میں مصروف تھے۔ ڈرائیور کے پارے میں اطلاع ملی کہ وہ تودے کی
گزگراہٹ سے کر ٹرکٹر سے کوڈ گیا تھا اور کوڈ سیدھا دریا میں گیا تھا۔ اور یہاں پر
دریا میں بہت بڑے مل ڈوزر کا ڈھانچہ چڑھ رہا کہ پڑا تھا اور پانی کے نور سے ذرا سا
حرکت کرتا تھا۔ گر گھوٹ کی بیڑ کوں کے ساتھ ہم نے استور نالے پر واقع بڑے پل کو
میور کیا۔ پل کے پار فوج کے ٹکڑے پھلانی کا ڈپ تھا۔ ڈپ کے قریب اور پر سے ایک نالے
کے ساتھ ایک راستہ اور پر کو اونٹھ رہا تھا۔

”صاحب یہ نالہ دیوبنالی سے آ رہا ہے۔“ علاء الدین نے پیچھے ٹرکر کیا۔

”تو پھر ردو کو یار اسے سلام کریں۔“

اس نے جیپ روکی اور میری طرف بیگب نظریوں سے دیکھا۔ ”صاحب کے
سلام کرے گا؟“

”اے“ میں نے نالے کی طرف ایک دیوانے کی طرح اشارہ کیا۔ ”اے بیبا۔ یہ
ہو اور دیوبنالی کے میدانوں سے آ رہا ہے۔ جہاں میں جانا چاہتا ہوں اور جا نہیں
سکا۔ لیکن اس مرتبہ ہم جائیں گے۔“

”نالے کو سلام کرتا ہے؟“ علاء الدین نے راہی کو اپنا رازداں بنانے کی کوشش
کی ”کیوں کرتا ہے؟“

راہی نے سر بلایا ”اے کاچ ڈھیلا ہے۔ یہ ادھر داغ میں گز بڑا ہے۔“

نالے کا نیکاؤں پانی میری آنکھوں کو مٹھنڈک دے رہا تھا۔

”اے بھی آگے سرک بہت خراب ہے۔“ علاء الدین بولا ”ادھر خراب ہو تو ایک
دن میں ٹھیک ہو جاتی ہے اور خراب ہو تو صینہ میں خراب رہتی ہے۔ شام سے
پہلے پہنچتا ہے۔“

اب لینڈ سیکپ اتی دیران اور آنکھوں کو دکھ دینے والی تخترنہ تھی بلکہ تھوڑی
ہی شادابی تھی۔ سفیدے کے درخت تھے۔ یہاں سے ہم نے ایک مرتبہ پھر استور
نالے کو رحمان پور پل سے عبور کیا۔ لیکن یہاں اس کا نام روپل نالہ تھا۔ ایک راستہ
رحمان پور اور روتا کو جا رہا تھا لیکن ہم ترکھ جاتے والے راستے پر تھے۔ جہاں
استور ایک دنیا کے اندر ایک اور دنیا تھی وہاں استور سے آگے پھر ایک اور جہاں

غائب تھا اور وہاں سے دس بیس فٹ پیچے دریا کا پانی تھا۔ اور یہ ایسا چھوٹا سا حصہ تھا جس پر سے جیپ۔ ہزار گز رہا تھا کیونکہ پھاڑ کی جانب کوئی گنجائش نہ تھی۔ اب حساب کتاب یہ لگانا تھا کہ اگر جیپ یہاں سے گزاری جائے تو کیا وہ ملٹس قائم رکھے گی یا ترجمی ہو کر دریا میں گر جائے گی۔ ہم اس سوراخ کو تو پر نہیں کر سکتے تھے جہاں سے سڑک غائب تھی۔

”صاحب ڈرامہ کو پھر لاؤ“ ڈرائیور نے اس حصے کو بوت سے دلتے ہوئے کہا۔ چنانچہ سب نے حسب مقدور اپنے اپنے سگ اخھائے اور وہاں ڈھیر کر دیے۔ علاؤ الدین جیپ میں سوار ہوا پھر اسے آہست سے نہایت احتیاط سے چلاتا ہوا کرے ہوئے حصے کے قریب لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے باہر نکل کر پھر حساب کتاب کیا اور دوبارہ اپنی نشست پر بینچ گیا۔ اور ہم دوسرا جانب سانس روکے جیپ پر نظرں جانے کھڑے تھے۔ اور ہم نے دیکھا کہ اس حصے پر سے گزرتے ہوئے جیپ کا اگلا ہزار لمحہ بھر کے لئے ہوا میں مغلظ ہوا اور پھر پہنچتے ہزار کی بھی یہی کیفیت ہو گئی تھیں جیپ ایک بیکے سے جھکنے کے ساتھ ہماری جانب آگئی۔ ہم سب نے باری باری ڈرائیور سے ہاتھ ملایا اور اس کی بینچ چھکی۔ خاص طور پر جیپ اپنی ”توپ ابلم۔ توپ ابلم“ کہنا نہ خال ہوتا تھا۔

اور حیرت انگیز طور پر ہمارے پدنوں میں تھکاوت کم ہو گئی۔ ہماری پسلیاں جو آپس میں بھڑک رہی تھیں قدرے آرام سے ہو گئیں۔

”بس جی تریک نہ دیکھ ہے۔“ علاؤ الدین کو اس بات پر فخر تھا کہ جہاں سے دو جیپ ڈرائیور خوفزدہ ہو کر واپس پہنچنے کے وہاں سے اس نے اپنے کمال فن سے راستہ بنایا۔ اور راستہ پیچے ہو کر ایک چھوٹے سے نالے بندگی کیا۔ اسے عبور کر کے اور ہوا اور چڑھتا گیا اور پھر جیپ رک گئی۔

”تو پھر پورٹ ہم آپ کو دیں گے۔ یہ ہمارا حق ہے چورت والوں کا۔“
”بیبا ہم اور تریک پہنچیں تو پورٹ لیں گے ہاں۔ تمہیں یہیں ہے کہ سڑک بالکل خراب ہے اور اس پر سے گزرا نہیں جاسکا؟“
”ہاں صاحب۔۔۔ ابھی دو جیپیں واپس گئی ہیں۔۔۔ اور وہ حصہ اچھا نہیں ہے کیونکہ دریا بالکل ساتھ ہے۔ آپ رات اور گزار لو۔ ہو سکتا ہے کل تک تھیک ہو جائے۔“

”کیوں صاحب۔۔۔ علاؤ الدین نے مجھ سے پوچھا۔
”کیا تم اس سے پہنچ تریک گئے ہو؟“
”تمیں صاحب صرف استور تک ہی آیا ہوں۔ ویسے بھی یہ سڑک تو ابھی نہیں ہے ورنہ ادھر تک تو لوگ پیدل آتے تھے۔۔۔ صرف دو برس پہلے سڑک نہیں تھی۔۔۔“

”کیا خیال ہے جیپانی؟“
”آہ۔۔۔ اس نے سر جھکا۔
”میرا خیال ہے کہ وہاں تک جا کر دیکھ لیا جائے کہ کتنی خراب ہے۔۔۔ اگر نہ گزر سکے تو واپس یہاں آ جائیں گے۔“
”توپ ابلم۔“ اس نے بندک کر کیا۔
”چلو بھی علاؤ الدین۔“

مولوی یونس نے سر ہلایا اور پھر کہنے لگا ”آپ واپس آ جاؤ گے۔ یہن ناٹھ پرست کے پورٹ آپ ہم سے لیتا۔۔۔ اس گاؤں کا نام چورت ہے۔“
چورت کے فوراً بعد میدان ختم ہو گیا اور روپل نالہ ہمارے قریب آگیا۔ یہ گہرائی میں نہ تھا بلکہ سڑک سے صرف دس بیس فٹ پیچے تھا۔ بہت تیز زد تھا۔۔۔ یہاں راستہ خاصاً خراب تھا اور جیپ بہت سوچ کر دچکوں کے ساتھ چلتی تھی۔ ایک موڑ پر ہم نے ایک خوبصورت آبشار کو بہت بلندی سے کپی سڑک پر گرتے دیکھا۔ نہیں اسے آبشار نہیں کہا جا سکا۔ یہ کسی گیشیز کا پانی تھا جو چھوٹی چھوٹی نالیوں کی صورت میں پیچے آ رہا تھا۔ اور پھر ایک مسلسل پھوار اور بارش کی خلی میں سڑک پر گر کر روپل نالے میں جاتا تھا۔ اس آبشار کے آگے وہ مقام تھا جس کے بارے میں مولوی یونس نے اطلاع دی تھی کہ وہاں سڑک دریا میں گر بھی ہے۔ ہم جیپ روک کر آگے گئے۔۔۔ آبشار کا پانی ہم پر گرتا تھا۔ وہاں سڑک کا ایک چھوٹا سا حصہ